UNIVERSAL LIBRARY

OU_222209

UNIVERSAL LIBRARY

۱۶۳۰۰

۸۹۱۵۴۳۳۴

صادق الجزیری - ص. س.

سفینه

OSMANIA UNIVERSITY LIBRARY

Call No. ۸۹۱۵۴۲۳۳۴ Accession No. ۱۴۳۰۰

Author صادق الخیری، ص - س

Title شمع

This book should be returned on or before the date last marked below.

سفینے

یشیا اور یورپ کے تیئس دل کش رومان اور ترقی پسند افسانے

مترجمہ

صادِق الخیری

ایم۔ اے، دہلوی

کتب خانہ

جملہ حقوق محفوظ

ناشر

خاتون کتاب گھر

اُردو بازار، دہلی

مطبوعہ جمال پریس دہلی

۱۹۴۴ء

بار اوّل

حصۂ اوّل

میرا ایشیائی محبوب	چین	۱۱
جزیرۃ البلّور	ترکی	۲۲
چار چاند	سمرقند	۲۸
دوشیزۂ سلوم	فلسطین	۳۶
عروسِ نیل	مصر	۴۳
لیسا کا ماہی گیر	پرتگال	۵۲
خوابِ گریز پا	انگلستان	۵۸
چراغِ کشتہ	جاپان	۷۵
پیرس کا صنم	فرانس	۷۹
تجدیدِ حیات	روس	۸۴
افسانۂ عنوان طلب	بلجیم	۹۱
اپنے بل لی	امریکہ	۱۰۰
شادی	مارواڑ	۱۰۱
عجیب بھکاری	بنگال	۱۰۲
گلِ پژمردہ	سوکستان	۱۰۳

حصّۂ دوم

کافر	چین	۱۲۲
جنگ کے شعلے	چین	۱۳۴
اشتراکی	چین	۱۳۵
شکست	جرمنی	۱۵۲
محبّت اور جسمانی لذّت	فرانس	۱۵۹
ننگ و ناموس	فرانس	۱۶۲
پلنگ	فرانس	۱۶۷
نغمۂ فردوس	آئرستان	۱۷۰
نورِ الٰہی	آئرستان	۱۷۸
نغمۂ روح	ہسپانیہ	۱۸۱
مدفن	عرب	۱۸۷
شاعر نے کہا	عرب	۱۸۹
انتقام کی رات	برما	۱۹۰
ستارے کی خودکشی	ہندوستان	۱۹۳
واپسی	انگلستان	۱۹۵

یہ افسانے ......

یہ افسانے ایشیا اور یورپ کے مختلف فن کاروں کے تخیل کا نتیجہ ہیں۔ ان میں سے اکثر فن کار اپنی تخلیقات کی وجہ سے عالم گیر شہرت حاصل کر چکے ہیں، لیکن میں حسب عادت ان کے ناموں سے کبھی مرعوب نہیں، بلکہ میں نے صرف انھی چیزوں کو ترجمے کے لئے منتخب کیا جو مجھے اچھی معلوم ہوئیں۔

ترجمے کے سلسلے میں بس یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ میں جس افسانے کو ترجمہ کرنا چاہتا اسے ضرورت ہوتی تو ایک دفعہ سے زیادہ بھی پڑھ لیتا تھا۔ حتیٰ کہ مجھے یقین ہو جاتا کہ مصنف کے ذہن میں جو مد و جزر ہے اس کے تصور میں جو افراد جلوہ فرما ہیں، اس کے دل و دماغ میں جو کیفیات موجزن ہیں وہ مجھ پر طاری ہو گئی ہیں۔ اس کی روح مجھ میں سما گئی ہے۔ اور جب میں یہ محسوس کرتا کہ مصنف نے جو کچھ اور جس طرح سوچا تھا، میں اس پر قادر ہو گیا ہوں تو اسے اپنی زبان میں منتقل کرنا شروع کر دیتا تھا۔ صرف چند افسانوں (عروسِ نیل۔ تجدیدِ حیات۔ افسانۂ عنوان طلب۔ انتقام کی رات) کو چھوڑ کر جو ترجمہ کم اور ملخص و ماخوذ زیادہ ہیں، باقی تمام افسانے اس پابندی سے ترجمہ ہوئے ہیں کہ نہ صرف مصنف کی روح اس میں سمٹ آئے، بلکہ جہاں تک ہو سکے، اس کا اسلوب، اس کا اندازِ فکر اور اس کے الفاظ کا انتخاب بھی برجستگی اور طبعزاد کی سی بے ساختگی کے ساتھ منتقل ہو جائے۔

یہ مجموعہ دو حصوں میں منقسم ہے۔ پہلے حصے میں ایشیا اور یورپ کے نازک خیال مصنفوں کے دل کش رومانی افسانے شامل ہیں اور اس کا آغاز کسی نامعلوم افسانہ نگار کے ایک حد درجے شاعرانہ افسانے سے ہوتا ہے۔ اس کا عنوان ——— میرا ایشیائی محبوب ——— ہی فوراً ذہن میں ایک ایسا موضوع پیدا کر دیتا ہے جس میں بے انتہا تصور زائی ہے، اور یہ حقیقت ہے کہ افسانہ شروع سے آخر تک ایک سحر کا سا اثر رکھتا ہے۔ طرزِ نگارش ایشیائی، پس منظر چینی اور فضا نئی اور انوکھی ہے جو افسانے کی نشو و نما کے ساتھ ساتھ اُداس ہوتی جاتی ہو۔ یہاں تک کہ جب ہم خاتمے پر پہنچتے ہیں تو دل اس قدر غمگین ہو چکا ہوتا ہے جیسے سینے پر غم کی گھٹا چھائی ہوئی ہو جو نہ کھلتی ہے نہ برستی ہے۔ اور اس کے ساتھ ایک البیلے مصنّف کا افسانہ ہے "جزیرۃ البلور" جو کسی حسین و جمیل جزیرے کی مانند خوابناک اور بلّور کی طرح نازک ہے۔ سلطان اور شعلۂ دل کا رومان پڑھتے پڑھتے چند لمحات کے لئے جی آپ ہی آپ گرد و پیش سے غافل ہو جاتا ہے۔ یقیناً یہ (FANTASIA) اُن نفاست پسندوں کے لئے

خاصّے کی چیز ہے جو اس ادب کو بھی افادی سمجھتے ہیں جس میں روحانی سرمستیاں ہوں۔ بے داغ حُسن اور بے لوث عشق کی گھاتیں ہوں اور جس کا مطالعہ تھکے ہوئے اور خستہ جسم وجان کو تسکین پہنچائے۔ اس کے بعد ایشیائی ماحول کے دو خاص افسانے "چار چاند" اور "دوشیزۂ سلوم" ہیں۔ پہلے میں سمرقند اور دوسرے میں یروشلم کا رومان پرور پس منظر ہے، اور دونوں کے مصنف اپنے پلاٹ کو ایسی عمدہ کروٹیں دیتے ہوئے چلتے ہیں کہ منتہا پر قاری افرادِ قصہ کی کیفیات خود محسوس کرنے لگتا ہے —— کہ یکایک اسرار و رموز کی سرزمین مصر سے، نیل کی ناگن پیچ و تاب کھاتی ہوئی، نمودار ہوتی ہے۔ کلوپٹرا کے متعلق بے شمار قصّے مشہور ہیں، مگر "عروسِ نیل" میں بہت سے تاریخی شواہد بہم پہنچائے گئے ہیں۔ اس عشق پرست ملکہ کی داستانِ حیات دنیا کے رنگین ترین افسانہائے عشق میں شمار ہوتی ہے، اس لئے اور بھی ہلاکت پسند جوانی اور خوں آشام حُسن کے اس عبرت ناک افسانے میں کشش اور دل فریبی ہے۔

اور پھر "سفینے" کا مرتب آپ کو پرتگال کے ایک افسانہ نگار سے روشناس کراتا ہے جس کے بیان میں سادگی اور فکر میں معصومیت ہے۔ میفالڈو کا یہ دل گیر رومان (لیساکی ماہی گیر) اس کا شہ پارہ ہے، اور اس زندگی کے عزیز ترین لمحات کی تفسیر جو "جاوداں، پیہم رواں، ہر دم جواں" ہے۔ جب روبرٹو کا عشق نرم روندی کی بجائے طوفانی آندھی کی طرح اپنی بھاوج پر چھا جاتا ہے تو اس کی ماں خاندان کی ناموس کی خاطر کیا کر گزرتی ہے؟ اور کس طرح وہ ایک آنکھ میں روشن چراغ اور دوسرے میں ویران صنم خانہ آباد کرتی ہے۔ یہ اس دل گداز المیے میں پڑھ کر کلیجہ منہ کو آتا ہے —— اور اس کے بعد جون گولز وردی کا مشہور عالم ڈراما "خواب گریز پا" جلوہ افروز ہوتا ہے۔ مثالیت اور اشاریت کی ایک نادرہ کار تمثیل! اس کی ڈرامائیت، اس کی تصور آفرینی، اس کے معنی خیز مکالمے اور سیلچن کا عمل و ردِ عمل، یہ سب آپ کو ایسی انوکھی دنیا میں لے جاتے ہیں جہاں شاعری تو ہے مگر ذہنی عیاشی نہیں، بلکہ فکرِ بلند اور خود آگاہی کارفرما ہیں۔ اور جب اس ڈرامے کا پردہ گرتا ہے تو ایک خالصتاً جاپانی کہانی کا دیا جلتا ہے۔ مگر نہیں، یہ دیا روشن نہیں ہے۔ اس کا عنوان ہے چراغِ کشتہ! اس مختصر افسانے میں سنگدل جاپانیوں کی سرشت ٹھیٹ انھی کے انداز میں بیان کی گئی ہے۔ باوفا او طامی اور پیماں شکن جاپانی کا یہ رومان پڑھ کر طبیعت بےچین ہو جاتی ہے۔ "پیرس کا صنم" گیارھویں صدی کے وحید العصر فلسفی ایبے لارڈ کی زندگی کے گھناؤنے رُخ کی داستان ہے جس نے بھولی بھالی ہیلوآئزی کو تعلیم کی بجائے عشق کا درس دیا۔ ایبے لارڈ کا نام مختلف علوم میں غیر فانی ہے مگر جس خود غرضی سے

وہ اپنی محبوبہ سے پیش آیا، اس کا تقاضا یہی تھا کہ ہیلو آئزی کا چچا اس سے نہایت ہولناک انتقام لے، ایسا انتقام، جس کی شاید کوئی مثال نہیں ہے۔

"تجدید حیات" اور "افسانۂ عنوان طلب" دو ماخوذ افسانوں کے بعد تین مختصر افسانچے پڑھئے، ایک تو کی کہانی جو اس نے اپنی محبوب بیوی کو دائمی جدائی کے موقع پر مرتب کی تھی اور دو اپنے دیس کے قصے جو ٹیگور کے اختصار پسند مگر خیال افروز قلم کے رہین منت ہیں ــــــ اور ان سب کے آخر میں میری کوریلی کا مختصر طویل رومان ہے۔ "گل پژمردہ"! جس طرح اس حصے کا آغاز صف اوّل کے ایک عمدہ افسانے "میرا ایشیائی محبوب" سے ہوا ہے اسی طرح اس کا اختتام ایک اعلیٰ درجے کے رومان سے ہوتا ہے۔ کوریلی ایک زمانے میں محبوب ترین مصنفہ تھی اور اگرچہ اب ادب میں مادّیت رچ گئی ہے مگر اس کی فن کارانہ تخلیقات جن کی نمایاں خصوصیت روحانیت ہے۔ آج بھی غیر متعصب پڑھنے والوں سے سارز طلبی کرتی ہیں۔ اس افسانے میں مصنفہ ہمیں شہر کی گہما گہمی سے نکال کر سوئٹزرلینڈ کے "کنج بہاراں" میں لے جاتی ہے جہاں ہم ایک عجیب جوڑے سے متعارف ہوتے ہیں۔ یعنی بیوی کیٹس اور بائرن کی شیدا ہے۔ نفاست اور نزاکت پسند ہے۔ گویا کسی عمدہ غزل کا شعر! اس کے برخلاف اس کا شوہر بد ذوق اور مغرور ہے۔ گویا کسی خشک نثر کا ٹکڑا! اور پھر ان کی زندگی میں یکایک ایک نوجوان مصوّر، لالۂ صحرا کی طرح نمودار ہوتا ہے جس کا ہمدرد اور پاک دل اس افسانے کو فرش سے اٹھا کر افلاک کی بلندیوں پر لے جاتا ہے۔

حصۂ دوم میں مشرق و مغرب کے حقیقت نگار ادیبوں اور ترقی پسند مصنفوں کے افسانے شریک ہیں۔ اور اس کی ابتدا ہاؤسمین کے بہترین افسانے "کافرستے ہوتی ہے۔ جس میں بناوٹ اور تصنّع سے مطلق کام نہیں لیا گیا بلکہ اس میں بہت سی کام کی باتیں کہی گئی ہیں۔ اس افسانے کو ختم کر کے آپ کو ایک جنگی افسانہ نظر آئے گا جس میں چینیوں کی روایتی شائستگی اور حُسن پسند طبیعت کے مطالعے کے ساتھ ساتھ جنگ کے شعلے بھڑکتے ہیں۔ اس افسانے میں غضب کی شدّت اور روانی ہے اور اس میں بہت سی حقیقتوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اس کے بعد پرل بک کا افسانہ "اشتراکی" ہے جس میں (GOOD EARTH) کی مصنفہ نئے زمانے، نئے انقلاب اور نئے خیالات کی پُرسوز داستان سناتی ہے۔ پرل بک کے پہلو بہ پہلو گولزوردی کا معنی خیز ڈراما "شکست" ہے جو جنگِ عظیم کی ہولناکیوں کی ایک اندوہ ناک کہانی ہے۔ اور یہ واقعہ ہے کہ اس عالم گیر جنگ میں بھی محدودی سفاکوں کی بدولت کتنے ہی بے گناہ خاندان موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے

اور کتنے ہی نفوس خاکِ وطن سے دُور، دیارِ غیر میں شاد کے اس مصرعے کی تصویر بن گئے ہیں ؎

تعبیر ہے جس کی حسرت وغم اے ہم نفسو، وہ خواب ہیں ہم!

اور پھر تین افسانے فرانس کے زندۂ جاوید افسانہ نگار موپساں کے قلم سے! "محبت اور جسمانی لذت" کا آغاز جوش ملیح آبادی نے "فاش اگرگویم" جہاں برہم زنم "سے کیا تھا" ننگ و ناموس" اور "پلنگ" بھی بے انتہا تیز اثر ہیں۔ مگر میری رائے میں ان تینوں افسانوں میں بے باکی اور بے حجابی تو ہے لیکن بے حیائی نہیں۔ اس کے برخلاف ان افسانوں میں شروع سے آخر تک افسانوی سحر کے علاوہ حد درجے خلوص اور صداقت ہے۔ "ننگ و ناموس" ہمارے سامنے ایک بالکل ہی نیا موضوع لاتا ہے اور ہم چاہے جتنا چھپائیں مگر اس کی اصلیت اور اذیت کوشی سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ اسی طرح "پلنگ" پڑھتے وقت ذہن پر وہ افسوں چھا جاتا ہے جسے پیدا کرنے میں موپساں کو غیر معمولی ملکہ حاصل تھا۔

ان کے بعد میری کوریلی کے دو اور افسانے ہیں۔ اور پھر "نغمۂ روح" ! جس میں ایک نامعلوم مصنف نے "دوئی" اور اپنی ذات کی دورنگی کے متعلق ایک سادہ و پُرکار افسانہ سُنایا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ محمد المویلحی کے دو افسانچے ہیں "مدفن" اور "شاعر نے کہا"۔ عربی زبان کی خصوصیت کے مطابق مختصر مگر بلیغ اور شیریں۔ اور ان کے بعد ایک برمی افسانہ "انتقام کی رات" اور ایک بنگالی شہ پارہ "ستارے کی خودکشی" ہی جو اختصار کے باوجود کائنات پر سیر حاصل تبصرہ ہے۔ حصۂ اوّل کی طرح حصۂ دوم کا اختتام بھی ایک عمدہ اور دل پسند افسانے پر ہوتا ہے۔ سومرسٹ موہام نے "واپسی" کے لئے ایک نیا اور اچھوتا موضوع تلاش کیا ہے اور اسے ایک ایسے اسلوب میں پیش کیا ہے جو اپنی سادگی اور دل نشینی کی وجہ سے دل میں کھُبے جاتا ہے۔

"سفینے" کا ہر افسانہ متعلقہ ملک کے مصنف کا لکھا ہوا نہیں ہے۔ بلکہ اکثر افسانوں میں پس منظر کسی ایک مُلک کا ہے اور مصنف کسی دوسرے خطے یا زبان کا۔ لیکن یہ افسانے ان جگہوں کی نمائندگی ضرور کرتے ہیں اور ان افسانوں کو پڑھ کر ہمیں ان ممالک کی افسانوی خصوصیات، وہاں کے افراد و کردار، ان کے رسم و رواج اور نفسیات کی ایک جھلک نظر آتی ہے۔

۱۳ر نومبر ۴۳ء

صادق الخیری

سفینے

حصّۂ اوّل

میرا ایشیائی محبوب

(۱)

یونیورسٹی کے طلبا کی آزاد، بے فکر اور عجیب و غریب زندگی کے حالات سُن کر میری یہ خواہش روز بروز زیادہ ہوتی جارہی تھی کہ جلد از جلد میں بھی کسی یونیورسٹی میں طالب علم کی حیثیت سے چند سال گزاروں۔ چنانچہ اسکول سے فارغ التحصیل ہو کر میں نے اپنی یہ خواہش والدین پر ظاہر کی مگر انھوں نے اسے پسند نہیں کیا، کیونکہ وہ مخلوط تعلیم کے مخالف تھے۔ تاہم میں اپنی ضد پر قائم رہی اور چونکہ میں اُن کی اکلوتی اور چہیتی لڑکی تھی اس لئے میرا اصرار اُن کے انکار پر غالب آیا، اور میں یونیورسٹی میں داخل ہو گئی۔

یہاں میری سہیلی لوسی نے میرا تعارف ایک نوجوان طالب علم جون سے کرایا جو نہایت نیک اور با اخلاق شخص تھا۔ شاید ہم دونوں کے تعلقات آہستہ آہستہ اس قدر بڑھ جاتے کہ میں کسی روز اُس سے شادی کرنے پر آمادہ ہو جاتی مگر اسے اُس نے ایک ایسے شخص سے میری مُلاقات کرا کے ناممکن کر دیا جس کی یاد سے آج دل کے ناسور رِس رِس کر میری زندگی محال کئے دیتے ہیں۔ جون اکثر اُس شخص کی تعریف کیا کرتا تھا اور کہتا تھا کہ اس سے زیادہ لائق قابل طالب علم آج تک یونیورسٹی میں نہیں آیا۔ اور یہی نہیں، بلکہ بڑے بڑے پروفیسر بھی اُس کی قابلیت اور علمیت کے معترف ہیں۔ اس کا نام ہیری لی تھا اور میری اُس سے مُلاقات نہایت دلچسپ طریقے پر ہوئی۔ ایک شب تبت کے کسی صوفی عالم کی تقریر سُننے کے لئے جب میں اپنی سہیلی کے ساتھ ہال میں داخل ہوئی تو تمام جگہیں بھر چکی تھیں۔ اس سے ہمیں بڑی مایوسی ہوئی۔ لیکن اتنے میں میں نے جون کو اپنی طرف بُلانے کا اشارہ کرتے ہوئے دیکھا۔ چنانچہ ہم دونوں جون اور اُس کے ساتھی کی جگہوں پر بیٹھ گئے۔ جہاں سے وہ ہمارے لئے اُٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

"میں اور ہیری ایک طرف کھڑے ہو جائیں گے، آپ آرام سے بیٹھ جائیے"۔ جون نے سرگوشی کے لہجے میں کہا۔

سامعین تقریر سُن رہے تھے۔ قدرے توقف کے بعد میں نے جون اور اُس کے دوست کو مُڑ کر دیکھا۔ وہ دونوں دیوار کے سہارے کھڑے ہوئے تھے اور ہیری کی نظریں مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔ مگر میں یہ دیکھ کر مایوس کُن تحیّر میں رہ گئی کہ ہیری لی ——— "چینی" ——— تھا، جس کا جون نے کبھی تذکرہ بھی نہیں کیا۔ بہر حال وہ خوش رُو تھا اور اُس کے چہرے سے وقار ٹپکتا تھا۔ اُس کے ہاتھ اُس کے بازو کے

پر رکھے ہوئے تھے اور آنکھیں ——— وہ سیاہ ملکوتی آنکھیں ——— اپنا خاموش اور پُرسکون جادو مجھ پر کر رہی تھیں۔ جب میں نے بمشکل اپنی نگاہیں اُس حسین مرد پر سے ہٹائیں تو آنکھیں ایک دفعہ اور اُس کی طرف دیکھنے کے لئے مچلنے لگیں، دوبار، سہ بارہ، نہ جانے کتنی بار! تبّت کا بوڑھا صوفی روحانی بارش کر رہا تھا اور میں نے بھی چند لمحات تک اُس سے فیض حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن..... کوشش میرے دل کے خلاف بغاوت کر رہی تھی اور میں مجبور ہو گئی کہ ہیری کو دیکھے جاؤں اور جب کبھی میں اُس کی طرف دیکھتی اُس کی سیاہ ملکوتی آنکھیں میری نظروں کو کئی لمحات تک کرنٹ میں لئے رہتیں۔ اور مجھ پر ایک نامعلوم کیف طاری ہو جاتا۔

تقریر ختم ہونے کے بعد جب مجمع منتشر ہوا تو میں وہاں سے بھاگ جانا چاہتی تھی کہ کہیں محبت کی غیرمرئی زنجیریں مجھے جکڑ نہ لیں مگر میں تو پہلے ہی بے بس ہو چکی تھی، میرے پاؤں اُٹھ ہی نہ سکے۔ لوسی، ہیری سے مل چکی تھی۔ اس لیے تعارف کے بعد ہیری مجھے میری جائے قیام تک پہنچانے آیا۔ وہ راستے میں عالمانہ گفتگو کرتا رہا۔ اس کا لہجہ شیریں، الفاظ خوبصورت اور خیالات شاعرانہ تھے اور میں اُس کے سامنے کچھ بولتے ہوئے جھجک رہی تھی۔ سایہ دار درختوں کے نیچے خاموش اور تاریک راستے میں وہ تخیل کے انمول موتی بکھیرتا رہا اور میں غیرارادی طور پر اس کی طرف کھنچی جا رہی تھی۔ اس کی سنجیدہ فطرت اور پُرجوش باتوں نے مجھ پر ظاہر کر دیا کہ کیوں لوگ اس کی قابلیت کے مداح ہیں۔ رخصت ہوتے ہوئے میں نے اُس کی درخواست کو نہایت خوشی سے منظور کر لیا۔

"بہت اچھا! کل سہ پہر کو میں آپ کے ہمراہ سیر کو چلوں گی۔"

جانے مجھے کیا ہو گیا تھا۔ میری روح اپنی تکمیل کے لئے محسوس کر رہی تھی کہ وہ ایک دوسری روح کی محتاج ہے۔ میرے ہر سانس کے ساتھ ہر بار اُبھرنے والے سینے میں لذتِ خلش کی ایک بے پناہ موج اُٹھ اُٹھ کر مجھے ہوش و خرد کے ساحل سے بہت دور لے جا رہی تھی اور میں بے قابو ہو کر سوچنے لگتی تھی۔

"اے معبود! میری آزادی کیوں چھینی جا رہی ہے!!"

اسی شش و پنج میں میں نے لوسی سے اس کا ذکر کیا تو وہ کہنے لگی۔ "ہیری نہایت اچھا آدمی ہے، میں تو اس کو قطعی چینی نہیں سمجھتی۔ بعض اعتبار سے تو دنیا میں شاید اس کا ثانی نہ مل سکے۔"

غرض میری رائے کی لوسی نے بھی تصدیق کر دی۔

دوسرے روز جب ہیری سے میری ملاقات ہوئی تو اُس نے مجھے پھولوں کا ایک نازک گلدستہ دیتے ہوئے شاعرانہ انداز میں کہا۔ "آپ خود ہی ایک حسین و جمیل گلِ نوشگفتہ ہیں......"

اُس دن کی سیر کے بعد میں ایسا محسوس کرنے لگی گویا میں اُس کی شخصیت کے اثر سے مغلوب اور شاعری کے جادو میں گرفتار ہو چکی ہوں۔ اور بہت جلد میں بھول گئی کہ "——— یہ تو ایشیائی ہے ——— غیر ملکی!!" مگر کس قدر خوبصورت تھا وہ! اس کی مسکراہٹ غضب کی شیریں تھی اور میں نے اس سے زیادہ

خوش اسلوب اور شریف النفس شخص کبھی دیکھا ہی نہیں۔
کچھ دنوں بعد ہماری ملاقاتیں ہر روز ہونے لگیں۔
میرا خیال ہے کہ اُس کو جو دلچسپی مجھ سے ہو گئی تھی وہ اس کے خلاف لگاتار اجتہاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کیونکہ کیا یہ سنجوگ ـــــ ایک مشرقی مرد اور ایک مغربی عورت کا ـــــ واقعی کمزور دانش کی دلیل نہیں ہے؟ اُس نے پڑھائی کی طرف سے کبھی غفلت نہیں کی کیونکہ اس کا قصد ایک آدھ سال بعد پیکنگ یونیورسٹی میں پروفیسر کی حیثیت سے جانے کا تھا۔ پھر بھی ہم دونوں شہر سے باہر خوشنما پہاڑیوں اور کم آباد شاہراہوں کی اکثر سیریں کرتے تھے۔ ان موقعوں پر ہیری مجھے ولولہ انگیز رومان اور عہدِ قدیم کی متحیّر کر دینے والی داستانیں سنایا کرتا تھا۔ اور آس پاس کے لہلہاتے ہوئے حسن ـــــ یعنی ہرے بھرے کھیتوں خوش رنگ و معطر پھولوں اور پہاڑیوں کے دامن میں بل کھانے والے مناظر میں ہم دونوں جذب ہو کر دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جایا کرتے تھے۔

ایک دفعہ شبِ ماہتاب میں وہ مجھے سیب کا ایک کھلا ہوا درخت دکھلانے لے گیا جو علف زار میں سپید پھولوں کا ہوتے ہوئے گرتے والا آبشار معلوم ہو رہا تھا بلکہ دور سے تو ایسا نظر آتا تھا کہ برف سے ڈھکی ہوئی شمعی انگلیاں معبودِ نیّر کی پرستش کر رہی ہیں۔ ہیری میرے تحیّر و تعجب پر اپنے مخصوص انداز میں ہنسا۔ "تم بھی سیب کے کھلے ہوئے پھولوں کی طرح ہو!" یک بارگی میں اُس کی سحر آلود اور محبت بھری آواز سن کر بالکل اُس کے قریب ہو گئی ـــــ بے حد قریب!!

اُس رات کے بعد ہیری کے لئے میرے دل میں جو جذبات بیدار ہو چکے تھے انھوں نے مجھ کو وارفتہ کر دیا۔ میں ہر وقت اُس کے ساتھ رہنا چاہتی تھی اور اس ارمان کو پورا کرنے کے لیے میں دنیا کی ہر شے قربان کرنے کو تیار تھی۔

جون کی ایک خوشگوار شام کو ہیری اور میں ایک ایسی راہ چل رہے تھے جہاں کوئی تیسرا ہمیں دیکھنے اور سننے والا نہ تھا۔ ہم دونوں خاموش تھے کیونکہ چند ہفتے بعد میں گھر جانے والی تھی اور جدائی کا روح فرسا خیال ہمارے دماغوں پر مسلط تھا۔ دفعتاً ہیری ٹھیر گیا اور اُس نے اپنے ہاتھ میرے شانوں پر رکھ دئے۔ میں نے بھی فوراً اُس کی طرف دیکھا۔

"اے گلِ رعنا! ہم اور تم ایک پُر سکون دریا میں سفر کر رہے ہیں لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ کوئی تیز اور طوفانی رَو بہت جلد ہماری کشتی کو کہیں بہا لے جائے گی۔" وہ مسکرایا مگر اس کی آنکھوں میں سنجیدگی جھلک رہی تھی "ہم کو واپس لوٹ جانا چاہیے' اے خوبصورت پھول! ایسا نہ ہو کہ پھر ہم بے بس ہو جائیں۔"

میں جانتی تھی کہ اس کا کیا مطلب ہے لیکن سمجھنا نہیں چاہتی تھی۔ "کچھ بھی ہو ہیری! مجھے کسی کی پرواہ نہیں۔ میں طوفانی رَو سے نہیں ڈرتی جب تک ـــــ جب تک ـــــ تم میرے ساتھ ہو!!"

اس کے معصوم لب میرے بالوں کے قریب آ گئے۔ اُس نے مترنم آواز میں کہا۔ "میرے آباواجداد کی عقل گرما کے بادل کی طرح ہے جو آسمان میں پگھل جاتا

ہے۔ اے گُلِ نوبہار! میں تم سے محبّت کرتا ہوں، بہت گہری، بہت سچّی اور تا زندگی کرتا رہوں گا، لیکن ہمیں محبت کرنی نہیں چاہیئے۔ تم بالکل بھولی اور کم سِن ہو اے میری محبوبہ! اس لئے میں تمہارے پاس سے چلا جاؤں گا۔"

" نہیں، نہیں!" میں پھُوٹ پھُوٹ کر رو نے لگی۔ "اگر تم میرے پاس سے چلے گئے ــــ تو میں مرجاؤں گی۔" میں نے اُس کے سینے پر سر رکھ کر والہانہ انداز میں کہا " ہیری! میں مرجاؤں گی۔" اور اس وقت مجھے ایسا ہی محسوس ہو رہا تھا۔

اُس نے میری پریشانی سے ملول ہوتے ہوئے میرے رُخساروں پر سے آنسو پونچھے۔" میں تو تمھاری ہی بہتری کے لئے کہ رہا ہوں۔ اے آسمانی پھول! کہ ہم کو شادی نہیں کرنی چاہیئے۔ میری محبت تو دائمی رہے گی، تمھاری البتہ ــــــــ" لیکن میں نے فوراً ہی اُس کی پیشین گوئی کی تغلیط کردی۔" تم کیوں شبہ کرتے ہو، میں ہمیشہ تم سے محبت کرتی رہوں گی"

کاش میں سمجھ سکتی کہ وہ کس قدر سچّا ہو! ایک ماہ بعد ہم دونوں کی شادی ہوگئی۔ گو ہم نے اسے راز میں رکھا۔ ہیری کو ابھی گرمیوں گرمیوں یہاں رہنا تھا چنانچہ ہم نے کالج سے کافی فاصلے پر ایک چھوٹا سا خوشنما مکان لے لیا اور وہیں رہنے سہنے لگے۔ ہیری اتنی دُور ہر روز کالج جاتا اور شام کو واپس آتا تھا۔ ہم دونوں خوش تھے، بہت خوش، تنہا، اکیلے ــــ دُنیا کے جھمیلوں سے دُور، زمانے کے فریبوں سے الگ! میرے والدین کو میری شادی سے بیحد صدمہ ہوا۔ خصوصاً میری ماں تو یہ جان کر کہ ہیری جینی ہو قریب المرگ ہوگئی۔ چنانچہ اُنھوں نے میرے خطوط کے جواب تک نہ دیئے۔ تاہم میں مسرور تھی اور شادی کا اوائل زمانہ بے فکر اور خوش و خرّم بُلبل کی طرح بسر کرنے لگی۔ ہیری کی عدم موجودگی میں گرما کے خاموش اور پُرسکون دن مجھے افکار میں مبتلا کردیتے اور شام ہوتے ہم دونوں سیب کے درختوں کے نیچے جو پھولوں سے لدے ہوتے بیٹھ جاتے اور ہیری مجھے محبت سے لبریز، پُرسوز نغمے، اور رومان انگیز، المناک داستانیں سُنایا کرتا۔ میں مستقبل کو بالکل بھولی ہوئی تھی، ہیری کے طلسم کو توڑنے کے لیے مجھ میں تاب ہی کہاں سے آتی؟

یہ معلوم کرکے کہ میں عنقریب ماں بننے والی ہوں مجھے ذرا ناگوار گزرا کہ یہ تیسری ہستی ہماری مسرت بے پایاں میں خلل انداز ہوگی مگر ہیری اس سے بے حد خوش تھا۔ اُس نے ایک ہوشیار اور تجربے کار نرس کو گھر پر بلوایا اور چند ماہ بعد میرے ہاں بچہ پیدا ہوا۔ میں کئی روز تک زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا رہی، اور کافی عرصے بعد اس قابل ہوئی کہ ہیری کی پریشانی کو جو اس کے مضطرب چہرے اور بے خواب آنکھوں سے ہویدا تھی اپنی کمزور مُسکراہٹ سے دُور کرسکوں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مجھے مُسکراتا دیکھ کر اُس کی زندگی بھی عود کر آئی ہو۔

اُس نے محبت سے کہا۔" تم بچے کو دیکھنے کی مشتاق ہوگی۔ وہ تندرست و توانا ہو!" یہ کہ کر ہیری خوش خوش بچے کو لے آیا۔ اور اُسے میری آغوش میں لٹا دیا۔ دو ننھے ننھے ہاتھ ہوا میں کھیل

رہے تھے۔ ہیری نے بچّے کے چہرے پر سے کپڑا ہٹا دیا کہ میں بچّے کو دیکھ سکوں لیکن...... میرے پیروں تلے کی زمین نکل گئی۔ میں نے پھر غور سے دیکھا۔ یہ میرا بچّہ تو نہیں ہو سکتا...... یہ...... یہ مضحکہ خیز صورت چُندھی آنکھیں، چپٹی ناک! یہ میرا بچّہ کیسے ہو سکتا ہے؟

" جاؤ ــــــ لے جاؤ اسے یہاں سے!"

میں بُری طرح چیخی۔" یہ کریہہ المنظر شکل!...... یہ میرا بچّہ نہیں ہو سکتا! نکل جاؤ، یہاں سے!"

ہیری درہم ہو گیا اور آہستہ سے اُس نے بچّے کو اُٹھا لیا۔ یہ اس کا بچّہ تھا، اُسی جیسا! لیکن مجھے تو اس امکان کا کبھی خیال بھی نہ آیا تھا۔ میں تو سمجھتی تھی کہ میرا بچّہ مجھ جیسا ہوگا ـــ!!

میری چیخ سُن کر نرس کمرے میں آگئی۔ ہیری سہما ہوا کھڑا تھا، اُس کے چہرے پر حسرت اور اُداسی چھا رہی تھی اور بچّہ اُس کے سینے سے چمٹا ہوا تھا۔ وہ دونوں مجھے غیر معلوم ہو رہے تھے۔

" مجھے اکیلا چھوڑ دو ــــــ مجھے تم سے نفرت ہو گئی ہے!" میں نے بے اختیار ہو کر کہا۔" میں اب تمھاری صورت بھی دیکھنی نہیں چاہتی۔ میں تم سے بیزار ہو چکی ہوں۔"

نرس بولی:" مسٹر لی! ان پر سرسامی کیفیت طاری ہے، اگر آپ تھوڑی دیر کے لیے باہر چلے جائیں تو اچھا ہو۔"

ہیری خاموشی سے اپنے بچّے کو، جسے میں نے قابلِ نفرت سمجھا، سینے سے چمٹائے باہر چلا گیا۔

اس غیر متوقع صدمے سے میری علالت نے خطرناک صورت اختیار کر لی۔ ہیری میرے سرہانے رات رات بھر بیٹھا چُپکے چُپکے روتا تھا اور مجھے تسکین دینے کی مقدور بھر کوشش کیا کرتا تھا۔ میں بمشکل بول سکی۔ " میری ماں کو بُلا دو۔" اور اسے کہتے ہوئے سُنا۔" ہاں، ہاں پیاری! میں تمھاری ماں کو جلد بُلا دوں گا۔"

میرے والدین آئے اور جب میں سفر کے قابل ہو گئی تو وہ مجھے واپس لے گئے۔ بچّے کو دیکھ کر وہ حقیقت حال سے واقف ہو گئے تھے۔ اس لیے اُنھوں نے آئندہ مجھ سے یہ ذکر بھی نہیں کیا۔ ہیری کی طرف سے میرے دل میں اتنا زیادہ تنفر پیدا ہو گیا تھا کہ میں متعجب تھی کہ مجھے اس شخص سے اس قدر گہری محبت ہوئی ہی کیوں؟ میں نے اُس سے شادی ہی کیوں کی جو اس کا بچّہ جننے کی نوبت آئی؟ آخر اس سال کی یاد میرے دل سے اس وقت بالکل محو ہو گئی جب ایک نادر الوجود اور پاک محبت کرنے والی روح نے مجھے اپنی پناہ میں لے لیا۔

کوئی دو سال بھی نہ گزرے ہوں گے کہ میرے پاس یونیورسٹی کا رسالہ آیا جس میں کالج نے پروفیسر ہیری لی کی پیکنگ (چین) میں بے وقت موت پر اظہارِ رنج و الم کیا تھا۔ میں بے حد افسردہ ہوئی لیکن پھر بھی مجھے ایسا محسوس ہوا کہ سر سے کوئی بھاری بوجھ اُتر گیا ہے۔ اور وہ بچّہ؟ میں نے یقین کر لیا کہ وہ بھی مر چکا ہوگا ــــــ اور اس طرح میری کتابِ زندگی کا یہ اہم ورق ہمیشہ کے لیے اُلٹ گیا۔

(۲)

دوسرے سال میری منگنی جیرلڈ سے ہو گئی جو ایک کاروباری فرم میں ملازم تھا۔

میرے والد نے اُس سے میرے لڑکپن کی

شادی کا تذکرہ کرنے کے ساتھ ساتھ اُسے یہ بھی بتا دیا تھا کہ میرا پہلا شوہر مر چکا ہے۔ لیکن انھوں نے یہ نہیں بتایا تھا کہ ہیری چینی تھا اور میں نے بھی یہ قصّہ کبھی نہیں چھیڑا۔

شادی کے بعد ہم لندن کے نواح میں ایک خوبصورت مقام پر رہنے لگے۔ ایک برس بعد ہمارے ہاں لڑکی پیدا ہوئی اور ہم نے اس کا نام روز رکھا۔ اس کی آنکھیں اپنے باپ کی سی اور بال میرے جیسے تھے۔ اور بہت جلد وہ ہم دونوں کی مرکزِ محبت بن گئی۔ بے شمار دن آسودگی سے گزرے۔ ہاں اس گیارہ سال کے عرصے میں میرے والدین کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد پھر آرام سے گزرنے لگی۔ میں اب اُدھیڑ عمر کی ہو چلی تھی اور ایامِ گزشتہ کی تلخ کام یاد کو ماضی نے گم کر دیا تھا۔

ایک دن میرا شوہر دفتر سے آکر کہنے لگا۔ "میں شنگھائی جانے والا ہوں اور فرم کا مالک چاہتا ہے کہ اُس کی لڑکی بھی وہاں کی سیر کر آئے اس لئے اگر تم اس کی نگرانی کے لیے چلی چلو تو وہ تمہارے اور روز کے اخراجات خوشی سے برداشت کرے گا۔" جیرلڈ اور روز شنگھائی جانے کے لیئے بہت بے قرار تھے، مگر میں نہ جانے وہاں کیوں جانا نہیں چاہتی تھی لیکن میرے پاس چونکہ کوئی معقول وجہ نہ تھی اس لیئے فوراً ہی ہم شنگھائی روانہ ہو گئے۔ میری اور روز بہت جلد ایک دوسرے کی سہیلی بن گئیں اور اس سفر سے بیحد خوش تھیں۔

شنگھائی کے ہوٹل میں ہماری مُلاقات جیرلڈ کے دوست مسٹر جم، اس کی بیوی اور اُس کے برادرِ نسبتی جورج سے ہوئی اور اُن کے اصرار پر ہم نے اُن کی یہ دعوت قبول کر لی کہ اُن کے چھوٹے سے خوشنما مکان میں چل کر رہیں جو شہر کے شور و غل سے قریباً پچاس میل کے فاصلے پر تھا۔ جیرلڈ اور جم کام کاج سے فارغ ہو کر ہفتے کو یہاں آتے تھے البتہ جورج اور چند ملازم ہمارے ساتھ ہر وقت رہے، کہ ہمیں مختلف مقامات کی سیر کرائیں، لیکن مجھے اب شور و غل ہی پسند تھا اور یہ خاموش جگہ مجھے ویران معلوم ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ مجھے اُن بدنام چینیوں سے نامعلوم خوف سا لگتا تھا جو سامنے دریا کے کنارے اپنی راہ چلا کرتے تھے۔ چنانچہ میں نے لڑکیوں سے کہہ دیا کہ وہ گھر سے دُور نہ جائیں ایک مُلازم نے بتایا کہ یہ غریب چینی انقلابی ہیں اور کبھی کبھی یہ لوگ رہزنی بھی اختیار کر لیتے ہیں مگر عموماً جانی نقصان نہیں پہنچاتے صرف روپیہ مانگتے ہیں

دریا کے کنارے کوئی دو میل کے فاصلے پر ایک مسمار شدہ کنشتِ چین (بدھی بُت کدہ) کے کھنڈرات تھے۔ ہم نے ایک روز یہاں کی بھی سیر کی، لیکن ہمارے ایک مُلازم دنگ نے ہمیں بتایا کہ یہاں بہت سے غار اور پوشیدہ مقامات ہیں جن کو ہم نہیں دیکھ سکے کیونکہ اُن میں بہت سے بھک منگے پناہ گزیں ہیں۔

ایک دن ہمیں ایک چینی فقیر ملا اور اُس نے اپنا نام داہ بو بتایا۔

"آپ انگلستان سے آئی ہیں؟" اُس نے پوچھا

"ہاں! کیا تم انگریزوں کو پسند کرتے ہو؟" روز جواباً بولی۔

واہ تو کہنے لگا: "میرا ایک دوست ہے اُس کو انگریزوں سے خاص دلچسپی ہے۔"

"کیا تمھارا دوست انگریزوں کو پسند کرتا ہے؟" لڑکیوں نے وہی سوال دُہرایا۔

واہ تو مسکرا کر آہستہ سے کہنے لگا: "ہم دونوں مشنری اسکول میں پڑھتے تھے لیکن میرا دوست انگریز اُستانی کو تگنی کا ناچ نچایا کرتا تھا۔ ایک دفعہ تو بازار میں اُس نے اس پر کیچڑ پھینک دی۔ اس کے بعد ہم نے بہتری اسی میں سمجھی کہ وہاں سے بھاگ آئیں۔"

لڑکیاں یہ سُن کر بڑے زور سے ہنسیں۔

دوسرے دن میں باغ میں بیٹھی ہوئی تھی۔ میں نے دیکھا کہ واہ تو اور اُس کے ساتھ ایک اور شخص دیوار پر سے مجھے جھانک رہے ہیں۔

"لی ہونگ! اس میم کو دیکھو" واہ تو نے اپنے ساتھی سے کہا۔

مجھے ایسا معلوم ہوا کہ لی ہونگ کی وہ —— سیاہ آنکھیں —— جن سے تحقیر و ملامت برس رہی تھی —— میرے دل کو چھلنی کر دیں گی۔ چین کے وہ تمام خوف جن کو میں اب تک بھولنے کی کوشش کرتی رہی، اس وقت میرے دل و دماغ پر چھا گئے اور میں نے چاہا کہ وہاں سے بھاگ کر کہیں چھپ جاؤں۔

لی ہونگ اور واہ تو دریا کی طرف چلے گئے۔ تھوڑی دُور چل کر وہ مسز جم اور دونوں لڑکیوں کے پاس سے گزرے جو پانی سے کھیل رہی تھیں۔ میں نے دیکھا کہ لی ہونگ کچھ دیر تک وہاں ٹھٹک کر اُن کو گھورتا رہا۔

اس وقت کے بعد سے میرا دل گھر سے باہر نکلنے کو نہیں چاہتا تھا۔ لیکن دن میں ایک آدھ مرتبہ میں لی ہونگ کی جھلک ضرور کہیں آس پاس پھرتے دیکھ لیتی تھی۔ اور ہر دفعہ وہ سیاہ ڈراؤنی اور تنفر آمیز نظریں مجھے کھائی جاتی تھیں۔ ایک دفعہ جورج اُسے دیکھ کر کہنے لگا: "واہ تو کہتا ہے، وہ شخص نصف انگریز ہے۔"

"نصف انگریز!" میرے مُنہ سے حیرت و استعجاب میں نکلا۔

"ہاں! وہ کہتا ہے کہ اس کا باپ ایک زبردست عالم تھا—— پیکنگ یونیورسٹی میں پروفیسر—— اور لی ہونگ کے بچپن ہی میں اُس کا انتقال ہو گیا تھا۔ اُس وقت سے یہ در بدر بھیک مانگتا پھرتا ہے۔"

مجھے ایسا معلوم ہوا گویا کوئی میری رُوح سلب کر رہا ہے۔ میں نے اپنے کمرے کے دروازے بند کر لیے اور رات بھر کسی خیال سے لرزتی رہی۔ میں سمجھ گئی تھی! خدا نے، جو انصاف والا ہے، مجھے اس جگہ اس لیے بھیجا تھا کہ ندامت اور ملامت میرے ایمان کو اپنے تیروں سے مُردہ کر دیں اور میں سمجھ لوں کہ دُنیا اتنی وسیع نہیں کہ اُس کا کوئی حصّہ مجھے اپنے افسوس ناک اعمال کے نہ ٹلنے والے نتائج سے محفوظ رکھ سکے۔

آخر کار میں نے اپنے آپ کو قسمت کے سپرد کر دیا کہ جو ہونا ہے ہو جائے گا، چنانچہ لی ہونگ کی آنکھوں سے بچنے کی میں نے پھر کوئی کوشش نہیں کی۔ ایک بار میں دریا تک شکستہ دل اس طرح چلی گئی کہ رُوح بیمار تھی اور جسم تکلیف میں مبتلا۔ وہ بھی میرے پاس آ گیا......... مگر میں اُسے دیکھتے ہی ناگہانی اضطراب میں چلّائی: "جاؤ—— یہاں سے چلے جاؤ!"

"میں کُتا نہیں ہوں جیسے تم یوں دھتکار دو۔" اُس نے غمگین آواز میں جواب دیا۔

کانپتے ہوئے میں نے پوچھا۔" تم ــــ چاہتے ـــــ کیا ہو؟"

"کچھ بھی نہیں۔ میں مغربی عورتوں کو بتانا چاہتا ہوں کہ مجھے اُن سے نفرت ہے۔ میں ..... میں ..... اُنھیں مار ڈالنا چاہتا ہوں۔" اُس کی سیاہ آنکھیں چمک اٹھیں اور میں ڈر کر پیچھے ہٹی، مگر وہ بھی قریب آگیا اور کہنے لگا" میری ماں ــــ ایک انگریز عورت تھی ..... مشنری اسکول میں انھوں نے مجھے بہت سی باتیں بتائیں لیکن یہ کوئی نہ بتا سکا کہ میری ماں نے مجھے حقارت سے کیوں ٹھکرا دیا۔ میرا باپ ایک جیّد عالم تھا......" وہ فخر سے سر بلند کر کے کہنے لگا۔

" اگر ــــ میرا معزز باپ مجھے تعلیم دینے کے لئے زندہ رہتا ــــ تو میں بھی آج عالم ہوتا۔"

میں نے آہستہ سے پوچھا۔" آخر تم یہ ــــ مجھے کیوں بتا رہے ہو؟"

لی ہونگ نے اپنے شانے ہلائے۔" میں اُس نفرت کا اظہار کیا کرتا ہوں جو میرے دل میں روز بروز متلوّن مزاج میموں کے لئے بڑھتی جاتی ہے۔"

وہ وہاں سے دریا کے کنارے کنارے جانے لگا۔ میں اُس کی طرف کھڑی تکتی رہی۔ کاش مجھے کوئی اس سوہانِ روح، مجسم غم و خوف سے آزاد کرا سکتا!

ایک دن روز اور میری، ونگ کے ساتھ مچھلی کا شکار کر رہی تھیں۔ میں تھوڑے فاصلے پر تھی، یکبارگی میں نے دیکھا کہ واہ کو اور پانچ چھ اور چینیوں نے لی ہونگ سے کچھ باتیں کر کے لڑکیوں کو گھیر لیا اور ونگ کو بُری طرح زخمی کر دیا۔ میں بے قابو ہو کر اُس طرف چیختی ہوئی دوڑی۔" ان کو چھوڑ دو ــــ چھوڑ دو۔"

مسز جم بھی میری آواز سُن کر آگئیں اور ہم دونوں لڑکیوں کو چھڑانے کے لئے جدو جہد کرنے لگیں۔

اتنے میں، میں نے لی ہونگ کی آواز سُنی" جلدی کرو ــــ صرف لڑکیوں کو بھگا لے جاؤ۔"

ہم دونوں واہ کو سے لڑ رہی تھیں اور باقی چینی لڑکیوں کو لے جا رہے تھے۔ میں نے چیخ کر کہا۔

" لی ہونگ! ایسا نہ کرو ــــ ان کو چھوڑ دو۔"

اُس نے میری طرف گھور کر دیکھا، اُس کی آنکھیں زہر میں بجھی ہوئی تلواریں معلوم ہوتی تھیں۔" کل تمھارے مرد شنگھائی سے آجائیں گے اُن سے کہہ دینا کہ رُوپیہ تیار رکھیں، لڑکیاں تمھیں واپس مل جائیں گی۔ میں واہ کو کو اُن سے ملنے بھیجوں گا ــــ روپیہ تیار رکھنا، اس سے بچارے بھوکے فاقوں سے بچ جائیں گے۔"

میں نے لی ہونگ کو پکڑ لیا اور میری اُنگلیاں اُس کے کپڑوں میں اُلجھ گئیں۔" واپس چلی جا ــــ اے انگریز عورت!" لی ہونگ مجھے حقارت سے پرے ہٹاتے ہوئے بولا" روپیہ تیار رہے، لڑکیاں واپس بھیج دی جائیں گی۔"

" سُنو تو سہی لی ہونگ!" میں نے التجا کرتے ہوئے کہا" تم یہ کر کیا رہے ہو، تم سمجھتے بھی نہیں! وہ میری لڑکی ہے ــــ تم ــــ میری لی ہے ــــ اور وہ تمھاری ــــ بہن ہے!!"

میں نیم بیہوش ہو کر گر پڑی۔ اُس نے مجھ کو دیکھنا تک گوارا نہیں کیا۔ دُور سے میں نے روز

کی نحیف صدا سُنی۔

"ہاں! ــــ ہاں!"۔

جب مجھے ہوش آیا تو میں اپنے بستر پر لیٹی ہوئی تھی اور مسز جم میرے پاس بیٹھی ہوئی تھیں۔

(۳)

مسز جم کی تسلّی اور ہمدردی سے متاثر ہو کر میں نے اپنی کہانی کا کچھ حصّہ اُسے سُنا دیا۔ وہ کہنے لگیں کہ یہ لوگ لڑکیوں کے ساتھ کوئی تشدّد نہیں کریں گے، صرف روپیہ چاہتے ہیں۔

"کیا خبر لی ہونگ انتقام لینے پر آمادہ ہو جائے"۔ میں نے روتے ہوئے کہا۔

دوسرے دن دوپہر کو جیرلڈ اور جم آ گئے، ونگ نے راستے ہی میں اُن کو اس واقعہ سے مطلع کر دیا تھا۔ اپنے شوہر کی صورت دیکھ کر میں ایک اور خوف سے لرز گئی ــــــــ کہ اُسے جب میری گزشتہ زندگی کا حال معلوم ہوگا تو اُس کا اعتماد اور محبت چکنا چور ہو جائے گی!۔

جیرلڈ واہ لو کا انتظار کئے بغیر فوراً بُت کدے کی طرف روانہ ہو گیا جہاں ان بھک منگوں کی جائے قیام تھی۔ جورج گھر پر رہا، باقی سب جیرلڈ کے ہمراہ ہو گئے۔ جب ہم بُت کدے کے قریب پہنچے تو ایک بندوق چلنے کی آواز آئی اور اس کے ساتھ ہی نصف درجن چینی کھنڈر میں سے نکل کر ہماری طرف دوڑ پڑے۔ اُنھوں نے ہمیں گھیر لیا اور روپے کا مطالبہ کیا۔ میں دوڑ کر لی ہونگ کے پاس پہنچی۔ اُس کی پیشانی سے جیتا جیتا خون بہہ رہا تھا۔

"میری بچّی کہاں ہے؟"

عین اُسی وقت واہ لو، روز اور میری کو کلائیوں سے پکڑ کر ہماری طرف لانے لگا مگر باقی چینی ان کو پھر گھسیٹ کر واپس لے گئے۔ یہ دیکھ کر جیرلڈ سے نہ رہا گیا اور اُس نے چینیوں پر گولی چلا دی۔ چینی بگڑ گئے اور بپھرے ہوئے شیروں کی طرح میرے شوہر اور جم پر پل پڑے۔

مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ لی ہونگ اور اُس کے ساتھ اُس کا دوست واہ لو چاہتے تھے کہ لڑکیوں کو بغیر روپے کا مطالبہ کئے واپس کر دیں لیکن دوسرے لوگ اس پر راضی نہیں ہوئے، چنانچہ انھوں نے بچارے لی ہونگ پر حملہ کر کے اُسے زخمی کر دیا۔ . . . مگر اس کے باوجود مجھے اندیشہ تھا کہ لی ہونگ مجھ سے انتقام لے کر رہے گا۔

"اسے کوئی تکلیف نہ پہنچاؤ لی ہونگ! ــــ یہ میری بچّی ہے" ــــ میں نے عاجزی سے کہا۔

ہماری نظریں ملیں۔ اب اُن سیاہ آنکھوں سے وہ تنفّر اور وہ حقارت معدوم ہو گئی تھی ــــ "ہاں! اُس بچّی کو کوئی تکلیف نہیں پہنچے گی"۔

میرا شوہر غصّے میں چلّایا "اس گدھے سے کیوں عاجزی کرتی ہو؟" یہ کہہ کر وہ لی ہونگ کی طرف جھپٹ کر آیا اور اس کے چہرے پر زور سے ایک مُکّا مارا۔

لی ہونگ نے کوئی حرکت نہیں کی ــــ زبان سے ایک لفظ تک نہیں نکالا ــــ لیکن یہ دیکھ کر کہ اس کے دوست نے جیرلڈ کی طرف بندوق تانی ہے، وہ بجلی کی طرح بندوق اور میرے شوہر کے درمیان آ گیا۔ گولی لی ہونگ کے پار ہو گئی اور وہ لڑکھڑا کر گر پڑا۔

آتشِ جنوں سرد ہو گئی۔ لوگ لی ہونگ کے گرد جمع ہو گئے۔ اُس نے شکستہ آواز مگر تحکمانہ لہجے میں کچھ کہا اور دو چینی جلدی سے لڑکیوں کو لے آئے۔ میں نے دیکھا کہ لی ہونگ کی دُکھ اور رنج سے لبریز آنکھیں کسے تلاش کر رہی ہیں۔ جیرلڈ بھی اُسے ——— جس نے اپنی زندگی قربان کر کے اس کی جان بچائی ——— اپنے قدموں میں لوٹتا دیکھ کر بہت متاثر ہوا۔

میرا راز ابھی تک پوشیدہ تھا اور کسی طرح مجھے یقین ہو گیا تھا کہ لی ہونگ اپنے مُنہ سے کچھ نہ کہے گا لیکن جب میں نے اُسے عالمِ جانکنی میں دیکھا تو میرے سازِ حیات میں ارتعاش پیدا ہو گیا۔ اس کی آنکھیں مجھ پر جمی ہوئی تھیں ——— کچھ کہہ رہی تھیں۔ کچھ التجا کر رہی تھیں۔ میرے دل میں ترحم کا ایک طوفان بپا ہو گیا ——— وہ میرا ہی تو بچہ تھا، میرا ہی خون! وہ غریب و ناتواں جسم، وہ بھولی روح ہیری ——— میرے محبوب ——— ہی کا تو بیٹا تھا!!

میں اب بھی وہاں سے اپنا راز محفوظ لے کر آسکتی تھی مگر نہیں، میری رُوح پُکار پُکار کر کہہ رہی تھی "جا اِن عنقریب بند ہو جانے والی آنکھوں کی خاموش التجا کو سُن لے اجا اُس کے پاس جا اور اُس کو اپنے سینے سے لگا لے"۔ اس کی آنکھیں یہی التجا کر رہی تھیں مگر کوئی مجھ سے کہہ رہا تھا کہ وہ زبان سے کچھ نہیں کہے گا۔

میں وہیں بیٹھ گئی اور میں نے اُس کا سر اپنی آغوش میں لے لیا۔

"میں اس نازیبا حرکت پر بے حد متاسف ہوں"۔ اُس کا سانس اُکھڑ چکا تھا، وہ رُک رُک کر کہہ رہا تھا۔

"اس بچی کو کوئی تکلیف نہیں پہنچائی گئی ——— مگر پھر بھی اس کی ماں کو تو تکلیف ہوئی ہو گی ——— بچہ نہ جانے اپنے ماں باپ کی آغوش کے لئے کیوں بیتاب رہتا ہے ..... میں اس قابل نہیں ہوں کہ آپ جیسی خاتون مجھے یہ عزت بخشیں"۔

میرا دل بھر آیا تھا۔ اس سے زیادہ رحم میرے دل میں کبھی پیدا نہیں ہوا تھا۔ میری رُوح گناہ کی بیڑیاں توڑ رہی تھی۔ "اس کی ہو جا! اس لڑکے کی، جو تنہا اور کوئی دم کا مہمان ہے!"

مسز تھم لڑکیوں کو گھر لے گئیں اور میں نے اپنے شوہر کو اپنے پاس بٹھا کر کہا "اس نے تمھاری جان بچائی ہے جیرلڈ! اس سے کچھ تسکین آمیز باتیں کرو"۔ اور گویا خدا کہلوا رہا ہو، میں نے آہستہ سے کہا "یہ ——— ہیری لی کا بیٹا ہے ——— میرا بیٹا!"

جیرلڈ کا چہرہ اُتر گیا لیکن میں نے قطعی پرواہ نہیں کی۔ میں تو اعتراف کر رہی تھی کہ "یہ میرا بیٹا ہے"۔

"اے خاتون! آپ کس قدر رحم دل ہیں!"۔ لی ہونگ کے مُرتعش ہونٹ سخت ہوتے جا رہے تھے۔

"ہیری لی ——— کیا چینی تھا؟" جیرلڈ نے گھٹی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"ہاں!" میں آہستہ سے بولی، مجھے کوئی یاد آ رہا تھا۔ "وہ ایک زبردست عالم تھا"۔

لی ہونگ کے بُشرے پر خوشی اور اطمینان کی ایک لہر دوڑ گئی "میری دلی خواہش ہے کہ میں اپنے نہایت معزز باپ کے پاس سوؤں"۔ اُس نے بمشکل کہا "وہ پیکنگ میں پیوندِ خاک ہے"۔

"ہاں ——— ہاں ——— ایسا ہی ہو گا"، میں نے

اس سے وعدہ کیا۔

اگرچہ جیرلڈ دم بخود تھا، پھر بھی اُسے احساس تھا کہ اس کی آنکھوں کے سامنے وہ بچہ اپنی زندگی کے آخری سانس لے رہا ہے جس نے اس کی جان بچائی۔ وہ لی ہونگ پر جھک گیا اور پیار سے اُس کی پیشانی پر سے موت کا پسینہ پونچھنے لگا۔

لی ہونگ کی نظریں میرے چہرے پر سے نہیں ہٹیں۔ اُس نے اپنا رُخسار میرے سینے سے ملا دیا۔ کیا کوئی غیبی طاقت مجھے دُنیا کے اُس کونے سے یہاں اس لئے کھینچ کر لائی تھی کہ یہ بچہ اپنی ماں کی آغوش میں دم توڑے؟ —— وہ آغوش جس نے اُسے پیدائش کے وقت نفرت و حقارت سے ٹھکرا دیا تھا؟ میں نے اُس کے رُخسار پر اپنے لب رکھ دئے، اُس کے جسم میں ایک کپکپی سی پیدا ہوگئی۔ "ما۔ں"۔ اُس کے مُنہ سے آخری بار بصد حسرت و یاس نکلا، اور اس کی آنکھیں ہمیشہ کے لئے بند ہوگئیں۔

جب جیرلڈ نے اسے میری گود سے اٹھا کر اپنی آغوش میں لیا تو میرے دل میں ایک قیامت برپا ہوگئی۔

"اسے پیکنگ میں اس کے باپ کے پاس سُلا دو!" اور جیرلڈ نے تسلی دیتے ہوئے کہا: "ہاں! یہ وہیں سوئے گا!"

چند دن بعد ہم وطن روانہ ہوگئے۔ مجھے ہوش نہ تھا کہ ہو کیا رہا ہے۔ جب حواس دُرست ہوئے اور میں کچھ سمجھ سکنے کے قابل ہوئی تو میں نے محسوس کیا کہ میرے شوہر کے مغموم و ہراساں رہنے کی وجہ، جو اُس کی روحانی اذیت کا باعث ہوئی، یہ تھی کہ میرا ایک بچہ تھا —— جو میری سنگ دلی کی وجہ سے جب تک جیا، دو دو دانوں کا محتاج رہا۔ جیرلڈ اس دُکھ میں خود ہی مبتلا تھا، کاش وہ مجھے بھی اس میں شریک کر لیتا! اس کی اُداس آنکھیں اُس کے دل کا پتہ دے رہی تھیں، کاش وہ مجھ پر بھی اپنی زبان سے اس کا اظہار کر دیتا!

ایک سہ پہر کو معاً میں نے اپنے شوہر سے کہا۔

"جیرلڈ میں تمھاری محبت کی مستحق نہیں ہوں پھر بھی میری خواہش ہے کہ تم مجھ سے محبت کرو —— مجھے اب تمھاری محبت کی بے حد ضرورت ہے —— میں چین جانا نہیں چاہتی تھی لیکن کوئی مجھے زبردستی وہاں دھکیل رہا تھا —— مجھے اپنے اعمال کی سزا مل رہی ہے —— اور جب مجھے خیال آتا ہے کہ بیس سال کے بعد بھی میں اس سے نہ بچ سکی تو کانپ اُٹھتی ہوں۔ کیا میرے بچے کو میری آغوش میں اس لئے موت آئی تھی کہ میری سزا پوری ہو جائے اور یا وہ خود ہی تمام عمر اس کی دُعا مانگتا رہا؟ —— جیرلڈ اب میں پہلی سی نہیں رہی، مجھ پر ترس کھاؤ!"

جیرلڈ نے مجھے اپنے سینے سے لگا لیا۔ "میں اپنی غیر ذمے دارانہ روش پر بے حد نادم ہوں جیرلڈ! میں سزا سے بچتی بھی کہاں تک؟ اور خدا جانے یاد، مجھے تڑپنے کے لئے کب تک زندہ رہنے دے؟... تمھارے بغیر تو میں اور بھی بے یار و مددگار رہ جاؤں گی۔ جیرلڈ! مجھے اپنی محبت دے دو!"

میرے شوہر نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا جس سے میں اطمینان اور سکون سا محسوس کرنے لگی۔

گھر پہنچے ہمیں دو ڈھائی مہینے ہو چکے تھے ایک

دن روزؔ نے غمگین آواز میں کہا۔ "امّی ——— نہ جانے لی ہونگ مجھے کیوں یاد آئے جاتا ہے!"

میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا، وہ کہنے لگی: "ابّا کہتے ہیں کہ میں اُن واقعات کا ذکر تک نہ کروں مگر اچھی امّی! صرف اس دفعہ مجھے کچھ کہنے کی اجازت دیجئے۔ کیوں کہ میرا دل مجھے مجبور کر رہا ہے۔ وہ بُرا آدمی تو نہیں تھا، کیوں امّی؟ اس نے ابّا کی جان بچائی اور اس کے علاوہ جب وہ چینی ہمیں غار میں لے گئے تو اُس کا سلوک ہمارے ساتھ نہایت شریفانہ تھا۔ اُس نے ہمیں کھانا کھلایا اور پھر وہ فرش پر میرے رُوبرو بیٹھ گیا۔ چند لمحات تک وہ میری طرف حسرت اور محبت سے دیکھتا رہا، پھر اُس نے انگریزی میں کہا۔ "چھوٹی بہن! ——— چھوٹے سے سیب کے پھول!" مجھے اس سے کبھی ڈر نہیں لگا۔ اور دیکھنا امّی! اس نے مجھے ایک آرام دہ بستر پر لٹا دیا۔ اور جب میں سوکر اُٹھی تو میں نے دیکھا کہ وہ خود زمین پر لیٹا ہُوا ہے اور امّی! ——— رو رہا ہے!! اُسے مجھے اور میری گود سے جانے کا بڑا رنج تھا، تھا نا؟ اُسے یاد کرکے مجھے رونا سا آجاتا ہے ——— میں چین کے تمام واقعات ایک نہ ایک دن بھول جاؤں گی، مگر امّی ——— لی ہونگ کو کیسے بھلا دوں؟"

میری آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔

"لی ہونگ نے تمہارے باپ کی جان بچائی تھی۔ روزؔ! وہ ——— بہادر ——— تھا!" میں نے اس سے گلوگیر ہوکر کہا اور اس طرح اُس ٹھکرائے ہوئے بچّے کی اندوہ ناک یاد میں ایک اور دردناک یاد کا اضافہ ہوگیا۔ لی ہونگ نے میری بچّی کو اپنی پناہ میں لے لیا تھا! ——— وہ جانتا تھا کہ یہ بچّی کون ہے!! ——— اور وہ اس کے لئے رو رہا تھا!؟

یہ بہار کا موسم ہے اور گزشتہ گرمیوں کے واقعات بہت دیرینہ معلوم ہوتے ہیں۔ جیرلڈ دفتر سے آنے والا ہے اور روزؔ دروازے پر اُس کا انتظار کر رہی ہے۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں کی محبت آپس میں روز بروز بڑھ رہی ہے۔ شاید یہ میرا خیال ہی خیال ہے کہ جیرلڈ روزؔ کو صرف اپنی بچّی سمجھتا ہے اور میری برائے نام ——— کیونکہ میرا بچّہ تو وہ تھا۔

ہوا کے ایک لطیف جھونکے نے سیب کے سپید پھُول روزؔ کے بالوں پر بکھیر دئے ہیں اور وہ اپنے باپ کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے آرہی ہے لیکن میرا دل دُور، بہت دُور ایک ایسی سنسان جگہ مصروفِ ماتم ہے جہاں ایک بہادر بچّہ اپنے عالِم اور معزز باپ کے پہلو بہ پہلو محوِ خواب ہے۔

ساقی (افسانہ نمبر ۱۹۳۷ء) ——— نامعلوم

جزیرۃ البلّور

اُن تمام اقلیموں اور سمندروں سے کہیں دُور، جن تک عقلِ انسانی پہنچ سکی، ممالک سپین اور ماتپین کے مغربی سرے پر، دو نیلی اُفقوں کے درمیان ایک پُر افسوں جزیرہ واقع ہے۔ اس کا اصل نام کوئی نہیں جانتا، فسانہ نگار بھی نہیں جانتا مگر چند ملاح جو اتفاقیہ طور پر اُس کی ایک خیرہ کُن جھلک دیکھ سکے، اُسے "جزیرۂ بلوریں" کہتے ہیں۔

اس جزیرے میں، جو تمام سمندری جواہرات کا بہترین اور نادر نمونہ ہے، ایک دفعہ آسمانِ مسرت کی پاک دیوی صرف ایک لمحے کے لئے اُتری جس کی کہانی عذرا ر شام کی طرح تمام روئے زمین پر پھیل گئی ——— اور یہی وہ جگہ ہے جہاں سلطان کے انجذابِ محبت نے دو دلوں پر تحیر خیز تسلط حاصل کیا تھا — !

اس جزیرے کی فضا استعجاب سے لبریز ہے۔ یہاں شیر اور چیتے، انسان اور مسکین جانوروں کے ساتھ ہم آہنگی سے رہتے ہیں۔ اُن کے معصوم اور بڑے بڑے جبڑے جو آلودگیٔ خون سے قطعاً پاک ہیں، صرف اس لئے کھلتے ہیں کہ وہ خلّاقِ حُسن کے آگے سرِ نیاز خم کریں اور اس کی توصیف میں یہ مقدس الفاظ فضائے بسیط میں بکھیر دیں۔ "اللہ اکبر!" وہاں بھی شہ زور سپہ سالار اپنے دلیر ہاتھیوں کی سواری کرتے ہیں، مگر اس لئے نہیں کہ نبرد آزمائی کر کے جنونِ جنگ میں بے گناہ انسانوں کے خون سے اپنے ہاتھ رنگ لیں، بلکہ اس لئے کہ زربفت کی چھتریوں کے سائے میں نیلے نیلے عظیم المرتبت پہاڑوں کی خالص ہوا سے لُطف اندوز ہوں۔ وہاں دوشیزگانِ نازک اندام معطّر نسیمِ سحر میں محوِ خرام ہوتی ہیں۔ اُن کی لطیف و معصوم شوخیاں دارچینی اور جائفل کے سبز پتّوں میں کپکپی پیدا کر دیتی ہیں۔ وہ اکثر عشق پیچاں کی لچک دار بیلوں پر بُلبل کی طرح جھُولتی رہتی ہیں۔ وہاں ٹیلوں کی محرابیں چمکنے والے کُندن کی بنی ہوئی ہیں اور پُل ہاتھی دانت اور قیمتی اشیا سے تیار ہوئے ہیں، لیکن اس ڈر سے کوئی بھی اُن پر چلنا نہیں چاہتا کہ کہیں اُن کے قدموں سے اُن میں عیب نہ پیدا ہو جائیں اور اس کی بجائے وہ اپنے سفید گھوڑوں اور عظیم الجسم ہاتھیوں کو دریاؤں میں ہی چُمکار کر چلاتے ہیں۔ وہاں دُودھ اور شہد کے دریا بہتے ہیں۔ جن کی خوبصورت موجیں اُن کے سینوں تک اُٹھ آتی ہیں۔

فردوسِ تخیّل کی حسین پریوں کی آرام کی خاطر کہیں کہیں زینے بھی بنائے گئے ہیں، جن کو چاندی اور سنگِ سماق سے تیار کیا گیا ہے۔ یہ چیزیں وہاں صرف اس لئے ہیں کہ فردوسی مناظر میں کسی قدر ارضی حُسن کا بھی اضافہ ہو جائے۔

اَن گنت سُنہری اور روپہلی گھڑیاں گزُریں، اس جزیرۂ سحر میں ایک حسین وجمیل دوشیزہ اپنی خیرہ کُن شان وشوکت کے ساتھ جلوہ فگن تھی۔ اس کا جمال ماہِ چہاردہم کے چمک دار چہرے پر شرمندگی کی نقاب ڈال دیتا تھا اور یاسمن اُس کے حُسن سے ہمسری کرتے ہوئے نادم ہوتی تھی۔ اُس کا نام تھا ——— "شعلۂ دل"!

وہ اُس حُور کی مانند تھی جس کو اگر انسانی آنکھیں دیکھ لیں تو مسحور ہو جائیں۔ اُس کا رنگ گندمی تھا اور آنکھیں شرابِ ارغوانی سے چھلکتے ہوئے دو بلوریں جام اس کے چہرے پر معصومیت کی جھلک تھی، اور لب ہائے لعلیں انار کے دانوں کو مات کرتے تھے۔ اس کا چاہِ زنخداں مُشک کو پانی پانی کرتا تھا۔ اس کے نازک ولطیف جسم سے آس پاس کی فضا معطر ہو جاتی تھی کیوں کہ وہ ——— عنبر پاش" قلبِ گلاب" تھی! اس کا حسین دہانہ کالمعدوم اور رسیلے آلوچہ کی طرح رنگین تھا۔

آپ نے قمری تو دیکھی ہوگی جس کی گردن میں طوق نمایاں ہوتا ہے؟ درحقیقت یہ طوقِ غلامی ہے جو اُس نے شعلۂ دل کی یاد میں اپنی نازک گردن میں ڈالا ہے۔ آپ نے قمری کو سروِ پر عالمِ بے قراری میں کُوکُو کرتے سُنا ہوگا...... یہ اُسی فردوسی نازنین کی مضطرب یاد ہے۔ شاید اُس نے کبھی اُس کی ایک جھلک دیکھی ہوگی۔

رات کی تاریکیوں میں آپ نے شمشاد کی گھنی شاخوں پر غمِ فراق میں تڑپنے والی بُلبل کو گاتے سُنا ہوگا ——— یہ سب کچھ اُسی دل گرفتہ "شعلۂ دل" سے شکوے ہیں جو اُس کے معصوم دل کی گہرائی سے بلند ہوتے ہیں۔

لازم تھا کہ اس عجوبۂ روزگار حسینہ سے ——— جس کا مسکن شاید فردوس کا کوئی تخیلی گوشہ ہوگا ——— شادی کی درخواست کوئی ایسا شخص کرے جو کم از کم شہزادہ ہو، شہنشاہ ہو، بلکہ جس کی تمام پُشتیں حکمرانی کرتی آئی ہوں۔

چنانچہ جزیرۃ البِلّور کے ارکینِ سلطنت کی دُلہنوں نے ساز باز کر کے شعلۂ دل کی شادی شہنشاہ سے ٹھیرادی۔ شہنشاہ نے بھی بے شمار زرق برق اور بیش قیمت تحائف اُس کی خدمت میں بھیجنے کے بعد اپنی رضامندی کا اظہار کیا۔ شاہانہ دستور کے مطابق تمام رسوم ادا کی گئیں اور تمام دُعاؤں اور خلاقِ اعظم سے التجاؤں کے بعد شعلۂ دل دلہن بن کر طلائی پالکی میں سوار ہو، شاہی جلوس کے ساتھ قصرِ شاہی میں متمکن ہوئی۔

تمام باتیں رسم ورواج کے موافق طے ہوئی تھیں، مگر دُلہن کے والدین نے ایک بات نظر انداز کر دی۔ اور یہی لازمی تھی، اگرچہ اُنھوں نے اس کو ضروری نہ سمجھا...... اُنھوں نے اس شادی میں دُلہن کا عندیہ نہیں لیا تھا!

چنانچہ جب شہنشاہ حجلۂ عروسی میں داخل ہوا تو اُس کا چہرہ اُتر گیا اور ایسا معلوم ہونے لگا کہ اس کا دل خوف سے بھر گیا ہے۔ اس نے محسوس کیا گویا کسی نے اس کے سینے پر پہاڑ رکھ دیا ہے۔ اُس نے دیکھا کہ بجائے چودھویں کے چاند کی طرح جلوہ فگن ہونے کے وہ عروسِ جمیل ریشمین گدّوں اور تکیوں

میں مُنہ چھپائے سُبکیاں لے رہی ہے۔ پھر بھی وہ شفقت اور نرمی سے اس کی طرف یہ سوچتا ہوا بڑھا کہ خوف کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی۔ سب ہی لڑکیاں اپنے گھر سے علیحدہ ہونے پر رنجیدہ ہوتی ہیں اور شیریں الفاظ تو سینے کے بھاری سے بھاری بوجھ کو بھی ہلکا کر دیتے ہیں۔ پھر وہ دُلہن کی مزیّن پیشانی پر جھُکا اور کہنے لگا۔

"اے ملکۂ قلب تجھے اپنے حُسن کا واسطہ! مجھے بتا کہ کیوں تو اِن مسحور کُن آنکھوں کی چمک دار روشنی کو دُھندلا کر رہی ہے؟ اور وہ کیا چیز ہے جو تجھے اس قدر تکلیف پہنچا رہی ہے کہ تو اُس شخص کی موجودگی کو بھی بھول گئی جو اپنی قسمت تیرے قدموں پر نثار کرتا ہے؟"

مگر زخم خوردہ حسینہ اِن الفاظ سے اور بھی متاثر ہوئی اور آنسو اُس کے گلابی رُخساروں پر اور بھی شدّت سے بہنے لگے۔

بادشاہ نے اُس سے کہا۔" میرے دل کی رانی! اگر یہ آنسو تیری ماں کی یاد میں ہیں تو مجھ سے کہہ تاکہ مَیں ابھی جا کر اُسے یہاں لے آؤں۔"

مگر اس پر اس نے اپنے نازک سر کو انکاری جنبش دی اور اس کی سِسکیاں پہلے سے بھی زیادہ ہو گئیں۔ بادشاہ پھر بولا۔" شاید تجھے اپنی سہیلی کا رنج ہے اور ہرن کا، یا بلبل ہزار داستان کا، یا مور کا! اگر یہی بات ہے تو مجھے بتا اور مَیں، بذاتِ خود فوراً جا کر تیرے دل کی خواہش پوری کر دوں۔"

مگر سِسکیاں لیتی ہوئی دُلہن نے نفی میں سر کو ایک لطیف جنبش دی۔ بادشاہ چند لمحات تک سوچتا رہا اور پھر بولا۔" شاید تو اس لئے اُداس ہو کر تو اپنے بچپن اور کنوار پنے کے گھر سے وداع ہو گئی ہے۔ یہ سچ ہے تو مجھ کو بتا! تیری بلوریں پیشانی کی قسم، جو ستاروں کو شرماتی ہے۔ مَیں ابھی تیرے ہمراہ اُسی مکان میں چلا جاؤں گا اور ہمیشہ وہیں تیری خدمت میں رہوں گا۔"

شعلۂ دل جب اپنے شاہی دُولھا کے مُنہ سے یہ پرستش کے الفاظ سُن چکی تو اسے کسی قدر تسکین ہوئی۔ آخر کار وہ یوں گویا ہوئی۔" میرے آقا! نہ مَیں اپنی ماں کے لئے روتی ہوں اور نہ اپنی سہیلی کے لئے، نہ اپنے معصوم غمگساروں کے لئے اور نہ بچپن کے مکان کے لئے، بلکہ مَیں صِرف "اپنے" لئے روتی ہوں — جو ایک مُرجھایا ہوا پھول ہے ...... ایک بے حِس لاش۔"

یہ اندوہناک الفاظ سُنتے ہی بادشاہ جذبات سے مغلوب ہو گیا اور بے قابو ہو کر بولا" اے عورتوں کی ملکہ! مَیں اب سمجھا — تجھے اپنے قابلِ نفرت شوہر کا ماتم ہے، جسے قسمت نے تیرے لئے لکھ دیا .... آہ!"

لیکن شعلۂ دل نے اپنے وقار کو قائم رکھتے ہوئے ذرا زندہ دلی سے کہا۔

"اے شاہِ دوراں! تیری بیش بہا زندگی کی قسم! خُدا نہ کرے جو اس قسم کا خیال بھی تیری کنیز کے دل میں آئے ...... مگر مَیں تجھ سے التجا کرتی ہوں مجھے مجبور نہ کر کہ مَیں اس راز کا انکشاف کر دوں جو صِرف میری ہی رُوح کی امانت ہے۔"

لیکن بادشاہ عاجزانہ التجا اور التماسانہ منّت سے مُصر ہوا کہ وہ اس راز کو بتا دے جس نے اُس کی جان پر بنا دی ہے۔ چنانچہ شعلۂ دل بولی۔" تو سُن

اے شہنشاہِ وقت! ــــ ان آنسوؤں کی وجہ اور میری تمنائے موت کا سبب محض "عشق" ہے .... یعنی سُلطان کی محبّت! ...... کیونکہ ــــ اے حکمرانِ سلطنت! ــــ محبت ایک پودا ہے جس کی جڑ ارضِ قلب میں پیوست ہوتی ہے اور اُس پودے کو اُکھاڑنے سے پیشتر اس دل ہی کو نیست و نابود کر دینا ضروری ہے۔ اے جلیل القدر بادشاہ! تیری لونڈی کا دل بچپن ہی سے ایک ایسے شخص کا ہو چکا ہے جو اقلیمِ عشق کا واحد حکمران ہے۔ ہاروت فرشتے کی مانند اُس کے حُسن کو وہ آنکھیں نہیں دیکھ سکتیں جو مادّی دُنیا کی متلاشی ہیں۔ اس کی تمام ملکیت اور دولت وہ آگ ہے جو اس کے سینے میں مُسلسل روشن ہے، جلتی ہے اور جلاتی ہے۔ یہ وہ آتش گیر شے ہے جس کا شعلہ اندرونی دنیا کو منوّر کر دیتا ہے اور جس کی رنگین شعاعیں صِرف وہی آنکھیں دیکھ سکتی ہیں جن کے خوابوں کا مندر ارضی دنیا سے بلند ہو کر آسمانی فضاؤں میں معلق ہو جاتا ہے۔ اور یہ کبھی نہ بُجھنے والا شعلہ ہمیشہ بھڑکتا رہتا ہے کیونکہ چشمۂ حیات کا آب اسے سیراب کرتا ہے۔ اس شعلۂ دائم کے مالک کا مسکن ایک ایسا حجرہ ہے جس کا کوئی دریچہ اس دنیا کی طرف نہیں کھلتا۔ اگرچہ یہ مسکن بظاہر خالی ہے لیکن درحقیقت اس میں وہ تمام خزانے مستور ہیں جو قدیم بادشاہوں، شاید خسرو اور اردشیر کے قبضے میں تھے، بلکہ وہ تو جامِ جم اور آئینہ سکندری پر بھی قابض ہے اور اس طرح ہم دونوں ــــ شعلۂ دل اور سلطان ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے میں سما گئے ہیں، گویا ہماری روحیں پگھلا کر ایک دوسرے میں جذب کر دی گئی ہیں۔ اگر ہمارے جسموں کو جلا دیا جائے تو ہم دونوں کی جلی ہوئی راکھ کو محبّت کی سوزش سر دیوتاؤں کی طرح بقائے دوام حاصل ہو جائے گی!!"

جب بادشاہ یہ تمام باتیں سُن چکا تو اس پر ایک وجدانی کیفیت طاری ہو گئی۔ دفعتاً وہ اس مقدّس ملکۂ محبّت کے قدموں کی طرف سرنگوں ہو کر پرستش کے والہانہ جذبات میں گم ہو گیا۔ وہ سب کچھ بھول چکا تھا..... وقت سے بے خبر اور مقام سے بیگانہ۔ گویا اس کا دل اس دیوی کے سامنے ایک عود دان تھا جس میں سے تقدّس اور پاکیزگی کے ارفع جذبات دھوئیں کی شکل میں نمودار ہو رہے تھے۔

اپنے جذبات پر بمشکل قابو پا کر اس نے یہ الفاظ کہے "اے میرے خیال و خواب کی عارضی دُلہن! اُٹھ اور اپنی محبوب روح کو تسکین دے اور آنکھوں کو خشک کر! کون ایسا سودائی انسان ہو گا جو سلطان کی محبّت میں رخنہ اندازی کرے۔ میں تجھے تمام پابندیوں سے آزاد کر کے اپنے تمام حقوق سے دستبردار ہوتا ہوں...... اور آج سے ــــ تو میری بیٹی ہے ــــ تو میری زندگی میں شاہزادی ہو گی اور موت کے بعد تاج و تخت کی وارث!!...... لے اُٹھ بیٹھ جانِ پدر! اور فوراً اس کے پاس چلی جا جو تجھے دیکھ کر خیال کرے گا کہ تو موت کے تاریک غاروں سے واپس آئی ہے"!

اور جب وہ یہ کہہ چکا تو اُس نے آہستہ سے اُس دیوی کا ــــ جو چند لمحات کے لئے اس کی دلہن تھی ــــ ہاتھ نہایت نرمی سے پکڑا اور اُس کو لے کر باغ کی پوشیدہ محراب کی طرف چلا۔ جب

اُس نے دروازہ کھول دیا کہ وہ وہاں سے رخصت ہو جائے تو حسین ملکہ نے جُھک کر اس کے ہاتھ پر گرم جوشی سے بوسہ دیا —— اس کی آنکھوں میں آنسو جھلک رہے تھے! اور بادشاہ نے دوزانو ہو کر اس کے لباسِ عروسی کے سنجاف کو چوما.......

آدھی رات گزرنے کے بعد جب نازک اندام حسینہ اس حجرے پر پہنچی جس کا دروازہ اس قدر تنگ تھا کہ کوئی آسمانی حور ہی داخل ہو سکتی ہو تو اس نے اندر سے سسکیوں کی آواز سُنی —— یہ سسکیاں اُس شخص کی تھیں جو اس طرح بے حال ہو رہا تھا، جیسے کوئی اپنے عمر بھر کے ساتھی کے بچھڑنے پر ماتم کر رہا ہو۔

اُس نے محراب پر دستک دی۔ اندر سے آواز آئی۔ "کون ہو؟"

"میں ہوں" وہ آہستہ سے بولی

.........ایک طویل خاموشی اور ——

دروازہ نہیں کھلا۔

ملکہ کے مرمریں چہرے پر خیالات کے دھند لکے نے نقاب ڈال دی۔ بغیر کچھ مُنہ سے کہے —— اس نے آہِ سرد بھی نہیں کھینچی —— وہ زمین پر لیٹ گئی —— دروازے کے قریب۔

تمام دن اور دوسری رات وہ اسی طرح وہاں پڑی رہی —— تصور کی نقاب میں ملفوف —— اور اس طرح وہ دل میں فلسفۂ محبت پر غور کرتی رہی، جس کے لئے ضروری ہے کہ عشق کے بندے سلطان کی خدمت میں حاضر ہونے سے پیشتر مکمل طور سے اپنے آپ میں فنا ہو جائیں۔

اس خیال کے آتے ہی ایک دفعہ اور اُس نے دروازہ کھٹکھٹانے کی ہمت کی مگر پھر وہ اپنے آپ کو مصفا کرنے کی غرض سے دریا کی طرف چلدی۔ تھوڑی دیر بعد کامل اعتقاد کے ساتھ واپس آئی اور دروازے پر دستک دی۔

اندر سے آواز آئی —— "کون ہے؟"

اور اس دفعہ شعلۂ دل نے کہا: یہ "تُو" ہے......"

دروازہ خود بخود کھُل گیا۔

اس کے بعد کیا ہوا —— ؟ یہ سب عشق و محبت اور حُسن و جمال کے رازہائے پنہاں ہیں! انکا انکشاف مجھ سے نہ کروایئے۔

ساقی (مارچ ۱۹۳۵ء) —————— نامعلوم

چار چاند

ایک شام کو ——————

امیرِ سمرقند کے شاہی محل کے پائیں باغ میں کوئی کہہ رہا تھا۔ "پیاری یاسمین تمہاری نیلی آنکھوں میں وہ کشش ہے کہ جی چاہتا ہے ہر وقت ان کو دیکھا کروں۔"

اس نے کسی قدر بگڑ کر اور اپنا پاؤں فرش پر مار کر کہا۔ "بس تمھیں تو یہی خالی خولی باتیں بنانی آتی ہیں۔"

"یہ تو اظہارِ تعشق کے رنگین الفاظ ہیں —— اے سلطنتِ قلب کی ملکہ۔"

"پھر وہی منہ دیکھے کی باتیں؟ کیوں محمود! اگر تم کو مجھ سے محبت ہوتی جتنی مجھے تم سے ہے تو تم شادی ہی نہ کر لیتے —— اللہ! مجھے ایسے الفاظ کہتے بھی تو شرم آتی ہے۔"

"شادی .... یہ کیسے ممکن ہے؟"

"کیوں؟ .... ممکن کیوں نہیں؟"

"ہمارے والدین، ہمارے قبیلے والے ..... ایک دوسرے کے دشمن ہیں ..... سینکڑوں برس سے ہوتے آئے ہیں اور تم ہمارے محل میں یرغمال کی حیثیت سے آئی ہوئی ہو ....."

"اور بھی بے معنی باتیں!"

"نہیں یہ تو حقیقت ہے۔ میں مجبور ہوں یاسمین! میرا باپ ..... !"

"ہشت! مردوں میں عقل نہیں ہوتی۔ اگر میں مرد ہوتی ——"

"تو تم کیا کرتیں؟"

"کچھ نہ کچھ کرتی۔" اور جونہی محمود قریب آیا وہ تنک کر بولی۔ "نہیں نہیں، تم مجھے اپنے سینے سے مت لگاؤ۔ کیونکہ ہمارے آباد اجداد تو ایک دوسرے کے دشمن ہیں نا ..... ؟"

اور یہ کہہ کر وہ پھرتی سے قصرِ شاہی میں داخل ہو گئی۔

(۲)

شام کا گجر بجنے کے تھوڑی دیر بعد کسی نے مغربی دروازے پر دستک دی اور محافظ اپنی پگڑیاں سنبھال کر اس طرف چلے، ایک بولا "شاید کوئی آیا ہے؟"

دوسرا ہنس کر بولا۔ "کوئی کیا، یہ دروازہ عام تھوڑی ہے۔ یہاں سے بیرونجات کے لوگ ہی آ سکتے ہیں۔"

"شاید کوئی خراج لایا ہو۔" تیسرے نے کہا۔

"کہیں نواب اباکان نے تو جنگ کی نہیں ٹھان لی۔" ان میں سے ایک بولا۔

"نہیں نہیں" دوسرا فوراً بات کاٹ کر بولا "پچھلے سال تو ہم اس کے دانت کھٹے کر چکے ہیں اور ہاں اس کی اکلوتی لڑکی جو ہمارے یہاں یرغمال کی حیثیت سے ہے۔ اس لئے ان کی طرف سے کوئی نہیں آسکتا۔"

دروازے پر کسی نے پھر دستک دی اور بہت زور سے چیخ کر کہا "جلدی کھولو—— اے افیمچیو!"
دروازہ بڑی جدوجہد کے بعد کھولا گیا لیکن—— وہ لوگ مایوس ہو گئے۔ متعجب بلکہ خفا بھی کیونکہ—— نہ تو کوئی وہاں قافلہ تھا نہ کوئی اور شان و شوکت، بلکہ ایک تنہا شخص، ایک منگولی ٹٹو پر۔ وہ پورا مرد بھی نہیں تھا بلکہ بالکل نوجوان تھا اور اس کی مسیں بھی ابھی نہیں بھیگی تھیں۔ لیکن اس کی ناک بے حد نمایاں تھی، لمبی، بہت لمبی۔ وہ اندر گھسنے لگا۔ مگر محافظوں کا کپتان آگے بڑھا اور اُسے روک کر بولا۔ "تم جیسے لوگوں کو مشرقی دروازے سے آنا چاہیے۔ یہ بڑے لوگوں کے لیے وقف ہے۔"
"ہُوں؟" وہ اُس کو گھور کر بولا۔ "کیا کہتا ہے میں بڑا آدمی نہیں۔"
"تمھارے پھٹے ہوئے کپڑے۔"
"لیکن تمھیں میری نسل کا کیا علم؟"
"ہاں تو بتاؤ نا؟ تمھارا نام کیا ہے؟"
"علی—— !"
"واہ! مسلمانوں میں علی کون نہیں ہوتا——؟ اپنے قبیلے کے کسی بڑے آدمی کا نام بتاؤ۔ اور تمھارا پیشہ کیا ہے؟"
"تمام بڑے آدمی میرے رشتے دار ہیں اور پیشہ شمشیر زنی۔"
کپتان منہ چڑھا کر بولا۔ "تمھیں اس قسم کی فضول باتیں کرتے ڈر نہیں لگتا؟"
"یاد رکھو!" وہ تلوار کے قبضے پر ہاتھ رکھ کر کہنے لگا "جو شخص مجھے مشتعل کرتا ہے میں اُسے زندہ نہیں چھوڑتا۔"

بہت زور سے ایک قہقہہ پڑا اور اتنی دیر میں بہت سے لوگ جمع ہو گئے مجمع میں سے دو شخص آگے بڑھے ایک کا لباس سُرخ اور دوسرے کا سیاہ تھا۔
نوجوان اُن کی طرف پلٹ کر بولا۔ "کون ہنسا تھا، اور کس پر؟"
سُرخ پوش نے فوراً جواب دیا—— "میں—— تم پر——"
"جانتے ہو کیا انجام ہو گا؟"
"ہا ہا ہا!"
"میری تلوار پیاسی ہے۔"
"ابھی تو تمھارے لب ہی پیاسے ہیں—— ماں کے دودھ کے! ارے بچے!"
"اچھا پورے مرد۔" یہ کہ کر وہ اس کے پنجوں پر چڑھ گیا اور سُرخ پوش اس تکلیف سے بلبلا اُٹھا۔
"دیوانہ مت بن، ورنہ یاد رکھیو!"
"کیا؟"
"تلوار اور تو—— !"
"اوہو—— تم؟"
سُرخ پوش نے اپنے غصّے پر قابو پا کر آہستہ سے کہا۔ "میں لونڈوں سے کیا لڑوں——؟"
"واہ کیا معقول بات ہے۔"
"جب تو پیدا بھی نہیں ہوا تھا میں تمام قبیلے میں سب سے زیادہ جنگجو مانا جاتا تھا۔" یہ کہ کر سُرخ پوش ہنسا لیکن دفعتۃً سنجیدہ بن کر وہ اس کے قریب آیا اور آہستہ سے کہنے لگا۔ "یہ طوطے کی چونچ جیسی ناک میں نے کہیں دیکھی ہے...... ہاں ایک دفعہ جب میں قیدیوں میں............"

دفعتاً علی نے تلوار سونت لی اور چیخ کر بولا ——

"بہادر صاحب اپنے آپ کو بچائیے"۔

سُرخ پوش نے سیاہ پوش کی طرف دیکھا، اور جب سیاہ پوش نے آنکھ سے کچھ اشارہ کیا تو وہ بھی تلوار کھینچ کر مقابلے پر آگیا۔ وہ تلوار ہوا میں پھراتے ہوئے بولا۔ "دوستو، ذرا تماشا دیکھو، چھوٹا بڑوں کے مُنہ آیا ہے۔ مگر خیر میں اس کو زیادہ گزند نہیں پہنچاؤں گا"۔

سُرخ پوش ابھی مذاق ہی کر رہا تھا کہ اس کا چہرہ لال ہوگیا اور وہ غصّے میں آکر اس پر پل پڑا، لیکن چند ہی لمحات بعد اس نے محسوس کر لیا کہ وہ "بچّہ" شمشیر زنی میں اس "مرد" سے کہیں زیادہ ماہر ہے۔ آناً فاناً علی نے سُرخ پوش کے سینے میں تلوار بھونک دی۔ سُرخ پوش لڑکھڑاتا ہوا گرا اور سیاہ پوش کو اپنے پاس دیکھ کر کہنے لگا "میرے بیوی بچوں کا خیال رکھنا" اور دیکھتے ہی دیکھتے چل بسا۔

سیاہ پوش اب آگے بڑھا اور بولا۔ "لو اب تم جلدی سے اپنے ٹٹو پر بھاگ جاؤ ——"

"کیوں —— ؟"

"کیونکہ مقتول......"

"ایمانداری کے مقابلے ہی میں تو......"

"بیشک لیکن وہ امیر سمرقند کا بہترین شمشیر زن تھا، جس پر سونے چاندی اور جواہرات کی بارش کی جاتی تھی"۔

"ہوا کرے"۔

"لیکن —— !"

"کچھ ہرج نہیں، امیر کے لئے میں اس سے بہتر شمشیر زن ثابت ہوں گا۔ میری تلوار امیر کی خدمت کو حاضر ہے"۔

دفعتاً سیاہ پوش نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "اچھا —— اس نے تمھیں منظور کر لیا ——" اور یہ کہہ کر اُس نے اپنی پگڑی اُتار دی۔ لوگ اسے دیکھتے ہی ادب سے جُھک گئے۔ ان کو زیادہ تعجب نہیں ہوا، کیونکہ وہ جانتے تھے کہ امیر شام کو بھیس بدل کر گشت کیا کرتا تھا تاکہ سپاہیوں، افسروں، تاجروں، غریبوں۔ غرض کہ اپنی تمام رعایا کے حالات سے باخبر رہے۔

اس نے علی کو اشارہ کیا اور اپنے ساتھ لے گیا۔

(۳)

اس طرح علی، معروف جہاں، امیر سمرقند کا بہادر شمشیر زن مقرر ہوگیا اور لوگ اس کا احترام کرنے لگے۔ اس کو محل اور شہر میں آنے جانے کی مکمل آزادی تھی اور تھوڑے عرصے بعد اس کی یاسمین بنت شمس قاسم نواب ابا کان سے ملاقات ہوگئی۔

یاسمین نے اس کے گلے میں فرطِ محبت سے باہیں ڈال دیں اور بے قابو ہو کر بولی ——

"بھائی —— !"

"ہش" وہ جلدی سے بولا۔ "تم یہاں مجھے اجنبی سمجھو"۔

پھر کانا پھوسی میں ایک دوسرے نے اپنے اپنے خیالات سُنائے۔ یاسمین کہنے لگی —— "اور میں تم کو ہر وقت یاد کرتی تھی کہ میرا نوجوان بھائی ایک دن... خیر، تم کیا جانو ایک بہن اپنے بھائی سے ایسی جگہ مل کر کس قدر خوش ہوتی ہے مگر ہاں، تم یہاں خطرے میں بھی تو ہو —— کہیں خدا نہ خواستہ تمھیں کوئی پہچان نہ لے"۔

"واہ! اسلام بہادر لڑکوں سے بھرا پڑا ہے، ہر مسلمان کا بچہ اتنا ہی بہادر اور ایسا ہی شمشیر زن ہونا چاہئے۔"

وہ مسکرا کر بولی۔" میرا مطلب ہے کہ تمھاری ناک ...."

"ارے" وہ اس کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ "ہاں وہ سرخ پوش بہادر تھا نا۔ وہ مجھے پہچان گیا تھا مگر میں نے فوراً ہی اس کا خاتمہ کر دیا۔ اب میں اس کی جگہ ہوں اور یہی ہمارے لئے مفید ہے۔"

"اور وہ پھول تو بہت ہی خوش نما معلوم ہوتے ہوں گے۔ جو فارس سے آئے تھے۔" یاسمین دوسری باتیں کرنے لگی۔

سمرقندی سرحد سے اُدھر جاکر اباکان والوں کو تنگ کرتے تھے۔ کبھی ڈاکہ ڈال دیا۔ کبھی مویشی چرا لئے۔ کبھی عورتیں بھگا لائے۔ کبھی ہٹ دھرمی سے انکی چراگاہوں پر قبضہ کر لیا۔ نواب شمس قاسم نے معروف جہاں کی توجہ اس طرف منعطف کرائی لیکن اس نے اس کی کوئی خاص پروا نہیں کی۔ جب حالات ناقابلِ برداشت ہو گئے تو جنگ چھڑ گئی مگر زبردست کا ٹھینگا سر پر، مصالحت کرنی پڑی اور وہ بھی اس طرح کہ والیٔ سمرقند نے بیچارے شمس قاسم کی لڑکی کو یرغمال کی حیثیت سے اپنے یہاں بلوا لیا۔ لیکن کچھ عرصے کے بعد علی جوانی کے جوش میں انتقام کو فرض سمجھنے لگا اور یہ طے پایا کہ پہلے یاسمین کو آزاد کر کے لایا جائے۔

علی نے باتوں کا رُخ بدل کر کہا ——"تمھیں لے جانا کوئی مشکل بھی نہیں۔ میں امیر کا خاص ملازم ہوں۔ اس لئے مجھے ہر جگہ جانے کی آزادی ہے۔ اب بہت جلد ہم تم اپنے وطن چلے جائیں گے ——"

وہ خوب ہنسا لیکن بہن کو خاموش دیکھ کر وہ اس کی طرف دیکھنے لگا۔

"میں سمرقند نہیں چھوڑ سکتی۔"

"ہیں —— ؟"

وہ خاموش تھی، علی نے پھر کہا۔" کیوں نہیں؟"

وہ چپکی رہی، علی نے اپنے آپ ہی کہا ——" کہیں کوئی مرد —— سمرقندی ؟"

"ہاں ہاں، اس کو میں چاہتی ہوں اور وہ مجھے۔"

"ہرگز نہیں، —— ناممکن —— ایک قابلِ نفریں ہستی۔"

"تمھارے لئے ہوگا —— میرے لئے نہیں، واللہ اباکان کا کوئی شخص اس کی طرف ٹیڑھی آنکھ سے بھی نہیں دیکھ سکتا۔"

"کیا کہتی ہے، کیا تو اسے مجھ سے زیادہ چاہتی ہے؟ —— اپنے باپ سے بھی۔ اپنی ماں سے بھی؟"

"کس قدر فضول سوال ہے۔"

"بالکل ٹھیک ہے۔ کیا تجھے وہ اپنے خون اور گوشت سے بھی زیادہ پیارا ہے؟ ——"

"میں کیا جواب دوں —— تم مردانہ ضد سے کام لے رہے ہو۔"

"دغاباز —— ! —— بے غیرت!"

وہ رونے لگی۔ اور اسی وقت ایک شخص جو باغ میں چہل قدمی کر رہا تھا اس طرف سے گزرا۔ محمود کبیر اس کا نام تھا، شہزادہ سمرقند۔ اس نے اس

کو اپنی آغوش میں لے لیا اور علی کی طرف تیوری چڑھا کر بولا ــــ "کیا تم نے انھیں کچھ کہا ہے ؟"

اُس نے جواب کے بدلے اُلٹا سوال کیا ــــ "کیا تم اس کے محب ہو ؟"

"ہاں! لیکن تمھیں کیا ؟"

"میری توہین ــــ اور تمھارے لئے موت!

آہ!" وہ دفعتاً بولا "یہ میری بہن ہے، او نالائق ــ!

علی نے اپنی تلوار کھینچ لی اور محمود بھی مقابلے پر آ ڈٹا۔ تلواریں ایک دوسرے سے ٹکرا کر خوفناک آوازیں پیدا کر رہی تھیں اور ــــ یاسمین ایک طرف کھڑی کانپ رہی تھی۔

اسی اثنا میں امیر سمرقند اپنے گشت پر جانے کے لئے اُدھر سے گذرا اور بیٹے کی موت کے خیال سے اُس کے دل و دماغ کو تھرّا دیا لیکن جونہی محمود نے اپنے باپ کو دیکھا وہ تلوار چھوڑ کر علی کے سامنے جُھک گیا۔

علی ششدر رہ گیا۔

"ہم یہاں کوئی تین منٹ سے تلوار بازی میں مصروف تھے، آپ کے شمشیر زن نے مجھے بہت سے ہاتھ سکھائے" محمود نے بصد ادب اپنے باپ سے کہا۔

امیر خوشی سے پھولا نہ سمایا۔ اس نے علی کو سینے سے لگا لیا اور بولا "تمھیں شاہی خلعت، بہترین گھوڑا اور وہ جواہرات انعام میں دیئے جائیں گے جو شمس قاسم سے لوٹے گئے تھے"۔

(۴)

ایک سہ پہر کو علی محمود کے پاس گیا اور جُھک کر سلام کیا۔

"آپ سے ایک بات کہنی ہے ــــ میرا سر دروازے پر کاٹ کر لٹکا دیا گیا ہوتا..... آپ نے میری جان بچائی"۔

"واہ! تم نے میری زندگی بچائی ہے"۔

"کیسے ؟"

"تم میرے باپ کو نہیں جانتے۔ ان کا غصہ الاماں! اگر تم اسے بتا دیتے کہ مجھے یاسمین ــــ نواب اباکان کی بیٹی سے محبت ہے تو..... اوہ اس خیال ہی سے میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں"۔

ایک دوسرے کی آنکھیں ملیں، وہ مسکرائے اور ایک دوسرے نے مصافحے کے بعد معانقہ کیا۔ محمود بولا ــــ "بڑے افسوس کی بات ہے کہ ہم دونوں آپس میں دشمن ہوں"۔

"بیشک! اور تم کو میری بہن سے محبت ہے"۔ علی نے کہا۔

"اُس سے زیادہ حسین تو زریں چاند یا نیلے آسمان پر بھی کوئی نہ ہوگا"۔

"کیسی بے معنی باتیں ہیں"۔ علی نے الفاظ جما جما کر کہے ــــ "وہ تو صرف ایک عورت ہے"۔

"کیا صرف ایک عورت..... وہ ؟"

"اور کیا۔ مجھے تو آج تک ایک بھی ایسی عورت نہیں ملی ــــ جو میرے دل میں جگہ......."

"تم عورتوں کو نہیں جانتے"۔

"میں خوب جانتا ہوں ــــ سب ایک سی ہوتی ہیں۔ بیوقوف غیر مستقل مزاج، کم زور....."

دفعتہً کہیں سے آواز آئی ـــــ "ذرا اس عقلمند نوجوان کی باتیں سُننا..... اس عقلمند نے زندگی اور زندگی کے رازوں کا اس طرح انکشاف کیا ہے جیسے ایک بندر ناریل توڑتا ہے "

محمود نے پلٹ کر دیکھا ـــ "طوفہ!" اس نے پکارا۔ "میری بہن!"

طوفہ محمود کی طرف متوجہ نہیں ہوئی اور سیدھی علی کے پاس آگئی۔ "ہاں ذرا اب کے تو کہو، جو کچھ تم نے میرے بھائی سے کہا تھا" وہ ذرا خفگی سے بولی۔ "آہ" اور پھر نقاب اُلٹ کر۔ "میری طرف غور سے دیکھو..... پہچان گئے۔ ہاں اب کہو، ہم سب بیوقوف ہیں، غیر مستقل مزاج، سب کی سب؟"

"ان.... ان...." علی گھبرا کر بولا۔ "شاید.... سب نہیں...."

"اہا، سب نہیں، تو پھر وہ کون ہوئی ـــ جو اس سے مستثنیٰ ہے؟ ـ غالباً وہ عورت جو تمھارے دل پر قبضہ کرے........ ناک تو بڑی لمبی رکھتے ہو۔ آخر میں بھی تو دیکھوں وہ کون سی عورت ہوگی ـــ جس کو یہ اعزاز بخشا جائے گا۔"

علی حیرت زدہ رہ گیا۔ اس نے اس کو محبت سے دیکھا۔ خوبصورت آنکھیں، بلوری پیشانی، یاقوتی لب، سیب جیسے رُخسار ـــ دفعتہً ایک عجیب وغریب بات اس نے کہی یعنی محمود کے وہی الفاظ دہرا دیے "تم سے زیادہ حسین کوئی زریں چاند اور نیلے آسمان پر بھی کوئی ہوگا" اور پھر اس نے محسوس کر لیا کہ یہ الفاظ بیوقوفی کے نہیں بلکہ گہرے اور سنجیدہ ہیں۔ وہ جانتا تھا کہ وہ اور طوفہ ایک پرند کے دو بازو ہیں اور اگر ان میں سے ایک معطل ہو جائے تو پرندہ دوسرے کے بل پر پرواز نہیں کر سکتا اور جب طوفہ نے دوبارہ پوچھا۔ "میں بھی تو دیکھوں یہ خوش قسمت لڑکی کون ہوگی؟" تو اس نے آہستہ سے کہا" وہ بالکل تمھاری جیسی ہے... ایسی ہی رنگت اور ایسی ہی حسین اور جس کے متعلق ہماری کتاب مقدس کہتی ہے کہ اس کی قیمت لعل و یاقوت سے بھی زیادہ ہے "

اور محمود کا کچھ خیال کئے بغیر جو اس کی طرف مسکراتا ہوا دیکھ رہا تھا۔ اس نے طوفہ کو اپنی آغوش میں لے لیا۔

طوفہ گھبرا کر بولی ـــ "آخر کس عوض میں....؟"

اس نے اطمینان سے جواب دیا۔ "اپنے ہی عوض میں...... تمھاری قیمت میری زندگی ہے۔"

اسی رات کو جب کہ باغ میں پھول خوب کھل رہے تھے آسمان محبت کے چار چاند اپنی الفت پاس ضیائے مقدس، فضائے بسیط پر پھیلا رہے تھے۔ وہ چاروں مسرور تھے۔ بھائی اور بہن، بہن اور بھائی۔

اور کیوں نہ ہوتے جب کہ شاندار اور سنہرا وقت ان پر مسرت کے سچے موتی قربان کر رہا تھا ـــ لیکن تھوڑی ہی دیر بعد وہ ملول ہو گئے ـــ مستقبل کے خیال سے۔

انھوں نے سوچا "پھر وہی باتیں ہوں گی۔ دشمنی کی آگ۔ امیر اور نواب کو ایک دوسرے سے جُدا کرنے والی، اور کوئی بھی ایسا موقع نہ نکلے گا جبکہ

امن و صلح کے بعد آپس میں شادیاں ہو جائیں ۔"

"مستقبل میں کیا ہوگا؟"

"لڑائی ـــــ جھگڑا ـــ جنگ ـــــ" یاسمین نے کہا۔

"اور کیا" طوفہ نے بھی کہا ـــــ "قتلِ عام منافرت ۔"

"مرد ہی نفرت کریں گے۔" یاسمین بولی ـــ "عورتیں نہیں ۔"

"یہ تو ہے ہی، عورتیں نفرت نہیں کیا کرتیں ـــ یہ تو مردوں ہی کا کام ہے۔ کیونکہ وہ ضدّی ہوتے ہیں۔ سرکش ـــــ"

"مردوں میں عقل نہیں ہوتی ۔"

"بالکل نہیں" دونوں لڑکیوں نے آپس ہی آپس میں اشارے کر لئے۔

" علی نے طنز سے کہا" تم سمجھتی ہو ـــــ کہ عورتوں میں زیادہ عقل ہوتی ہے ـــــ؟"

"بہت زیادہ!"

"اچھا اگر ایسی ہی عقلمند ہو تو تم دونوں کیا کرو اگر......"

"ہاں!" محمود کو بھی طیش آگیا۔ "تم کیا کر سکو گی؟ ـــــ ہمارے والدین کی سختی اور دشمنی کے مقابلے میں؟"

ہم اپنے والدین کی بیجا سختی اور ظلم پر ـــــ اپنی محبتوں اور مسرتوں کو قربان نہیں کریں گے۔"

"اگر ہم مرد ہوتیں تو اپنی عورتوں کو گھوڑوں پر بٹھا کر کہیں چلی جاتیں۔"

"بس!" علی بات کاٹ کر بولا۔ "تم ٹھیک کہتی ہو" محمود کہنے لگا۔ "بس تو آج رات کو ہم نکل جائیں گے۔"

"کہاں"؟ علی نے پوچھا۔

"بہت دور ـــــ ایک ویرانے میں، کوہِ طوفان پر....." محمود نے ایک طرف اشارہ کر کے کہا۔ "میں اس جگہ سے خوب واقف ہوں۔"

(۵)

تھوڑے دنوں بعد امیر سمرقند اور نواب اباکان کو پیغامات ملے جنھیں سُن کر دونوں کو طیش آگیا۔

ایک غصّے سے بیتاب ہو کر بولا۔ "تمام سرداروں کو جمع کر لو...... یہ بدمعاش کا لڑکا میری بیٹی کو لیکر بھاگ گیا۔"

اور دوسرے نے طیش میں کہا۔ "قسم ہے خُدا کی اب سہار نہیں رہی۔ اس کا بیٹا میری آنکھوں کی ٹھنڈک کو مجھ سے جُدا کر کے لے گیا۔"

دونوں والیانِ سلطنت جوش میں بھرے ہوئے اپنے اپنے لشکروں کے ساتھ کوہِ طوفان کی طرف بڑھے اور دامن تک پہنچنے پر ایک دوسرے کے سامنے آگئے۔ گالیاں اور کوسنے شروع ہوئے اور قریب تھا کہ جنگ چھڑ جائے کہ کوہ طوفان کے پُرانے قلعے میں سے کسی نے سر نکال کر صاف اور بلند آواز میں کہا۔

"خبردار! ایک کو مارو گے تو دوسرا بھی مر جائیگا کیونکہ ہم چاروں یہاں ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے سے متحد ہو گئے ہیں ـــــ زندگی ہی میں نہیں بلکہ زندگی کے بعد تک ـــــ"

امیر پر بڑا اثر ہوا اور نواب نے سوچا اب لڑائی

جھگڑا کس کام کا۔ ہم تو قبر میں پاؤں لٹکائے ہوئے بیٹھے ہیں ۔۔۔۔ اب تو ان جوانوں کا زمانہ ہے جب یہی خوش ہیں تو ہم کیوں ان کی مسرتوں میں مخل ہوں

امیر نواب کو دیکھ کر مسکرایا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں دوستانے اور آزادی کے عہد و پیمان ہو گئے۔

کسی اباکانی کپتان نے کہا ۔۔۔ "ان چاروں کو سزا ملنی چاہیئے۔"

امیر سمرقند بھی بولا۔ "بڑے گستاخ بچے ہیں۔"

نواب نے کہا۔ "ہاں کس قسم کی سزا دیں۔؟"

امیر نے جواب دیا۔ "ان کو شادی کی زنجیروں میں جکڑ دینا چاہیئے۔"

"یہ بالکل ٹھیک ہے۔" اباکان کے نواب نے متفق ہو کر کہا۔

"دوہری شادی ہوگی ۔۔۔ بہو بھی لاؤ گے اور داماد بھی ۔۔۔"

"ہاں ہاں ۔۔۔ بڑی خوش قسمتی ہے۔"

کوہ طوفان کے بلند بوسیدہ اور پرانے قلعے میں سے چار چاند جلوہ افروز ہوئے اور سب لوگوں نے نعرہ ہائے تحسین بلند کر کے ۔۔۔ ان کو اپنے حلقے میں لے لیا ۔۔۔ جیسے ستارے چاند کے گرد جمع ہو جاتے ہیں۔

محمود نے کہنی مار کر کہا۔ "ایک بات تو بتاؤ ۔۔۔ عورتیں زیادہ عقل مند ہوتی ہیں نا ۔۔۔"

"اور کیا" ۔۔۔ علی نے عورتوں پر محبت بھری نگاہیں جما کر کہا۔ "عورتوں میں مردوں سے زیادہ عقل ہوتی ہے۔"

عالمگیر (نومبر ۳۵ء) ۔۔۔ احمد عبداللہ

دوشیزۂ سلوم

پنگھٹ پر بھیڑ لگی ہوئی تھی اور گاؤں کی عورتیں پانی بھرتے ہوئے ایک سرگرم افواہ کے متعلق گفتگو کر رہی تھیں۔

ایک عورت نے مٹکا کنویں کی منڈیر پر رکھتے ہوئے کہا۔ "کیا یہ ممکن ہے کہ کوئی شخص ایک کسان کی لڑکی کے لئے دو سو پونڈ پیش کرے۔"

دوسری عورت نے جواب دیا۔ "ہاں ہاں۔ لطیفہ کی پھوپی اُمّ احمد نے خود مجھ سے کہا تھا کہ شیخ حسین کے لڑکے ابراہیم نے شادی کے عوض دو سو پونڈ پیش کئے ہیں۔"

عائشہ اُمّ حمید ہاتھ جھٹک کر بولی۔ "نہیں بی۔ اس میں شک نہیں کہ لطیفہ خوبصورت ہے لیکن اتنے روپے میں تو شہر کی پڑھی لکھی لڑکی سے شادی ہو سکتی ہے۔ پھر وہ اس قدر دولت ایک دہقانی لڑکی کے لئے کیوں ضائع کر رہا ہے۔ ایسی لڑکیاں تو چالیس سے کم ہی میں مل جاتی ہیں۔"

"ٹھیک ہے، لیکن یہ بھی تو سب کو معلوم ہے کہ تمام فلسطین میں اس سے زیادہ خوبصورت لڑکی کوئی نہیں۔" پہلی عورت نے جواب دیا۔ "سرزمینِ سلوم میں کسی لڑکی کے بال بھی اس جیسے نہیں۔ اور نہ کسی کی آنکھیں ایسی گہری اور سیاہ ہیں۔ اور ہاں کوئی اس کی ملائم جلد کا بھی مقابلہ نہیں کر سکتا —— لو وہ آ ہی رہی ہے۔"

بل کھائے ہوئے راستے پر، سیاہ مٹکا لئے ایک پندرہ سالہ حسینہ گاؤں سے آ رہی تھی۔ اس کا قد عربی دوشیزہ کی طرح لانبا تھا اور چہرے سے جولانی ظاہر ہو رہی تھی۔ اس کی دراز بھوری زلفیں اوڑھنی سے ڈھکی ہوئی تھیں اور اس کے خوبصورت مکھڑے پر شگفتگی و تازگی کے آثار نمایاں تھے۔ جب وہ کنویں کے قریب آئی تو کم عمر لڑکیوں نے اس پر طنزیہ فقرے کسنے شروع کر دئے۔ "دو سو انگریزی سکے!" ایک نے سر مٹکاتے ہوئے کہا۔ "اس کی ٹانگیں سونے کی ہوں گی یا کمر ہیرے کی! جب ہی تو کوئی شخص اتنی بڑی رقم اس کے لئے پیش کر رہا ہے۔"

"واہ!" دوسری ناک چڑھا کر بولی۔ "کیا تم نے نہیں سنا کہ مرد دیوانے ہوتے ہیں اور یہ شیخ کا لڑکا ان سب سے بڑھا ہوا ہوگا۔"

"مگر اس کو اس سے فائدہ ہی کیا پہنچے گا؟" ایک عورت نے تضحیک کرتے ہوئے کہا۔ "اسے صابن کا زبردست خرچ برداشت کرنا پڑے گا۔ یہ تو دن میں تین مرتبہ منہ دھوتی ہے!" وہ سب عورتوں کی طرف دیکھ کر بولی۔ "سنا؟ تین مرتبہ!"

"کیوں اس کے سر ہو رہی ہو؟" اُمّ رشید نے چیخ کر کہا۔ "اس بے چاری کا کیا قصور ہے، اس کا

باپ جو چاہے وصول کرے۔ بہر حال وہ دبی دبائی لڑکی ہے۔ تمہاری طرح عاشق نہیں۔ آؤ لطیفہ! میں تمہارا مٹکا بھر دوں، تم ان چھوکریوں کا کچھ خیال نہ کرنا۔ چلو میں بھی تمہارے ساتھ گاؤں چلتی ہوں۔"

اُسی شام کو جب لطیفہ اپنے باپ کی بکریوں کو چرا کر غار کی طرف واپس آرہی تھی اس کا نوجوان چچا زاد بھائی تھوڑے فاصلے پر نمودار ہوا اور جب وہ اندر چلی گئی تو اُس نے گھٹی ہوئی آواز میں اُسے پکارا۔

کوئی جواب نہ ملنے پر اُس نے دوبارہ آواز دی۔ "مجھے معلوم ہے کہ تم اندر ہو لطیفہ! کیونکہ میں عصر کی نماز کے بعد سے تمہارا انتظار کر رہا ہوں اور میں نے تمہیں خود اندر جاتے ہوئے دیکھ لیا ہے۔"

یہ دیکھ کر کہ وہ نہیں ٹلے گا، لطیفہ نے جواب دیا "کیا ہے موسیٰ؟"

"چند لمحات کے لئے بات کرنا چاہتا ہوں۔" یہ کہتے ہوئے وہ غار میں داخل ہو گیا۔

"لطیفہ! کیا یہ سچ ہے کہ تمہاری شادی مشرقی جروان کے شیخ کے لڑکے سے قرار پا گئی ہے؟"

"یہ تم میرے والد سے دریافت کرو۔" اس نے جواب دیا۔

"پوچھنے سے کیا فائدہ؟" موسیٰ نے خفگی آمیز لہجے میں کہا۔ "تم جانتی ہو۔ میں جانتا ہوں اور تمام گاؤں واقف ہے کہ شادی کے عوض دو سو پونڈ دیئے جائیں گے۔ لطیفہ! میں بچپن سے تم سے محبت کرتا ہوں۔ تمہیں وہ وقت یاد ہے جب ہم گاؤں سے باہر اکٹھے کھیلتے تھے۔ لطیفہ! چلو ہم شمالی سائبریا بھاگ چلیں جہاں تمہارے خاندان والے ہم کو کبھی نہ پا سکیں گے...... اور وہیں ہم شادی بھی کر لیں گے۔"

"ہش شیطان!" لطیفہ پلٹ کر بولی۔ "تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا؟ خیر ہے ہم نے اگر ایسی بیوقوفی کی تو نہ صرف میرا باپ اور بھائی ہمارا پیچھا کرکے ہمیں مار ڈالیں گے بلکہ میرا ہونے والا شوہر اپنے قبیلے والوں کو لے کر ہمارے خون سے اپنے انتقام کی پیاس بجھائے بغیر نہ رہے گا، کیونکہ میرا فرار اس کی انتہائی توہین ہو گی۔"

"کچھ پروا نہیں لطیفہ!" موسیٰ نے کہا۔ "ہم اسے بھی برداشت کر لیں گے۔"

"اگر مجھے تم سے محبت ہوتی تو میں ایسا بھی کر لیتی۔" وہ ہنستے ہوئے کہنے لگی۔ "لیکن میں تم کو بالکل نہیں چاہتی، میں تم سے کیوں شادی کروں اور کیوں ایک معمولی کسان کی بیوی بن کر اپنی زندگی خطرے میں ڈالوں جبکہ ابراہیم ابن شیخ حسین سے شادی کرکے میں چین سے زندگی گزار سکتی ہوں۔"

وہ کہتے کہتے دفعتاً رک گئی کیونکہ موسیٰ اپنی کمر سے خنجر آبدار کھول رہا تھا جو کُرد بالعموم اپنے ساتھ رکھتے ہیں۔ "اپنا خنجر چھپا لو موسیٰ!" وہ چیخی "ورنہ میں مدد کے لئے پکاروں گی۔ میرا باپ اور بھائی قریب ہی کام کر رہے ہیں اور پیشتر اس سے کہ تم مجھ پر حملہ کرو وہ اپنی کلہاڑیوں سے تمہارا دم نکال دیں گے۔"

چار و ناچار موسیٰ کو خمدار خنجر نیام میں رکھنا پڑا لیکن اپنا دایاں ہاتھ اٹھا کر اس نے قسم کھائی اور کہا "اگر تم نے مجھ سے شادی نہ کی تو بدوی شیخ سے بھی تمہاری

نہ ہوگی۔"

اُس کے چہرے پر مایوسی چھاگئی اور وہ غار سے باہر نکل گیا۔

(۲۱)

کئی دن گزرنے کے بعد جب ابراہیم نے شادی کا انتظام کرلیا تو اُس کے باپ نے اطلاع دی کہ دولھا اپنے ہمراہیوں کے ساتھ جمعہ کے روز پہنچے گا۔

لطیفہ نے یہی بہتر سمجھا کہ موسیٰ کی ناخوشگوار ملاقات کو بھول جائے اور اس کی دھمکیوں کا کسی سے ذکر نہ کرے۔ جمعرات کے دن اس کی ماں اور خالائیں اُسے یروشلم کے باب الثبات پر لے گئیں جہاں اُسے شادی کے لئے غسل کرایا گیا اور جسم کو معطر کیا گیا۔ اُس کے ہاتھوں میں حنا رچائی گئی اور خوشنما بال عروسی طریقے پر آراستہ کئے گئے۔ رات گئے جب وہ اپنے باپ سے باتیں کررہی تھی، موسیٰ کے باپ نے دروازہ کھٹکھٹایا اور کہا: "موسیٰ کا صبح سے پتہ نہیں، یہاں تو نہیں آیا؟"

اُن کے انکار پر وہ نوجوانوں کے اطوار پر بڑبڑاتا ہوا چلا گیا۔ اُس وقت موسیٰ اپنے علاقے سے دور پہاڑی پر جارہا تھا۔ رات کا کچھ حصہ اُس نے ایک غار میں چھپ کر گزارا کیونکہ فلسطینی سپاہیوں کا ایک گروہ رہزنوں کی تلاش کررہا تھا۔ اگر انھوں نے اس کی رائفل اور کارتوسوں کی پیٹی دیکھ لی ہوتی تو یقیناً اُسے گرفتار کرلیتے یا گولی سے مار دیتے۔

علی الصباح وہ نکل کھڑا ہوا اور تھوڑی دیر بعد خان الاحمر کے پرانے اور بوسیدہ قلعے پہنچ گیا جس سے تھوڑے ہی فاصلے پر اُس کے گاؤں جانے کا راستہ تھا۔

قلعے کی فصیل میں اُس نے اپنے آپ کو اس طرح چھپا لیا کہ ایک موکھے میں سے وہ ہر اُس چیز کو آسانی سے دیکھ سکتا تھا جو شاہراہ پر سے گزرے۔ دس بجے کے قریب اُس نے دیکھا کہ چند بدوی سوار عرب کے عروسی گیت گاتے ہوئے جارہے ہیں۔ چنانچہ وہ آنکھوں میں نفرت اور دل میں غصے سے اُن کو دیکھتا رہا یہاں تک کہ وہ اُس کے بالکل قریب آگئے اُس نے اپنی رائفل سنبھالی۔

دولھا کے سر پر ریشم کی خوبصورت ٹوپی تھی۔ اور اونٹ کی اون سے بُنی ہوئی احمریں و سنہری عبا اُس کی پشت پر سے نیچے لٹک رہی تھی جس سے اُس کی توقیر و عظمت ظاہر ہوتی تھی۔ قانون کے مطابق جبروان کی سرحد پر انھوں نے اپنی بندوقیں امانت رکھوا دیں اور اب اُن لوگوں کے پاس کوئی نشانہ لگانے والا ہتھیار نہ رہا۔ البتہ ابراہیم کی کمر میں ایک تلوار لٹکی ہوئی تھی۔

چاروں طرف ایک نگاہ ڈال کر کہ کوئی فلسطینی سپاہی اُس کو نہیں دیکھ رہا ہو، وہ رائفل تان کر سامنے آگیا۔ بدوی سوار حیرت زدہ ہوگئے۔ لیکن پیشتر اس سے کہ وہ کچھ کرسکتے موسیٰ نے خوفناک آواز میں کہا: "اجنبی کتے! تو دوشیزۂ سلوم سے کبھی شادی نہ کرسکے گا۔" یہ کہہ کر اُس نے دولھا پر رائفل چلائی اور وہ لڑکھڑاتا ہوا زمین پر نیچے گر کر مرگیا۔ موسیٰ نے اُس کے ساتھیوں کو بھی اپنی رائفل سے ڈرایا اور قلعے کے پیچھے وادی کیل کی جانب روانہ ہوگیا۔

انتقام اور رنج کی بلند آہوں کے ساتھ چار

ساتھی لاش کو خان الاحمر کی طرف لے گئے اور دو آدمی سلوم کی طرف روانہ ہوئے تاکہ اس المناک واقعہ کی خبر کریں۔

کوہ زیتون سے اُتر کر اُنھوں نے دیکھا کہ رسل العمود کے میدان میں سلوم کی تمام آبادی دولھا کا انتظار کر رہی ہے۔ بدوی لوگوں کو دیکھ کر اُنھوں نے مسرت کے نعرے لگائے لیکن دردانگیز خبر سُن کر یک بارگی اُن پر افسردگی چھا گئی۔

خوف زدہ مجمع قاتل کی تفتیش کے متعلق گفتگو کرتا ہوا منتشر ہو گیا اور مختار گاؤں کے چودھری نے دونوں بدوی سواروں کو اپنا مہمان بنا کر ایک قاصد بارکوں کی طرف بھیج دیا۔

چاروں طرف مفرور موسیٰ کی تلاش کی گئی مگر سُراغ نہ ملا ـــــ اور ملتا بھی کیسے؟ وہ اس دُنیا ہی میں نہ تھا۔ اُس نے ایک یونانی ماہی گیر کی کشتی میں سوار ہو کر بھاگ جانے کی کوشش کی مگر بہاؤ اس کے خلاف ہو گیا اور اُس کی کشتی منجدھار میں پھنس گئی ـــــ گویا قدرت نے شیخ کے خون کا بدلہ لے لیا۔

مہینوں گزر گئے اور لوگ اس واقعہ کو بھولنے لگے۔ لطیفہ اب پہلے سے بھی زیادہ حسین تھی۔ اس لئے اُس کے باپ نے اس سے فائدہ اُٹھانے کے لئے اعلان کر دیا کہ صرف وہی شخص لطیفہ سے شادی کرنے کی خواہش کر سکتا ہے جو دو سَو پونڈ معاوضہ دے سکے۔ گاؤں کے دہقان سے لے کر شہر کے آفندی تک اپنے دل مسوس کر رہ گئے کیونکہ وہ اتنی بڑی رقم ادا نہیں کر سکتے تھے۔ اس کا نتیجہ بُرا ہُوا۔ گاؤں میں ابتری پھیل گئی۔ سازشیں، لڑائیاں یہاں تک کہ مار پیٹ کا بھی دور دورہ ہو گیا۔ لیکن لطیفہ کے حُسن میں پھر بھی لمحہ بہ لمحہ اضافہ ہوتا گیا جس سے اُس کی ہم عمر لڑکیاں اس سے حسد کرنے لگیں۔ گاؤں والوں اور انگریزی پولیس افسر کے لئے وہ مستقل طور پر تکلیف دہ تھی اور جب اس کی وجہ سے کافی بدعنوانی پھیل گئی تو پولیس افسر نے ایک جلسہ منعقد کیا جس میں گاؤں کے بڑے بڑے لوگ جمع ہوئے اور لطیفہ کے باپ کو شریک ہونے کا بُلاوا بھیجا۔

مختار گاؤں کا مکھیا ہونے کی حیثیت سے سب لوگوں کے بیچ میں بیٹھا ہی تھا کہ لطیفہ کا باپ آ گیا اور سب کو سلام کر کے ایک طرف بیٹھ گیا۔ اُس کی آنکھیں پولیس افسر کے خوفناک چہرے پر جم گئیں جو قالین پر ایک طرف بیٹھا ہُوا تھا۔

"اے ابوعفیف"! مختار نے کہنا شروع کیا۔ "خُدا نہ کرے ہم تمھارے اندرونی معاملات میں دخل دیں، لیکن تمھاری لڑکی تمام گاؤں اور یروشلم کے تمام شہر کے واسطے بدامنی کا سبب بن رہی ہے اس لئے ہم سب اور جنابِ مدیر (پولیس افسر) چاہتے ہیں کہ تم جلد از جلد اس طرف توجہ کرو۔"

ابوعفیف نے جواب دیا: "اللہ تم سب کا بھلا کرے مگر میری لڑکی تو اس مصیبت کا سبب نہیں ہے بلکہ اس کی تمام ذمہ داریاں یہاں کے نوجوانوں پر ہیں جن میں سے بعض یہاں بیٹھے ہوئے حضرات کے صاحبزادے ہیں۔ وہ شادی کی تمنا کرتے ہیں لیکن شرط پوری نہیں کر سکتے۔ میں خود پریشان

ہوں کیونکہ مجھے اپنی لڑکی کی ان نوجوانوں سے حفاظت کرنی پڑتی ہے جو اُسے بھگالے جانے کا ارادہ کرتے ہیں۔ اگر نوجوانوں کو قبضے میں کر لیا جائے تو مصیبت کا جلد خاتمہ ہو جائے گا۔"

"بڑے گستاخ ہو!" مختار نے چیخ کر کہا۔ "جناب مدیر کی موجودگی میں اور میرے سامنے اس قسم کی گفتگو کرتے تمھیں شرم نہیں آتی؟ تم حرص کی وجہ سے اپنی بیٹی کو کنوارا رکھنا چاہتے ہو اور اس طرح گاؤں میں فساد پھیلا کر تم ہمیں گورنمنٹ کی نگاہ میں ذلیل بناتے ہو۔ اگر تم لطیفہ کے لئے مناسب معاوضے کی خواہش کرو۔ اور اس قادر زبردست رقم نہ مانگو جو ایک شہزادی کے لئے طلب کی جاتی ہے، تو معاملہ فوراً طے ہو جائے"

"جو اللہ کی مرضی"! ابوعفیف نے پارسائی سے کہا۔ "ایسی ہی بات ہے تو آپ میں سے کوئی صاحب اتنی رقم مجھے دیں جتنی شیخ کا لڑکا دے رہا تھا اور میں آج ہی نہایت خوشی سے اپنی بیٹی کو بیاہ دونگا۔"

دھمکیاں اور خوشامدیں بھی ابوعفیف کا لالچ کم نہ کر سکیں۔ آخر کار برا بھلا کہہ کر اُسے جلسے سے رخصت کر دیا گیا اور بعد میں چہ می گوئیاں ہونے لگیں۔ تنگ آکر برہم انسر بولا۔ "کچھ نہ کچھ فوراً کرنا چاہیئے ورنہ ہم تمہارے گاؤں کو ضبط کر لیں گے اور امن قائم کرنے کے لئے ہمیں سب پر جرمانے کرنے پڑیں گے۔"

اس دھمکی کے بعد وہ شیک، رفتار گھوڑے پر سوار ہو کر چلا گیا۔

پولیس افسر کی دھمکیوں سے سب دم بخود رہ گئے اور جرمانوں کے خیال سے سب کی روح فنا ہو گئی کیونکہ کسی کسان کی جیب پر نگاہ ڈالنے کا مطلب، یہ ہے کہ اُس پر انتہائی ظلم توڑا گیا ہے۔ بہت دیر تک گفت و شنید ہوتی رہی۔ آخر کار ایک تجویز سوچی گئی اور وہ یہ کہ گاؤں کے بڑے بڑے آدمی اپنے رشتے داروں کو ــــ جو اتنی بڑی رقم پیش کر سکتے ہیں ــــ دُور دراز سے بُلائیں تاکہ اُن میں سے کوئی "دوشیزہ سلوم" کو پسند کر کے ابوعفیف کی شرط پوری کر دے۔

دوسرے روز مختار بارکوں میں جا کر مدیر سے ملا کہ گاؤں والوں کو "دوشیزہ سلوم" کا معاملہ طے کرنے کے لئے ایک ماہ کی مہلت دی جائے۔

(۴)

تین ہفتے گزرنے کے بعد بڑی مشکل سے بات قرار پائی۔ گاؤں میں پھر ہنگامہ برپا ہو گیا کیونکہ گاؤں کے نوجوان نہیں چاہتے تھے کہ حسین لطیفہ ان کی آنکھوں سے اوجھل ہو۔

شادی کی تیاریاں شروع کر دی گئیں اور کچھ روز بعد لطیفہ کو پھر غسلِ عروسی کرایا گیا۔ اُس کے ہاتھوں میں مہندی رچائی گئی اور بالوں کو خوشبودار تیل سے آراستہ کیا گیا۔ اور عفیف نے بھی اس دفعہ فیاضی دکھائی اور شادی کے موقع پر ایک عالی شان دعوت کا انتظام کیا۔ ایک گائے اور چھ بھیڑیں ذبح کی گئیں۔ چاول، انڈے، آلو، مرغیاں اور مٹھائی تیار کرائی گئی۔ اور عمدہ قسم کے شربت منگائے گئے۔

لطیفہ کو مائیوں بٹھایا گیا۔ اس لئے اُسے صرف گاؤں اور شور و غل سے معلوم ہو سکا کہ اس کا دولھا کوئی بیس ساتھیوں کے ساتھ آگیا ہے۔ دُور دور تک سلوم میں گانا بجانا ہوتا رہا اور تیسری رات

کو ۔۔۔ جب دُلہن وداع ہونے کو تھی ۔۔۔ ایسا معلوم ہوا کہ تمام دشمنیاں اور حسد، جواب تک فساد پھیلاتے رہے، بھولے جا چکے ہیں اور سب لوگ شادی سے مسرور ہیں۔

راس العمود کے نزدیک آگ روشن تھی اور جوان ایک گھیرے میں شادی کے قدیم رواج کے مطابق ناچ اور گا رہے تھے۔ پولیس افسر اور چند سپاہی بھی اس جشن کی رونق بڑھانے کے لئے وہاں موجود تھے۔

کوہِ زیتون کی بلند چوٹی پر قمرِ چہاردہم جلوہ فگن تھا اور ناچ گانا جاری تھا کہ ایک معمر راوی (پیشہ ور داستان گو) نے عہد رفتہ کا ایک طویل قصہ چھیڑ دیا۔ سب لوگ اس کے اِردگرد جمع ہوگئے اور بوڑھے آدمی کی داستان غور سے سُننے لگے۔ دفعتاً کرب کی ایک جگر خراش چیخ سُنائی دی اور لوگوں نے شعلوں کی مرتعش روشنی میں دیکھا کہ احمد بن موسیٰ ابوالاعجاز جو لطیفہ کے پرستاروں میں سے تھا، فرش پر تڑپتے ہوئے دُولھا کے سینے میں سے ایک چوڑا خنجر نکال رہا ہے۔ "تو اس سے شادی کرا اجنبی کتے!" وہ وحشیانہ انداز میں چیخا اور خنجر دوبارہ اس کے سینے میں بھونک دیا۔

پیشتر اس سے کہ خوف زدہ لوگ سمجھ سکتے کہ ان کی آنکھوں نے کیا دیکھا، احمد نے ایک چھلانگ ماری اور درختوں کے سایوں میں غائب ہوجاتا اگر نوشہ کا ایک ساتھی اس کو اپنے مضبوط ہاتھوں سے نہ پکڑ لیتا۔ اُس نے پوری طاقت سے اپنی کلہاڑی اُس کے سر پر ماری جس کی ضرب سے ابوالاعجاز چکرا کر گرا اور گرتے ہی مر گیا۔

احمد کا قاتل یہ دیکھ کر کہ مدیر نے پستول نکال لیا ہے اور سلوم کے تمام لوگ اپنے ہم وطن کا بدلا لینے کے لئے اُس کی طرف لپک رہے ہیں سٹ پٹا گیا اور پریشانی کے عالم میں گھنے درختوں کے تاریک سایوں کی طرف بھاگا۔ گردونواح سے انجان، اور موت کے ڈر سے خائف، وہ دس قدم ہی چلا ہوگا کہ پہاڑ کی چوٹی سے پھسلا اور پتھروں سے ٹکراتا ہوا گردان کی وادی میں لاش بن کر گر گیا۔

دُولھا والے اہل سلوم پر کلہاڑیوں اور خنجروں سے حملہ کرنا چاہتے تھے کہ مدیر اپنے ہمراہیوں کو لے کر بیچ میں آگیا۔ دُولھا والے گرفتار کر لئے گئے اور اہلِ سلوم کو فوراً گھروں میں چلے جانے کا حکم دے دیا گیا۔

ان المناک واقعات کو گیارہ سال گزر گئے لیکن لطیفہ اب بھی کنواری ہے۔ کوئی شخص، جسے ان لوگوں کا حال معلوم ہے جنہیں اُس کی وجہ سے اپنی جانیں دینی پڑیں، اُس سے شادی کرنے کی جرات نہیں کرتا۔ ستائیس سال کی عمر میں وہ کنواری ہوتے ہوئے بھی بوڑھی نظر آتی ہے اور کوئی نوجوان اُسے اب "دوشیزۂ سلوم" کے نام سے نہیں پکارتا۔ اُس کے مُہلک حُسن کے زائل ہوتے ہی اُس کے بے شمار پرستاروں کی آتشِ پرستش بھی سرد ہوگئی ہے، اس کا باپ ابوعفیف اس صدمے سے جانبر نہ ہوسکا جو اُسے دو سو پونڈ دوبارہ نہ ملنے سے پہنچا۔

لطیفہ دُنیا میں بس اب اس لئے رہ گئی ہے کہ نوجوان نسلوں کے لئے کنویں سے پانی بھر کر اور

جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر لائے۔ روایت کے مطابق دوشیزہ سلوم جیسی حسین عورت ایک صدی میں ایک دفعہ پیدا ہوتی ہے اور مدبر گزشتہ تکالیف اور مصیبتوں کو یاد کرکے تمنا کرتا ہے کہ کاش یہ روایت صحیح ہو۔

ساقی (دسمبر ۳۵ء) ———— نامعلوم

عروسِ نیل

افریقہ کی چاندنی راتوں میں جب مصر کا ذرہ ذرہ اپنے حسنِ شرار افشاں کی نمائش کرتا ہے تو بوڑھا نیل کبھی کبھی اُن گزری ہوئی باتوں اور بھولے ہوئے افسانوں کو دہرانے لگتا ہے جن کو اُس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔

سرزمینِ مصر کا سب سے درخشاں دور اُس وقت شروع ہوا جب محبوبۂ مصر کلوپیٹرا عالمِ وجود میں آئی۔ نیل کے کنارے جب خاموشی پوری طرح مسلط ہو جاتی ہے اور عروسِ شب کی بلوریں پیشانی نقابِ فلک میں سے جھلکنے لگتی ہے تو آس پاس کے نونہالانِ چمن مؤدب کھڑے ہو جاتے ہیں اور ضعیف اہرمن بحر اپنی کہانی شروع کرتا ہے۔ دو ہزار سال پہلے کی کہانی —— شعلہ بار اور درد بھری —— جب وادیٔ حسن سے ایک شعلۂ ہلاکت پسند بلند ہوا، اور جس نے ایوانِ حکومت کو متزلزل کر دیا۔ کہتے ہیں کہ اگر دنیا کا سب سے بڑا جرنیل حسنِ صبر آزما سے شکست نہ پاتا تو آج دنیا کی تاریخ بالکل مختلف ہوتی!

(۱)

دو ہزار سال سے زیادہ گزرے، سکندریہ میں ایک عورت رہتی تھی جس نے اپنے حسنِ خداداد اور عقلِ لاثانی کے ذریعے دو بڑے حکمرانوں کو دامِ حسن میں گرفتار کیا اور اپنی سیاسی تمناؤں اور غیر معمولی فہم و دانش کے سبب عظیم الشان مملکتوں میں ہلچل ڈال کر صفحۂ تاریخ پر اپنے نام کا نقشِ دوام ثبت کر دیا۔ یہ عورت مصر کی ملکہ تھی اور اس کا نام کلوپیٹرا تھا۔ وہ ۶۸-۶۹ سنہ قبلِ مسیح میں پیدا ہوئی اور سنِ شعور کو پہنچ کر شہرۂ آفاق شہنشاہ جولیس سیزر، اور مشہورِ زماں جرنیل، مارک انطونی دونوں کی محبوبہ رہی۔ قدرت نے اس کو حسن کے بہترین سانچے میں ڈھالا تھا۔ اس کی آنکھیں بڑی، سیاہ اور مخمور تھیں۔ وہ سفید فام تھی اور اُس کا قد میانہ تھا۔ المختصر اس کی زندگی، حسن کا جامِ بلوریں تھی جس میں جوانی کی شرابِ رنگیں جھلکتی تھی۔ مورخین اس کے حسن اور چال چلن کے متعلق مختلف خیال آرائیاں کرتے ہیں بلکہ قدیم یونانی اور رومی مصنفین تو اس کے کردار پر بہت ہی پست رائے ظاہر کرتے ہیں لیکن اس کی موافقت میں کوئی زبردست ثبوت نہیں ملتا۔

جس وقت کلوپیٹرا کی عمر چودہ سال تھی اور اس کا آفتابِ حسن اپنی پوری رنگینیوں کے ساتھ افقِ شباب پر جلوہ افروز تھا، چند آدمی سکندریہ آئے اور ان میں انطونی بھی تھا۔ اگرچہ اس واقعہ کو کوئی خاص اہمیت نہیں دی جاتی مگر ممکن ہے کہ وہ رومی نوجوان اس وقت اس کے حسن سے مسحور ہو چکا ہو۔

(۲)

کلو پیٹرا شاہِ مصر ٹولیمی سیزدہم کی دوسری بیوی کے بطن سے پیدا ہوئی تھی۔ بادشاہ نے آخری وقت میں یہ فیصلہ کیا کہ اس کے مرنے کے بعد اس کے بچوں میں سے دو بڑے بچے یعنی کلو پیٹرا اور ایک لڑکا، جس کی عمر اس وقت دس گیارہ سال کی تھی اور جو بعد میں ٹولیمی چہاردہم کے نام سے مشہور ہوا، مل کر حکومت کریں لیکن تھوڑے عرصے بعد دونوں کی سلطنت علیحدہ علیحدہ ہو گئی اور چند سال بعد ہی حکومت خود مختاری اور تنہا حکمرانی کی خواہش نے اُن دونوں کو لڑنے پر آمادہ کر دیا۔ چنانچہ کچھ عرصے تک سکندریہ سازشوں اور لڑائیوں کا مرکز بنا رہا۔

۴۸ قبل مسیح میں جب کلو پیٹرا اکیس سال کی ہوئی، اُس کا بھائی تمام مُلک کا حکمراں بن بیٹھا اور اس کو سائبریا فرار ہونا پڑا۔ کلو پیٹرا کی طبیعت اس ذلت کو برداشت نہیں کر سکی اور اس نے تھوڑی سی مدت میں فوج فراہم کر لی تاکہ اپنے بھائی سے اس بے عزتی کا انتقام لے۔ اس عرصے میں جب کلو پیٹرا اور ٹولیمی ایک دوسرے کے مقابلے پر اس مقام کے نزدیک جس کو اب پورٹ سعید کہتے ہیں، جنگ و جدال میں مصروف تھے پومپئی اعظم اور اس کی ملکہ، جن کو جولیس سیزر نے شکست دے کر بھگا دیا تھا، شاہِ مصر کے پاس پناہ لینے آئے مگر ٹولیمی نے اس خیال سے کہ مبادا پومپئی کو مدد دینے سے سیزر ناراض ہو جائے پومپئی کو قتل کر دیا۔ سیزر جب اس کا تعاقب کرتا ہوا سکندریہ پہنچا تو اس نے اپنے حریف کے قتل کی خبر سُنی۔ چنانچہ وہ وہیں محل میں مقیم ہو گیا اور اس نے دونوں بہن بھائیوں کا ملاپ کروانے کی غرض سے ان کو اپنے پاس بلوایا۔ ٹولیمی مان گیا مگر کلو پیٹرا اس سے بڑی پریشان ہوئی کیونکہ سیزر کے پاس پہنچنے کے لئے اُسے اپنے بھائی کے ملک سے گزرنا پڑتا تھا اور اس کو اندیشہ تھا کہ کہیں اس کا بھائی دغا نہ کرے ـــــــ مگر فوراً ہی اسکی دانشمندی نے اس مشکل کو حل کر دیا۔

ملکۂ شب اپنے دراز گیسو کائنات پر پھیلا چکی تھی۔ ہر طرف خاموشی اور سکون کا دور دورہ تھا۔ راتوں رات سکندریہ پہنچ کر کلو پیٹرا نے ایک وفادار غلام کو ساتھ لیا اور ایک خوبصورت چھوٹی سی کشتی میں بیٹھ کر ساحل تک پہنچی۔ ہدایات کے مطابق سسلی غلام نے اسے کمبل میں لپیٹا اور پیٹھ پر ڈال کر قصرِ شاہی کی طرف روانہ ہوا۔ محافظوں کے ٹوکنے پر اس نے اُنھیں بتایا کہ ایک افسر کے لئے کچھ سامان لئے جا رہا ہوں۔ اس طرح ملکۂ مصر اس معمولی طریقے سے خود اپنے محل کے دروازوں میں سے گزری۔ غلام نے جولیس سیزر کے سامنے جا کر اپنا تھیلا کھول دیا۔ سیزر اس وقت میز پر کہنی ٹکائے کام میں مصروف تھا۔ کمبل کے کھلتے ہی کلو پیٹرا پورے ناز و انداز سے کھڑی ہو گئی اور اُس نے کچھ اس طرح انگڑائی لی جیسے کوئی آسمان کا جگر چیر رہا ہو۔ اس کی رعنائی، اس کے قدِ موزوں اور اس کے حُسنِ بے پناہ کو دیکھ کر سیزر ششدر رہ گیا۔ قصہ مختصر، کلو پیٹرا کے حُسن کا جادو کام کر گیا۔

سیزر کا ارادہ سکندریہ میں چند روز قیام کرنے کا تھا مگر کلو پیٹرا کی جلوہ سامانیوں نے اب حالات

ہی بدل دیے۔ سلطنت کے معاملات پر دونوں کی کئی گھنٹے تک گفتگو رہی اور اس رومانی سیاسی ملاقات نے تمام تجاویز کو مسترد کرکے ایک نئی صورت پیدا کردی۔ وہ نہ صرف اس کے حسن و جمال پر فریفتہ ہوگیا تھا بلکہ اس کا یہ خیال بھی اب یقین میں تبدیل ہوگیا کہ اس کے ذریعے وہ دولتِ مصر پر قبضہ کرنے کے بعد تمام دُنیا کو فتح کرسکتا ہے ـــــ یوں اس رومی سردار اور مغرور و حریص لڑکی میں دوستی قائم ہوگئی۔

(۳)

کلوپیٹرا اور اس کے بھائی میں عارضی صلح ہو گئی مگر سیزر کا ارادہ تھا کہ وہ خود مصر کی تمام سیاست کو اپنی مٹھی میں لے لے۔ چنانچہ ان دونوں کے درمیان شادی کے سے تعلقات قائم ہوگئے۔ لیکن ایک لڑکے کی پیدائش کے بعد جس کا نام سیزیری اون رکھا گیا، کلوپیٹرا کی دلی خواہش اور حکومت کا شوق اس قدر بڑھ گیا کہ شاید ساری روئے زمین کی ملکیت ہی اس کی تسلی کرسکتی تھی۔

مشرقی یورپ پر متعدد حملے کرنے کے بعد سیزر نے ایک دفعہ پھر روم کی طرف رُخ کیا۔ بہت سی لڑائیوں اور ملکوں پر فتح پانے کے بعد اس کا ارادہ تھا کہ وہ کھلم کھلا اپنی منکوحہ بیوی کلپرنیا کو طلاق دے کر روم میں کلوپیٹرا سے اپنی شادی کا اعلان کردے ـــ یہ سوچ کر اسکندریہ میں اس نے کلوپیٹرا کو الوداع کہی اور اس سے یہ طے کرکے کہ وہ اسے جلد آملے گا، اٹلی روانہ ہوگیا۔

روم میں سیزر کے فتح حاصل کرنے کے بعد کلوپیٹرا اس سے آ ملی مگر اس نے اس ڈکٹیٹر کی پبلک زندگی میں نمایاں حصہ نہیں لیا۔ مطالعے سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اس عرصے میں سیزر اپنی بیوی کلپرنیا کے ساتھ رومی مکان میں رہتا تھا اور کلوپیٹرا اس کی موت تک ٹائبر کے کنارے مقیم رہی۔ رومیوں نے کلوپیٹرا اور سیزر کے میل جول کو اچھی نگاہ سے نہیں دیکھا، اس لئے وہ روم میں مقیم نہیں ہوئی۔ جب لوگوں کو یہ معلوم ہوا کہ سیزر نہ صرف مطلق العنان بادشاہ بننا چاہتا ہے بلکہ ملکۂ مصر کو بھی ان پر حکمراں کرانے کا متمنی ہے تو وہ مشتعل ہوگئے۔ چنانچہ اس پر زور ڈالا گیا کہ وہ کلوپیٹرا کو مصر واپس بھیج دے مگر وہ اس پر راضی نہیں معلوم ہوتی تھی۔ (بعض مورخین کا یہ بھی بیان ہے کہ سیزر کے قتل کے وقت وہ روم میں موجود نہیں تھی)

سیزر کی زندگی کے آخری ایام میں کلوپیٹرا کی انطونی سے پھر کئی بار ملاقات ہوئی اور اس کی حسن و جوانی نے انطونی کو دس سال پیشتر کی اس ملاقات سے زیادہ متاثر کیا جو سکندریہ میں لڑکپن میں ہوئی تھی۔ اس عرصے میں جب کلوپیٹرا شش و پنج میں تھی کہ کس طرح اپنی دلی تمناؤں کی تکمیل کرے اسے خبر ملی کہ مجلسِ مدبران میں سیزر کو قتل کردیا گیا ہے اور اس صدمۂ جانکاہ نے اس پر بڑا اثر کیا، کیونکہ وہ نہ صرف ایک بہترین دوست سے محروم ہوگئی تھی بلکہ اس وسیع مملکت اور عظیم الشان حکومت کی اُمید کا بھی خاتمہ ہوگیا تھا جس کا اس نے وعدہ کیا تھا۔ اس لئے اب دو صورتیں تھیں، ایک یہ کہ اپنے بچے کے ساتھ مصر لوٹ جائے اور دوسری یہ کہ وہاں

اس کے تخت کی وارث ہونے کا دعویٰ کرے ۔
معلوم ہوتا ہے اس معاملے میں آس نے انطونی سے بھی مشورہ کیا جس نے اس سے مدد کا وعدہ کیا اور یہ طے پایا کہ وہ مصر جا کر فوج جمع کرے اور پھر وہ دونوں مل کر سیزر کے بھتیجے اوکٹوئین کے خلاف لڑیں ۔

کلوپیٹرا مصر چلی گئی لیکن انطونی تلون المزاج ثابت ہوا۔ اس نے اوکٹوئین سے دوستی کر لی اور بہت عرصے تک کلوپیٹرا کو اس کی خبر نہ ہوئی ۴۱ء قبل مسیح کی گرمیوں میں جب انطونی "تارسس" میں تھا، اس نے معاملات پر گفتگو کرنے کے لئے کلوپیٹرا کو بلایا مگر اس کا دل انطونی کی طرف سے خشم آلود ہو گیا تھا اور وہ نہیں چاہتی تھی کہ انطونی سے اب ملے لیکن چونکہ اس وقت وہ دنیا میں سب سے زیادہ طاقتور جرنیل ہو چکا تھا، اس لئے بادلِ ناخواستہ تارسس پہنچی ۔

انطونی کی مہمان ہونے کی بجائے وہ ساحل ہی پر مقیم ہوئی اور رات کو اس نے انطونی اور اس کے ساتھ تمام رومی و مقامی اُمرا کو کھانے پر مدعو کیا ۔

مہمانوں کے استقبال کے لئے کلوپیٹرا نے پوری شان و شوکت سے اہتمام کیا۔ وہ خود نہایت شاندار، رنگین اور فوق البھڑک کپڑوں میں ملبوس ہو کر شامیانے کے نیچے لیٹ گئی۔ جس کا زیریں حصہ سونے کے پتروں سے لپا ہوا تھا۔ اس کے دونوں طرف خوبصورت خوبصورت، حسین لڑکے تھے جو کیوپڈ کا سوانگ بھرے ہوئے تھے ۔ کوئی بانسری بجاتا تھا، اور کوئی مصر) کے رنگین پنکھوں کی نرم و نازک ہوا اس کے گلابی رخساروں تک پہنچاتا تھا۔ اس کے چاروں طرف مرمریں بتوں پر سونے چاندی اور زمرد و پکھراج کے بیش قیمت عود دان رکھے ہوئے تھے جن میں سے خوشبوئیں سلگ رہی تھیں ۔

انطونی اور کلوپیٹرا کی ملاقات نہایت جوشیلی اور سرگرم رہی مگر اس نے انطونی کو کوئی موقعہ نہ دیا کہ وہ سنجیدہ معاملات پر گفتگو کر سکتا۔ بلکہ اس نے انتہائی کوشش کی کہ اس کے دل پر اپنی دولت وعظمت کا سکہ بٹھا دے ۔ چنانچہ جس وقت انطونی اپنے ہمراہیوں کے ساتھ کھانے کے کمرے کی طرف چلا تو ایسے قالین پر سے گزرا جو فرش سے دو فٹ بلند گلاب کی پنکھڑیوں پر بچھا ہوا تھا ۔

کھانے کے کمرے میں بہت سے صوفے پڑے تھے جن پر آنکھوں کو خیرہ کر دینے والے سالچوں کا کام تھا۔ میز پر سونے کی طشتریاں اور پیالے رکھے تھے جن کے ڈھکنے جواہرات کے بنے ہوئے تھے۔ کمرے کی دیواروں پر نہایت خوشنما اور قیمتی پردے لٹکے ہوئے تھے ۔ یہ سب سامانِ تعیش اس قدر غیر معمولی، عجیب و غریب اور عظیم المرتبت تھا کہ انطونی حیرت زدہ ہو کر تعریف کئے بغیر نہ رہ سکا۔ مگر کلوپیٹرا نے اس کی تعریف کے جواب میں کہا کہ یہ تمام چیزیں تو معمولی ہیں البتہ میں اس لئے مسرور ہے کہ انطونی کو پسند آئیں اور پھر ایسی ہی چیزوں کا (سونے کے برتن، جواہرات کے ڈھکنے، الماس و نیلم سے مرصع پردے، مصری قالین وغیرہ) اس نے اس کو تحفہ بھی پیش کیا ۔

اُس کے حُسنِ لاثانی اور مقناطیسی کشش سے انطونی کی رگ رگ میں برقی رو سرایت کرگئی جیسا کہ کبھی، برسوں پیشتر اسکندریہ میں سیزر مسحور ہوگیا تھا۔

جب دعوت قریب الختم تھی، کلوپیٹرا نے محسوس کیا کہ اب میدان اس کے ہاتھ ہے اور روم کا یہ سب سے بڑا جرنیل وقت پر اس کی حمایت میں ہوگا۔

اس کے بعد دونوں طرف سے دعوتوں کا سلسلہ شروع ہوگیا ہر دفعہ انطونی سر توڑ کوشش کرتا کہ کسی طرح شان و شوکت میں کلوپیٹرا سے بڑھ جائے مگر ناکامی ہوتی، آخرکار ایک بار اُس نے پوچھا "بتایئے کس چیز کے اضافے سے میری دعوت آپ کے شایانِ شان ہوسکتی ہے؟"

وہ ہنس پڑی "یہ کیسے ممکن ہے کہ انطونی، کلوپیٹرا سے سبقت لے جائے۔ میں تو صرف ایک ہی وقت کے کھانے پر نہایت آسانی سے ڈیڑھ لاکھ پاونڈ صرف کرسکتی ہوں" اور یہ کہ کر اُس نے شرط لگائی کہ میں ایسا کر دکھاؤں گی۔

شرط قبول کرلی گئی۔ وقت مقررہ پر انطونی مسرور بھی تھا اور مایوس بھی۔ مسرور اس لئے کہ آج کلوپیٹرا کا انتظامِ طعام نسبتاً سادہ ہے جس کی وجہ سے آئندہ اُس کے فوقیت لے جانے کی امید تھی اور مایوس اس لئے کہ آج ہر روز کے مقابلے میں اس نے پُر تکلف کھانے پیش نہیں کیے۔ دفعتاً کلوپیٹرا نے اشارا کیا اور ایک غلام نے ایک جام میں تھوڑی سی شراب اس کو پیش کی۔ جام و مے کو اس نے اپنے بلورین دستِ نازک سے تھاما اور یک بارگی اپنے کانوں کے بندوں میں سے ایک موتی (اُس موتی کی قیمت متذکرہ شرط سے نصف تھی) توڑا اور شراب میں ڈال کر پی گئی۔ یہ دیکھ کر انطونی متحیر رہ گیا اور اس نے تعجب سے اپنی انگلی دانتوں میں دبالی۔ کلوپیٹرا اب دوسرا موتی بھی توڑنے والی تھی کہ انطونی نے اُسے یہ کہتے ہوئے منع کیا کہ "تم شرط جیت گئی ہو۔"

انطونی کو یقین ہوگیا کہ کلوپیٹرا سے تعلقات کا استحکام اس کے لئے نہایت سودمند ہوگا۔ چنانچہ اس نے مجلسِ امرا سے اپنے عقد کی اجازت بھی لے لی۔ معلوم ہوتا ہے کلوپیٹرا نے انطونی سے وعدہ لے لیا تھا کہ وہ اسے کبھی نہ چھوڑے گا اور اس نے بھی اقرار کرلیا تھا کہ وہ اپنی رومی بیوی کو طلاق دے کر اس کی خاطر دشمنوں سے پوری قوت سے لڑے گا اور آئندہ تمام فتوحات اور مسرتوں میں وہ اس کی برابر کی شریک ہوگی۔

(۴)

کلوپیٹرا نہ صرف اپنے ذاتی وقار اور عزت و عفت کو انطونی کے سپرد کرچکی تھی بلکہ اس کو اپنی آئندہ زندگی کا ناخدا بھی تسلیم کرچکی تھی اس لئے اس کے مایوس جذبات کا اندازہ لگانا مشکل ہے جب کہ فروری ۳۶ء قبل مسیح میں انطونی نے اس کو جدائی کی خوفناک گھڑیوں سے آگاہ کیا کیونکہ اس عرصے میں روم اور سائبریا میں ابتری پھیلی ہوئی تھی۔ اسے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ قسمت کی بے رحم برچھی نے اس کے جگرِ تمنا کا خون کردیا ہے۔

ان کی جُدائی طویل رہی کیونکہ چار سال تک وہ ایک دوسرے سے نہ مل سکے۔

انطونی، کلوپیٹرا سے رخصت ہو کر ٹائیر آیا جہاں اسے معلوم ہوا کہ اوکٹیویَن اٹلی کا بادشاہ ہو چکا ہے۔ اسے یہ بھی معلوم ہوا کہ اس کی مدد کے لئے اس کی بیوی فلویا تین ہزار آدمیوں کو لے کر یونان گئی ہے تاکہ اس سے ایتھنز میں مل سکے۔ انطونی فوراً یونانی دارالخلافہ پہنچا جہاں فلویا بیمار پڑ گئی اور تھوڑے ہی عرصے بعد اس کا انتقال ہو گیا۔ انطونی نے اس ذاتی صدمے کو منافع میں بدل دیا اور جنگ کا تمام الزام اپنی مرحوم بیوی کے سر تھوپ کر اوکٹیویَن سے صلح کر لی اور اس صلح کو پائیدار کرنے کے لئے اس نے اوکٹیویَن کی بیوہ بہن اوکٹیویا سے شادی کر لی۔

انطونی کی اس اندوہناک فریب دہی اور ریاکاری کی اطلاع جب کلوپیٹرا کو پہنچی تو وہ گھبرا گئی اور آئندہ کسی قسم کی کامیابی سے بالکل ناامید ہو گئی اور جب ۳۶ء قبل مسیح میں انطونی نے اسے سائیریا بلایا۔ تو اگرچہ وہ انکار تو نہ کر سکتی تھی مگر اس نے چند شرائط پیش کرنے کا فیصلہ کر لیا یعنی انطونی، اوکٹیویَن کا کھلم کھلا دشمن بن جائے اور دونوں کی مشترک حکومت کا وارث اس کا لڑکا سیزرین اون جس کی عمر اب تقریباً دس سال تھی، قرار پائے۔

کلوپیٹرا نے لالچی انطونی کو یقین دلایا کہ وہ مصر میں ایک ممتاز حکمراں کی حیثیت رکھے گا۔ اور اس لالچ میں آ کر وہ مجبور ہو گیا کہ اس کی طرف پھر مائل ہو جائے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس وقت تک ان دونوں کی قانوناً شادی ہو گئی ہو اور اسی خوشی کے موقع پر وہ سکے بنائے گئے ہوں جن پر اُن دونوں کے چہرے منقش تھے۔ کلوپیٹرا الملکہ کہلاتی تھی اور انطونی مطلق العنان بادشاہ۔

کلوپیٹرا اور انطونی کچھ عرصے تک وہیں مقیم رہے۔ مگر جب انطونی لڑائی پر روانہ ہوا تو کلوپیٹرا ایک دفعہ پھر مصر واپس چلی گئی۔ باوجود بے شمار پریشانیوں اور ناکامیوں کے جن سے اس کو سامنا کرنا پڑا تھا، کلوپیٹرا کے ہوش و حواس ابھی تک بجا تھے۔ کلوپیٹرا یقیناً دانشمند اور عقیل عورت تھی۔ اسی طرح جرات اور بہادری میں بھی اس کا جواب نہیں تھا۔ اس لئے اس نے آگے چل کر نہ صرف انطونی سے بہتر حکمرانی کی بلکہ بیرونی حملوں اور ملکوں کو فتح کرنے کے لئے اس کو تجاویز سوچنے میں بھی وہ اس کی برابر مدد دیتی رہی۔

میدانِ کارزار میں اسے جانے سے روکنا آسان کام نہ تھا۔

اِدھر انطونی میں ایک زبردست جرنیل ہونے کے ساتھ ساتھ بہت سی کمزوریاں بھی تھیں۔ وہ ہمیشہ سے کھیل تماشوں کا شوقین تھا۔ چنانچہ حُسن و جمالِ مصر کو دیکھ کر تو وہ اپنے وقار اور شخصیت کو سنجیدگی سے محسوس کرنا بھی بھول گیا۔ مشرقی سامانِ تعیش اور مصر کے عشرت کدوں میں اس نے بچپن اور مسخرے پن کی حرکات شروع کر دیں جن سے کلوپیٹرا انطونی سے حقارت و نفرت کرنے لگی۔

آخرکار اوکٹیویَن سے جنگ چھڑ گئی۔

شروع ہی سے کلوپیٹرا کا پانسہ زیر رہا۔ امرا و سردارانِ سلطنت کلوپیٹرا کی میدانِ جنگ میں موجودگی کو پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھتے تھے اور ایک وقت وہ آیا کہ اس کے بہت سے حامی و معاون

اسی بنا پر ناراض ہو گئے اور انطونی کو چھوڑ کر دشمن سے جا ملے۔ آخر کار مجبور ہو کر انطونی نے کلوپیٹرا کو سمجھایا کہ بحری لڑائی میں مدد دینے کے بعد وہ مصر واپس چلی جائے۔

اس جنگ کی تیاریاں بڑے زور و شور سے کی گئیں اور کہا جاتا ہے کہ کلوپیٹرا کے جہازوں کے علاوہ انطونی تین سو جہاز لے کر جنگ میں شریک ہوا لیکن بدقسمتی نے انطونی کا پیچھا نہ چھوڑا اور کلوپیٹرا نے اپنے حسین و نازک جہاز ہی میں سے اندازہ لگا لیا کہ شکست یقینی ہے۔

اس نے یہی سوچا کہ اب مصر واپس چلی جاؤں مرد کی حیثیت سے اس کو انطونی سے قطعاً کوئی محبت نہ رہی تھی اور ایک شکست خوردہ حکمراں ہونے کی وجہ سے وہ اس کے لئے بالکل بے کار تھا۔ مگر راستے ہی میں انطونی۔ کلوپیٹرا سے جا ملا اور ایک دفعہ پھر ان دو سرکش انسانوں میں ملاپ ہو گیا اور وہ دونوں اکٹھے اسکندریہ چلے گئے۔

اوکٹیوئین اپنے غلبے سے پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہتا تھا اس لئے اس نے انطونی کا پیچھا کیا اور جب اُس نے اسکندریہ کی فصیلوں کا محاصرہ کر لیا تو کلوپیٹرا اپنے مقبرے میں چلی گئی جس کو اس نے دستور کے مطابق سمندر کے کنارے ایک مندر کی شکل میں تعمیر کرایا تھا۔

معلوم ہوتا ہے کہ یہ عمارت اپنی وسعت و عظمت اور خوبصورتی کے لحاظ سے نہایت عظیم الشان ہوگی۔ کلوپیٹرا نے اس کی بلند دیواروں کو حسرت سے دیکھتے ہوئے فیصلہ کیا کہ اگر اس کے محب اور شوہر جولیس سیزر کے بھتیجے اوکٹیوئین نے محاصرہ نہیں اٹھایا تو وہ اسی پر اسرار دیواری میں اپنی زندگی کا خاتمہ کر دے گی۔ آخری اور خونیں لڑائی کے بعد اوکٹیوئین نے انطونی کی فوج کو بالکل تباہ و تاراج کر دیا اور شہر میں داخل ہو گیا۔

انطونی کے ایک ملازم نے جو کلوپیٹرا کے ساتھ مقبرے تک گیا تھا اور جس کا خیال تھا کہ اس نے خودکشی کر لی ہوگی یہ المناک خبر اس کو پہنچا دی۔ انطونی جو اس وقت دیوانگی کی حالت میں محل کے کمروں میں ٹہل رہا تھا۔ اس وحشت ناک خبر کو سنتے ہی دم بخود ہو گیا اور چند لمحات بعد جب ہوش آیا تو اُس نے تلوار کھینچ کر پوری طاقت سے اپنے جسم پر وار کیا۔ زخم نہایت کاری لگا اور اس کی تاب نہ لا کر پیچھے گرا۔ لیکن ابھی اُس میں کسی قدر جان باقی تھی۔

کلوپیٹرا نے جس وقت اس کے اقدام خودکشی کو سنا تو اپنے فرمانبردار اور وفا شعار ملازموں کو حکم دیا کہ اس کو اس کے مقبرے میں لایا جائے۔

انطونی کو اس قابلِ رحم حالت میں دیکھ کر ملکہ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور الفت خوابیدہ ایک دفعہ پھر انگڑائی لے کر بیدار ہوئی، سیاہ دراز بال، نیل کی ناگن کے مرمریں شانوں پر بل کھانے لگے اور اس کا دل ماتم کرنے لگا۔ انطونی بھی اس عورت کے انجام کے خیال سے جس کو وہ زندگی بھر فریب اور دھوکا دینے کی کوشش کرتا رہا بے چینی محسوس کر رہا تھا اس نے بصد منت التجا کی "جانِ انطونی! مصر کی حسین ملکہ! خدارا اس رونے دھونے

کو چھوڑ دو اور ہر نیک طریقے سے کوشش کرو کہ جس طرح بھی ممکن ہو اوکٹیوئن سے صلح ہو جائے "

کلوپیٹرا نے اس کی کوشش کی ——— محض انطونی کی خاطر!

وہ جانتی تھی کہ اس کا دورِ حکومت اب ختم ہو گیا ہے اس لئے اس نے اپنے لئے سوائے آزادی کے اور کسی چیز کی خواہش نہیں کی لیکن اس بات پر زور دیا کہ اوکٹیوئین کے بعد اس کا بیٹا سیزرکی اون تخت کا والی بنے۔ نوجوان فاتح بظاہر اس سے متفق ہو گیا اور اس سے وعدہ کیا کہ اگر وہ کلیتاً اپنے آپ کو اس کے سپرد کر دے گی تو اسے کسی خوف کی قطعی ضرورت نہیں مگر مصری ملکہ فوراً سمجھ گئی کہ وہ اس پر چال چلنے کی کوشش کر رہا ہے۔ وہ چاہتا تھا کہ اس کو زنجیروں میں جکڑ کر اپنی سنہری رتھوں کے ساتھ روم کی سڑکوں اور بازاروں، گلی اور کوچوں میں گھسیٹ کر مصر اور اہل روم کی تذلیل کرے اور انتقام لے کر اپنی فتح کی شان و شوکت میں اضافہ کرے۔ اس ذلت سے بچنے کے لئے کلوپیٹرا نے خودکشی کا فیصلہ کر لیا...... !!

(۵)

ناکام تمنا کلوپیٹرا اب چاروں طرف حسرت و یاس سے تکتی اور اپنی سیاہ پلکیں فرشِ خاکی پر اس طرح جھکا لیتی جیسے کوئی تاریک اور دھند سے ملفوف رات میں ایک مہیب اور پُرخطر راستہ بھول گیا ہو۔

وہ اوکٹیوئین سے اجازت لے کر انطونی کی قبر پر گئی جہاں اس کے دل میں عہدِ رفتہ کی بے چین یاد نے تڑپ پیدا کر دی۔ اس کی غمگین آنکھوں میں جن میں کبھی کبھی نیلاہٹ کی چمک بھی دکھائی دینے لگتی تھی، آنسو جھلکنے لگے۔ چند لمحات وہ اس مٹی کے ڈھیر کو دیکھا کی جس کے نیچے شمع جوانی کا فوجی پروانہ ابدی نیند سو رہا تھا اور بے اختیار ہو کر وہ وہاں سے اپنے مقبرے میں چلی آئی۔

اس نے نیل کے متبرک پانی سے غسل کیا اور آخری بار اپنے جسم کو مصر کی بہترین عنبر پاش خوشبوؤں سے معطر کیا اور پھر ہیروں سے مرصع صوفے پر لیٹ کر اس نے پُرتکلف کھانوں کو تھوڑا تھوڑا چکھا۔

انفراغِ طعام کے بعد ایک مختصر سے خط میں اس نے اوکٹیوئین سے بصد منت درخواست کی کہ اس کو انطونی کے ساتھ دفن کیا جائے۔ اس کے بعد اس نے دو عورتوں کے علاوہ اپنی تمام خواصوں کو باہر نکل جانے کا حکم دیا کہ وہ اب بغیر مداخلت کے خاموشی سے آرام کرنا چاہتی ہے۔

کلوپیٹرا کی موت کے صحیح طریقے کے متعلق آرا میں بڑا اختلاف ہے۔ لیکن عام طور پر مشہور یہ ہے کہ ملکہ عرصے سے کسی ایسے زہر کے معلوم کرنے میں بے شمار تجربے کر چکی تھی جو سب سے سریع قاطع حیات ہو مگر تکلیف دہ نہیں اور بہت سوں کا خیال ہے کہ اس نے ایک افعی سے ڈسوا کر اپنی زندگی کا خاتمہ کیا۔

پیشتر اس سے کہ اوکٹیوئین کے افسرِ اعلیٰ اس کو زہر کے اثر سے بچالیں وہ ختم ہو چکی تھی۔ اس کی موت بھی اس کے شوقِ جاہ و حشم کی شاہد تھی اور اس میں شک نہیں کہ شان و شوکت میں اس کی پیدائش، جوانی اور موت تینوں یکساں رہیں۔ بیش بہا کپڑوں میں ملبوس، جواہرات میں ڈوبی ہوئی، وہ سونے

کے پلنگ پر لیٹی ہوئی تھی اور اس کی پیشانی مشہور عالم جواہرات کی لڑیوں سے مزین تھی۔ ایک خادمہ اس کا تاج درست کرتی ہوئی دوسری پر گر پڑی اور دوسرے لمحے میں وہ خود بھی اپنی ملکہ کے پاس مردہ تھی، اُس ملکہ کے پاس جو نیل کی ناگن کے نام سے مشہور ہے اور جس کے نصف جسم کا بُت لندن کے برٹش میوزیم میں رکھا ہوا ہے۔

یہ ہے داستان جوانی اور حُسنِ خون آشام کی جو نیل کی غمناک کہانی میں پنہاں ہے۔

ساقی (سالنامہ ۳۵ء) ——— ماخوذ

لیسا کا ماہی گیر

(۱)

لیسا ڈاپال میسر، ایک قابلِ دید مقام ہے خصوصاً اُس وقت جب آفتاب ارغوانی پہاڑیوں کے پیچھے غروب ہو رہا ہو اور ماہی گیروں کی بیویاں جالوں کو سُکھانے کے لئے ان کو ریت پر ڈال کر کوئی غمگین اور دل سوز گیت گانے لگیں۔

پہلی نظر میں یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ لیسا ساحلِ سمندر کے قریب دولت مندوں کا شہر ہے یا مفلس مچھیروں کا گاؤں۔ غریب لوگوں کی جھونپڑیوں کے درمیان جو راستہ ہے اس کے دونوں جانب سایہ دار درخت ہیں اور اس راستے کے اختتام پر خاصے شاندار دیہاتی محل بنے ہوئے ہیں جہاں یاسمن اور گلاب کی فراوانی ہے۔ شاید کوئی کہہ اٹھے "امارت کی مسکراہٹ مفلسی کے آنسوؤں کی تحقیر کر رہی ہے۔"

یہاں ہر ماہی گیر کا ایک مکان ہے جہاں وہ ہوا اور موجوں سے کشمکش کے بعد آرام لینے آجاتا ہے۔ بعض لوگ اسی روز روز کی محنت سے اُکتا کر ملّاح کی حیثیت سے دولت کی جستجو میں برازیل چلے جاتے ہیں لیکن ہر شخص، جانے سے پیشتر کلیسا میں دو زانو ہو کر قسم کھاتا ہے کہ اگر وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائے تو وطن کی شان دوبالا کرنے کے لئے یہاں ایک خوبصورت باغ بنوائے گا۔

(۲)

ماہی گیر رمیو کی ماں کو سب لوگ انینا کہتے تھے۔ اس کا شوہر گاؤں کے معزز ماہی گیروں میں سے تھا جس کو مرے ہوئے نو سال ہو گئے تھے۔ اس کے دو بیٹے تھے۔ بڑے کا نام رمیو تھا اور چھوٹے کا روبرٹو۔ چھوٹا بیٹا اب ایک ماہی گیر کے ہاں مُلازم ہو گیا تھا جس کی ایک بچّی تھی، خوبصورت اور بھولی بھالی۔ ماہی گیر نے ایک دن انینا سے کہا "یہ تمھارے روبرٹو کی ہونے والی دُلہن ہے۔"

ماں مُسکرائی لیکن لڑکا شرما گیا۔

"روبرٹو کی؟ میری نہیں"؟ بڑے بھائی رمیو نے ہنستے ہوئے کہا۔

"اوہو! میں بھول ہی گیا تھا۔ خیر! آزابیل، بڑی ہو کر خود ہی اپنے لئے تم دونوں میں سے جس کو چاہے گی پسند کرے گی۔"

بچّی نے اپنا ننھا سا ہاتھ روبرٹو کے شانے پر رکھ کر بھولپن سے کہا "میں اِنھیں پسند کروں گی۔"

اس طفلانہ حرکت پر سب ہنس دیے۔ تھوڑے دنوں بعد روبرٹو کلیسا میں گیا اور مسیح کی تصویر کے آگے دو زانوں ہو کر اُس نے قسم کھائی کہ اگر میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا تو اُس جگہ جہاں میری ماں کی جھونپڑی ہے ایک عالی شان مکان بنواؤں گا۔

اُس نے اپنے پُرجوش تخیل میں دیکھا کہ تصویری صلیب پر مسیحؑ کے ہاتھ نے بہت دُور اُفق کی طرف اشارہ کیا ہو —— کیونکہ وہ ملاح بن کر سمندر کے پار دولت حاصل کرنی چاہتا تھا

اُسی رات وہاں کے پاک دستور کے مطابق جب وہ اپنی ماں کے آگے دُعاؤں کے لئے جھکا تو اُس نے اپنی ماں کے ہاتھ کو بوسہ دیا۔ اور اُس کے آنسو اُس پر ٹپ ٹپ گرنے لگے۔ "کیا ہے؟" ماں نے پُوچھا۔ مگر وہ مُسکرا دیا اور اُس سے دُعاؤں کی التجا کی۔

دُوسری صبح وہ وہاں سے چلا گیا۔

اور پورٹو سے اُس نے اپنی ماں کو خط کے ذریعے اطلاع دے دی کہ وہ برازیل جا رہا ہے۔

(۳)

روبرٹو کو گئے دس سال بیت گئے۔

بالآخر ایک دن وہ خوبصورت نوجوان اپنی ماں اور بھائی سے آملا۔ اس کی عمر اب چوبیس سال کی تھی اور ریمو چھبیس سال کا تھا لیکن وہ چھتیس سال کا معلوم ہوتا تھا۔ اُس نے اپنی تمام زندگی ہوا اور موجوں سے مقابلہ کرتے ہوئے گزاری تھی تاکہ گھر والوں کا کفیل ہو سکے —— کیونکہ اس کی شادی روبرٹو کی محبوبہ ازابل سے ہو چکی تھی۔ جس نے روبرٹو کے دل میں یہ خیال پیدا کیا تھا کہ وہ اس کے لئے وطن سے باہر دولت کی تلاش میں سرگرداں رہے۔ ازابل کے باپ کے بُرے دن آگئے تھے۔ وہ نہ صرف کنگال ہو گیا تھا بلکہ چند ملاحوں کو بچاتے ہوئے اس کی کمر ٹوٹ گئی تھی۔ باوجود اس کے کہ انینا نے اس کی مدد کی، وہ جانبر نہ ہو سکا اور جب اس کا انتقال ہو گیا تو ریمو نے یتیم دوشیزہ کو اپنا گھر اور اپنے آپ کو پیش کیا۔ وہ تینوں سکون و آرام سے زندگی گزار رہے تھے کیونکہ ساس اور بہو جالوں کی مرمت کرتی تھیں اور ریمو اپنی اَن تھک کوششوں سے سمندر کی فصل جمع کرتا تھا۔

جب روبرٹو، لیساڈا پال سیرا میں جون کی ایک خوبصورت صبح کو پہنچا تو لوگوں نے اس کا اس قدر پُرجوش استقبال کیا جیسا کہ سُنا جاتا ہے حضرت سلیمان نے ملکہ سبا کا کیا تھا۔ دوسرے دن تمام ماہی گیروں نے جشن منایا اور ساحلِ سمندر پر دعوت کا انتظام کیا۔ مچھیروں اور اُن کی عورتوں نے ہر اُس لذیذ اور عمدہ شے کو مہیا کرنے کی کوشش کی جو یہ بیچارے مہیا کر سکتے تھے۔

روبرٹو نے اپنا ساغر بھرا اور سب دوستوں کے لئے جامِ صحت تجویز کیا "آپ سب کو دوبارہ دیکھ کر جو مجھے خوشی ہوئی ہے اُس کا اظہار نہیں کر سکتا۔" ذرا ٹھیر کر اُس نے پھر کہا "برازیل میں میری تقدیر بُری نہیں رہی، مگر سب سے زیادہ خوشی اس بات کی ہے کہ میں آپ سب کو اور اپنے رشتے داروں کو دوبارہ دیکھ رہا ہوں —— میری ماں! میرا بھائی!"

"اور یہ بھی تو تمہاری رشتے دار ہیں۔" ریمو ازابل کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔

"اوہو! معاف کرنا ریمو! میری بھاوج، میری بہن ہے۔ میں تم دونوں سے بہت محبت کرتا ہوں۔ تمہاری بیوی کا نام کس قدر پیارا ہے، کس قدر پاک!"

"دیکھو! تم نے برازیل جا کر کیا غضب کیا؟" انینا، روبرٹو کو پیار کرتے ہوئے مذاق میں بولی۔

"تمہاری محبوبہ تم سے چھن گئی۔"

"کیسے؟" مچھیروں نے پوچھا۔

انینا نے ازابل کے بچپن کی وہ کہانی سنائی جب اس نے روبرٹو کو اپنے ہونے والے شوہر کی حیثیت سے پسند کیا تھا۔ اس پُر مذاق داستان پر سب دل کھول کر ہنسے۔

روبرٹو نے یکبارگی ازابل کی طرف دیکھا لیکن اُس نے فوراً نظریں نیچی کر لیں۔

"دوستوں کے لیے جامِ صحت!" اُس نے ساغر اُٹھاتے ہوئے کہا۔

"روبرٹو کا جامِ صحت!" وہ سب کھڑے ہو کر بولے۔

"میرا بچہ دوبارہ لیباڈاپال میرا آگیا ہے۔ میں کس قدر خوش قسمت ہوں۔" نیک انینا آنسو چھپاتے ہوئے بولی۔ "مسیح کا شکر ہے کہ یہ اب امیر اور خوش و خرم ہے!"

روبرٹو چند لمحات خاموش رہا، پھر ٹھنڈا سانس لے کر کھڑا ہوا اور اپنی ماں سے لپٹ گیا۔

"تم خوش ہو نا؟" انینا نے بے چین ہو کر پوچھا۔

"ہاں، ہاں! ماں۔"

"تو تم دولت کی خاطر اپنی ماں کو چھوڑ کر کیوں چلے گئے تھے؟" ریمو نے ہمدردی آمیز خفگی سے کہا۔

"تم نے میرا یہ قصور معاف نہیں کیا؟ واقعی اس زندگی میں حصولِ امارت کی تمنا حماقت ہے کیونکہ ہم اپنے پیچھے سب کچھ چھوڑ جائیں گے۔"

جب اس شام کو روبرٹو دُعا کے لئے اپنی ماں کے آگے سرنگوں ہوا تو اُس نے بڑی معنی خیز دُعا دی۔

"خدا تمھیں شیطانی وسوسوں سے محفوظ رکھے!"

(۴)

اگرچہ برازیل میں اُس نے بہت دولت کمائی اور قصبے میں ہر جگہ اس کا شاندار استقبال ہوا مگر روبرٹو ہر وقت غمگین رہتا تھا۔ گویا خیالات میں گم سُم ہے۔ وہ اکثر کلیسا میں جاتا اور کسی قدر غصّے سے اُس تصویری ہاتھ کی طرف دیکھتا جس نے اُس کو، اُس کے خیال میں، ایک جانب اشارہ کیا تھا۔ پھر وہ ساحلِ سمندر پر مارا مارا پھرتا اور خواب آلود نظروں سے سمندر کے پار دیکھنے لگتا۔

انینا اس کا مطالعہ کر رہی تھی اور اپنی بہو کا بھی۔ وہ دیکھتی تھی کہ روبرٹو، ازابل سے کبھی کبھار تو باتیں کرتا تھا اور وہ بھی تلخی آمیز لہجے میں۔ اسی طرح ازابل بھی چوری چھپے اُسے دیکھا کرتی تھی۔ اور اس وقت اُس کے دل میں کوئی دیرینہ اور پوشیدہ جذبہ بیدار ہو جاتا تھا۔

روبرٹو کی واپسی کے کچھ دن بعد ایک دفعہ دونوں عورتیں اپنی جھونپڑی میں دریچے کے پاس بیٹھی تھیں۔ بڑا بھائی اپنی کشتی میں گیا ہوا تھا۔ چھوٹا ساحل پر پھر رہا تھا۔ انینا نے اپنے دونوں بیٹوں کے متعلق گفتگو کرنی شروع کی اور دونوں کی خوبیاں بیان کرنے لگی۔ ازابل اپنے شوہر کا موزہ بُن رہی تھی۔ گاہے گاہے اپنی ساس کے سوالوں کا جواب دے دیتی تھی۔

دفعتاً انینا نے کہا: "تم ریمو سے زیادہ روبرٹو میں دلچسپی لے رہی ہو۔ کیا یہ اس لئے کہ روبرٹو تمہارے نزدیک کسی قدر اجنبی ہے؟"

"نہیں ماں ـــــ یہ وجہ نہیں ہے!"

"سنو ازابل!" بوڑھی عورت نے سنجیدہ لہجے میں کہنا شروع کیا۔ "روبرٹو کو واپس آئے ہوئے ایک ہی ہفتہ ہوا ہے لیکن تم اس عرصے میں کافی تبدیل ہو چکی ہو...... مجھے معلوم ہے تمھیں روبرٹو سے محبت ہے، تمھیں بیچارے ریمو سے کبھی محبت نہیں ہوئی۔ تم نے اُس سے صرف اس لئے شادی کی تھی کہ دُنیا کی سختیوں سے محفوظ ہو جاؤ۔ کیا تم اس سے انکار کر سکتی ہو؟"

ازابل خاموش تھی اور رات حسین۔ لہروں کی روانی زیتون کے درختوں میں سرسرانے والی ہواؤں کے ساتھ مل کر دل کش موسیقی پیدا کر رہی تھی۔ گلاب اور سوسن کے پھول فضا کو معطر کر رہے تھے اور گہرے نیلے آسمان پر پھیلے ہوئے تاروں کی روشن آنکھیں چمک رہی تھیں۔ انینا نے اپنی بہو کے خوبصورت چہرے سے نظریں ہٹائے بغیر اپنی گفتگو جاری رکھی

"دونوں میرے بیٹے ہیں اور میں دونوں سے یکساں محبت رکھتی ہوں لیکن مجھے اپنے خاندان کی عزت کا سب سے زیادہ خیال ہے اور یہ عزت اب تمھارے ہاتھ ہے۔ میرے ہاں کوئی بیٹی نہیں ہوئی مگر میں تمھیں اپنی بیٹی سمجھتی ہوں۔ اسی لئے یہ کہتی ہوں۔ روبرٹو کو تم سے محبت ہے اور میرے خیال میں وہ تم کو اسی دن سے اپنے شاعرانہ طریقے پر چاہتا ہے جس دن تم نے اس کو اپنے لئے پسند کیا تھا لیکن ریمو کو بھی تم سے محبت ہے۔ وہ شاعرانہ فطرت نہیں رکھتا اس کے جذبات عظیم نہیں ہوتے مگر وہ سچا ہے اور نیک ہے اگر ـــــ خدا نہ کرے ـــــ تم بے وفا ثابت ہوئیں تو یہ اس کے لئے مہلک ثابت ہوگا کیونکہ خاموش طبیعتیں جب بھڑک جائیں تو خطرناک صورت اختیار کر لیتی ہیں۔ ازابل! میری بچی! میں التجا کرتی ہوں، ہماری جنت کو دوزخ نہ کر دینا۔"

بہو رونے لگی، پھر سر اٹھا کر اس نے کہا "مجھے نہیں معلوم میں کیا کروں ماں؟ اُس نے مجھ سے کہا ہے کہ آج رات کو پہاڑی کے پیچھے اس سے ملوں۔ مجھ میں انکار کرنے کی ہمت نہیں، خدا جانے وہ مجھ سے کیا کہے؟"

"پہاڑی کے پیچھے؟"

"ہاں! کھانے کے بعد! یہ پہلا موقع ہے کہ اُس نے مجھ سے ملنے کے لئے کہا ہے۔ آپ کو معلوم ہے آج شب ساحل پر الاؤ کے گرد ناچ ہوگا اور اس نے خواہش کی ہے کہ جب دوسرے لوگ رقص میں مصروف ہوں، میں پہاڑی کے پیچھے اس سے ملوں۔"

"تو ـــــ تم جاؤ گی تو نہیں؟"

"...... یہ تو دھوکا ہے کہ اس کو وہاں اپنا منتظر رکھوں۔"

"نہیں۔ پہاڑی کے پیچھے کوئی نہ کوئی اس سے جا کر مل لے گا ـــــ اس کی ماں!"

"لیکن آپ کیا کر سکتی ہیں......؟"

"تم فکر نہ کرو بیٹی! میں معاملات یکسو کر دوں گی۔"

(۵)

ماہی گیر اور اُن کی عورتیں شام کے کھانے کے بعد لیسا ڈاپال میرا کی ہموار ریت پر ناچنے کے لئے جمع ہوئیں۔ کنارِ سمندر پر الاؤ کے گرد جس میں ناشپاتی کی سوکھی ہوئی لکڑیوں کے شعلے فروزاں تھے، جشن منایا جا رہا تھا اور اس میں ریمو، انینا، ازابل اور روبرٹو بھی شریک ہوئے۔

بانسریوں اور جیلے کی دیہاتی نغموں کی صدائیں فضا میں گونج رہی تھیں۔ نوجوان مرد اور عورتیں خوش و خرم رقص میں مصروف تھے۔ ایک طرف بڑے بوڑھے بیٹھے باتیں کر رہے تھے اور اُن میں شراب کا دور چل رہا تھا۔

جب رات کافی جا چکی تو روبرٹو خاموشی سے پہاڑی کے پیچھے چلا گیا۔ انیتا بھی اُس کے پیچھے پیچھے اس طرح چلی کہ کوئی اُسے دیکھ نہ سکا۔ اس کا دل غم و اندوہ سے بیٹھا جا رہا تھا۔

روبرٹو نے پہاڑی کے پیچھے ایک عورت کا سایہ اپنی طرف آتے ہوئے دیکھا۔ اُسے شبہ تک نہ تھا کہ ازابل کے سوا کوئی اور ہو بھی سکتا ہے چنانچہ اُس نے ہولے سے مگر دل گیر آواز میں کہا "پیاری! اب میں ضبط نہیں کر سکتا۔ مجھے اپنے دل کا حال تمہیں بتا ہی دینا چاہیے۔"

اُس نے عورت کی طرف غور سے دیکھا۔ وہ بغیر کچھ بولے اس کے قریب آ رہی تھی اور یکبارگی وہ چیخا۔ "ماں!! تم یہاں کیا کر رہی ہو؟"

"میں بھی تم سے یہی سوال کرتی روبرٹو اگر مجھے معلوم ہے تم یہاں کیوں آئے ہو۔"

"کیا تم جانتی ہو......؟"

"ہاں! مجھے سب معلوم ہے۔"

ہر طرف چھائے ہوئے سکوت کو سمندر کے شیون نے توڑا گویا اُس نے ماں اور بیٹے کے غمگین دلوں کی ہم آہنگی کی۔ رات تاریک ہونے لگی اور گہرے بادل چاروں طرف گھِر آئے۔

"روبرٹو!" روبرٹو کی ماں نے آخر کار کہنا شروع کیا "تم نے ازابل سے یہاں آنے کی درخواست کی تھی تاکہ تم اس سے اظہارِ محبت کرو —— ازابل سے جو تمہارے بھائی کی بیوی ہے۔"

"لیکن اُسے میری بیوی ہونا چاہیے تھا۔ بچپن میں وہ میری محبوبہ تھی، میری نامزد ہو چکی تھی، جب میں اس کی خاطر وطن سے باہر مارا مارا پھرا، ریمو نے مجھے اس سے محروم کر دیا۔"

انیتا نے اپنے بیٹے پر نظریں جمادیں اور جب وہ جذبات سے مغلوب ہو کر بات ختم کر چکا تو وہ آہستہ سے بولی "میرے بیٹے! تمہیں اب یہاں نہیں ٹھہرنا چاہیے۔ اپنے خاندان کی عزت کا خیال کرو۔ میں نے قسم کھائی ہے اور اپنی بچی سے وعدہ کیا ہے کہ ہمارے گھر کا سکون اور عزت برقرار رہے گی۔ تم کل صبح پو پھٹتے ہی یہاں سے چلے جانا اور اُس وقت تک واپسی کا قصد نہ کرنا جب تک تم میرے پاس اپنی دُلہن نہ لے آؤ، جو میری دوسری بیٹی ہو گی۔"

"یہ نہیں ہو سکتا۔"

"تمہاری ماں تمہیں حکم دے رہی ہے!!! میں تمہارے دوستوں اور ریمو سے کہہ دوں گی کہ تم یہاں بڑے بے چین تھے۔ ممکن ہے وہ اس پر ہنسیں لیکن یہ اس سے بہتر ہے کہ وہ تم پر اس گھر کی عزت برباد کرنے کے جرم میں لعنت ملامت کریں۔ تم صبح چلے جاؤ گے نا؟"

"ہاں...... میں چلا جاؤں گا ماں!"

وہ دونوں خاموشی سے واپس آ گئے، جہاں لوگ الاؤ کے گرد ناچ رہے تھے۔ پہاڑی کے سائے ہی میں انیتا نے روبرٹو کی گردن کے گرد اپنے ہاتھ حمائل کر کے اُسے پیار کیا۔

لو پھوٹ رہی تھی اور ماہی گیر اپنی کشتیاں کھول رہے تھے۔

"ابھی سے مچھلیاں پکڑنے جا رہے ہو؟" روبرٹو نے پوچھا۔

"ہاں!" اس کا بھائی بولا۔ "ہوا موافق ہے اس لئے آج بہت مال ہاتھ آئے گا۔"

"ریمو! ایک کام کرو گے؟ مجھے اپنا بچپن یاد آرہا ہے، ذرا اپنی کشتی دے دو، تم دوسروں کے ساتھ چلے جاؤ۔ دیکھوں میں اکیلا کتنی پکڑ سکتا ہوں۔"

سب مچھیروں نے تالیاں بجائیں اور چیخ کر کہنے لگے۔ "لیسا کے ماہی گیر کی عمر دراز ہو۔"

اُس نے اپنی ماں کے ہاتھ کو بوسہ دیا اور دعا کے لئے سرنگوں ہوا۔ پھر اُس نے اپنی بھاوج ازابل کے آگے سر جھکا دیا اور اس کی طرف بہت دیر تک دیکھا کیا۔ لیکن ازابل نظریں نہ ملا سکی۔

سب مچھیروں کے جانے کے بعد روبرٹو اپنے بھائی کی کشتی میں تنہا گیا۔

لڑکیاں اب بھی ساحل پر مچھیروں کے گیت گا رہی تھیں۔ ازابل اُن سب سے الگ ایک چٹان پر بیٹھی کشتیوں کی طرف دیکھ رہی تھی۔ انینا بھی اُس کے پاس تھی اور اُس کا ایک ہاتھ ازابل کی کمر کے گرد تھا۔ وہ دونوں چپکے چپکے رو رہی تھیں۔ صبح ہو گئی تو ماں ازابل کے ساتھ جھونپڑی میں جانے کے لئے کھڑی ہوئی۔

دور ـــــ بہت دور سمندر میں کسی کے گانے کی آواز آرہی تھی جیسے کوئی دردو غم کا مارا الوداع کہہ رہا ہو۔ انینا کا رنگ زرد پڑ گیا اور اُس نے سرگوشی کے لہجے میں کہا۔ "یہ آواز تو روبرٹو کی ہے۔"

ایک روز آواز سُنائی دی جیسے کوئی خوش و خرم ماہی گیر مسرت کا گیت گا رہا ہو۔ انینا نے ازابل کو اپنے سینے سے چمٹا لیا اور مسکراتے ہوئے بولی۔ "یہ آواز ریمو کی ہے۔ سمجھ لو کہ ہر طرح خیریت ہے۔"

سب لوگ ساحلِ سمندر سے چلے گئے اور ازابل نے اپنی جھونپڑی میں داخل ہونے سے پیشتر ایک آخری نظر سمندر پر ڈالی ـــــ دفعتاً وہ چیخی۔ "یہ روبرٹو کی کشتی ہے۔ دیکھو، دیکھو، وہ واپس آگیا ہے۔"

کشتی کنارے آلگی لیکن آہ! وہ خالی تھی اور موجوں کے رحم پر تیر رہی تھی۔ جب تک پریشان اور گھبرائی ہوئی عورتیں ساحل تک پہنچیں ایک دوسری کشتی تیزی سے وہاں آگئی جو لوگ اس میں سے برآمد ہوئے وہ نعش اُٹھائے ہوئے تھے۔ ماہی گیروں نے لاش کو اُن دونوں کے قدموں میں رکھ دیا اور وہ دونوں اس پر گر پڑیں۔

غمزدہ ماں نے اپنے ہاتھ آسمان کی طرف اُٹھائے۔

"اے مسیح! مجھے معاف کر دے!" اس نے دردناک آواز میں کہا "میرے پیارے بچے روبرٹو نے میری خاطر اپنی جان دے دی ـــــ میری خاطر! اُس جگہ جہاں وہ مکان تعمیر کرنا چاہتا تھا ہم اُس کی قبر بنائیں گے۔"

دور ـــــ بہت دور ـــــ ریمو کی آواز سُنائی دی جو مسرت کے گیت گا رہا تھا۔

 ـــــ جولیو سیزر میفاڈد

خوابِ گُریزپا

افراد

سیلچن ــــــــ ایک پہاڑی لڑکی؛
لیمنڈ ــــــــ ایک پہاڑ پر چڑھنے والا؛
فلزین ــــــــ ایک رہ نما؛

افرادِ خواب

عظیم
بقر
شراب
(پہاڑوں کے نام)

موگرا
گلاب
نیلوفر
گلِ اشرفی
(پھولوں کے نام)

خواب میں چند کردار

پروانے ــــــــ
جھلملیاں ــــــــ
موت جو سونے میں آئے
موت جو ڈوبنے سے آئے

پھول ــــــــ
بگولے ــــــــ
نیند کی مختلف شکلیں
گڑیا ــــــــ

پہلا منظر

اگست کی ایک شام ۔ غروبِ آفتاب کے بعد، منظر پہاڑ کی ایک جھونپڑی کے ایک کمرے پر مشتمل ہے جس میں صرف ایک

دیوار گیری اور دریچے سے بنی ہوئی ایک نیچی اور چوڑی بیٹھنے کی جگہ ہے۔ اس دریچے میں سے چاند کی روشنی میں جو غروبِ آفتاب کے رنگوں کو سمیں کر رہی ہے، پہاڑوں کی تین چوٹیاں نظر آ رہی ہیں۔ ایک چراغ جل رہا ہے سیلچن ایک اٹھارہ سالہ پہاڑی لڑکی کوئی دیہاتی گیت گنگنا رہی ہے اور شوربے کے تازہ دُھلے ہوئے پیالے اور گلاس الماری میں رکھ رہی ہے۔ وہ ایک خوشنما لباس زیب تن کئے ہوئے ہے۔ اور اس کی دونوں گُتھی چوٹیاں سَر کے گرد لپٹی ہوئی ہیں۔ آخری برتن رکھتے وقت دستک کی آواز آتی ہے اور لیمنڈ بیرونی دروازہ کھولتا ہے۔ وہ نوجوان اور خوش شکل ہے اور پہاڑ پر چڑھنے کے کپڑوں میں ملبوس ہے۔ اُس کے ہاتھ میں برف توڑنے کی کلہاڑی اور ایک تھیلہ وغیرہ ہے۔

لیمنڈ۔ تسلیم۔
سیلچن۔ تسلیم، جناب عالی۔
لیمنڈ۔ میرا نام لیمنڈ ہے، شاید مجھے بہت دیر ہو گئی۔
سیلچن۔ کیا آپ یہاں سونا چاہتے ہیں؟
لیمنڈ۔ اگر آپ کرم فرمائیں۔
سیلچن۔ افسوس ہے ــــــ تمام بستر ٹرک چکے ہیں۔ خیر ذرا ٹھیریئے۔
لیمنڈ۔ میں علی الصباح جبلِ عظیم پر چڑھنے کے ارادے سے آیا ہوں۔
سیلچن۔ (خوف زدہ ہو کر) جبلِ عظیم! مگر وہاں چڑھنا ناممکن ہے۔
لیمنڈ۔ (ہوا کرے) میں کوشش تو کروں گا۔
سیلچن۔ (مگر اس سے پہلے) جبلِ شراب اور جبلِ بقر بھی تو ہیں۔
لیمنڈ۔ اُن پر میں چڑھ چکا ہوں۔
سیلچن۔ مگر جبلِ عظیم پر چڑھنا بے حد خطرناک ہے ـــ شاید ـــ موت کو دعوت دینا ہے۔
لیمنڈ۔ لاحول ولا! انسان کو کوشش تو کرنی چاہیئے۔
سیلچن۔ ابا کے پاؤں میں چوٹ لگی ہوئی ہے اور رہنما اس وقت صرف فیلز بن ہے۔
لیمنڈ۔ وہ مشہورِ عالم فیلز بن؟
سیلچن۔ (گردن سے اثبات کا اشارہ کرتی ہے۔ اس کی آنکھوں میں اس کے لئے تعریف کی جھلک ہے) کیا آپ وہی لیمنڈ صاحب ہیں جو اس سال ہمارے دوسرے چھوٹے پہاڑوں پر چڑھ چکے ہیں؟
لیمنڈ۔ ہاں سوائے اس جبلِ عظیم کے۔
سیلچن۔ ہم نے آپ کا نام سُنا ہے۔ کیا آپ ایک دن انتظار نہیں کر سکتے کہ ابا کا پاؤں اچھا ہو جائے۔
لیمنڈ۔ جی نہیں، مجھے کل تک گھر واپس پہنچ جانا چاہیئے۔
سیلچن۔ تو جناب عالی بڑی جلدی میں ہیں؟
لیمنڈ۔ (اُس کو غور سے دیکھتے ہوئے) کیا کیا جائے!
سیلچن۔ کیا آپ کسی بڑے شہر کے باشندے ہیں؟ بہت ہی بڑے شہر کے؟
لیمنڈ۔ ہاں، وہاں چھ لاکھ کی آبادی ہے۔
سیلچن۔ اوہ! (کچھ دیر کے بعد) میں کورٹینا دو دفعہ جا چکی ہوں۔

لیمنڈ۔ کیا تم تمام سال یہیں رہتی ہو؟
سیلچن۔ سردیوں میں وادی میں چلے جاتے ہیں۔
لیمنڈ۔ کیا تمھیں دُنیا دیکھنے کی تمنا نہیں ہوتی؟
سیلچن۔ کبھی کبھی (دروازے کے پاس جاکر آہستہ سے پکارتی ہے) فلزبین! (پھر ایک دوسرے دروازے کی طرف اشارہ کرکے آہستہ سے) وہاں سات جرمن سو رہے ہیں۔
لیمنڈ۔ او، خُدا!۔
سیلچن۔ ذرا ہولے! وہ یہاں طلوعِ آفتاب کی سیر کرنے آئے ہیں۔ (لیمنڈ کی جیب سے ایک کتاب گر پڑتی ہے۔ وہ اُسے اُٹھالیتی ہے) میں نے بہت سی کتابیں پڑھی ہیں۔
لیمنڈ۔ یہ ایک بڑے شاعر کا دیوان ہے۔ کیا تم یہاں، ان پہاڑوں میں گھری ہوئی، کبھی شاعری نہیں کرتیں؟ اور کیا تمھیں یہاں سہانے خواب نہیں دکھائی دیتے؟۔
سیلچن۔ (گردن سے نفی میں جواب دیتی ہوئی) دیکھو آج چاند پورا ہے۔
(دونوں دریچے کے پاس کھڑے چاند دیکھ رہے ہیں۔ ایک توانا، خاموش اور دُبلا پتلا شخص اندر داخل ہوتا ہے۔)
سیلچن۔ فلزبین!
فلزبین۔ کیا ان صاحب کو میری ضرورت ہے؟
سیلچن۔ (خوف زدہ سی) ان کا کل صبح جبلِ عظیم کا ارادہ ہے (اس کے کان میں) یہ وہی مشہور شہری ہیں۔
فلزبین۔ جبلِ عظیم پر چڑھنا ناممکن ہے۔
لیمنڈ۔ یہ آپ کہہ رہے ہیں! اور آپ ہی وہ شہرۂ آفاق فلزبین ہیں؟
فلزبین (تندی سے) ہم علی الصباح روانہ ہو جائیں گے۔
سیلچن۔ یہ عرصۂ دراز کے بعد پہلا موقع ہے!
لیمنڈ۔ (دریچے والی جگہ پر اپنا سامان رکھتے ہوئے) کیا یہاں میرے سونے کا انتظام ہو سکتا ہے؟
سیلچن۔ میں ذرا دیکھ لوں۔
فلزبین۔ (الماری میں سے کمبل نکال کر دریچے والی جگہ پر بچھا دیتا ہے) یہاں!۔
(اس کے باہر جاتے ہی سیلچن اندر آتی ہے)
سیلچن۔ ایک بستر ابھی خالی ہے۔ یہ جگہ تو آپ کے لئے بہت سخت تکلیف دہ رہے گی۔
لیمنڈ۔ شکریہ! نہیں یہ ٹھیک ہے
سیلچن۔ میری خاطر سہی!
لیمنڈ۔ تمہارا نام کیا ہے؟
سیلچن۔ سیلچن۔
لیمنڈ۔ ننھی روح، اس کا مطلب ہے —— ہرنا؟ تمہیں خوش کرنے کے لئے میں ان سات حضرات کے ساتھ سو جاؤں گا۔
(وہ جانے لگتا ہے)
سیلچن۔ کیا یہ شہر (جو دنیا کہلاتے ہیں اور) جہاں سے تم آئے ہو، بہت اچھے ہیں؟
لیمنڈ۔ جب میں وہاں ہوں تو یہاں ہوتا ہوں اور جب یہاں ہوں تو وہاں ہوتا ہوں۔
سیلچن۔ یہ تو میری طرح ہے —— لیکن میں ہمیشہ یہیں رہتی ہوں!۔
لیمنڈ۔ ہوں! شہروں میں تم جیسا کوئی نہیں۔
سیلچن۔ ایک شخص دو جگہ نہیں ہو سکتا۔ (یکبارگی)

شہروں میں تھیٹر ہوتے ہیں جسین وجمیل صناعی
کے نمونے ہوتے ہیں اور ــــ رقص ــــ
گرجا ــــ ریلیں ــــ اور وہ تمام چیزیں
جن کا کتابوں میں تذکرہ ہوتا ہے ــــ اور ــــ

لیمنڈ۔ مصائب۔

سیلچن۔ لیکن زندگی بھی تو وہیں ہے۔

لیمنڈ۔ اور موت بھی تو۔

سیلچن۔ کل چڑھائی ختم کرنے کے بعد ــــ کیا تم واپس نہیں آؤگے؟

لیمنڈ۔ نہیں۔

سیلچن۔ تمھارے پاس تمام دنیا ہے۔ اور میرے پاس کچھ بھی نہیں۔

لیمنڈ۔ سوائے فلزبین اور پہاڑوں کے۔

سیلچن۔ صرف روٹی ہی کھالینا تو اچھا نہیں ہے۔

لیمنڈ۔ (اس کو تکتے ہوئے) میں تو تمھیں کھالینا چاہتا ہوں۔

سیلچن۔ مگر میں لذیذ نہیں ہوں۔ مجھ میں بہت سی خامیاں ہیں۔

لیمنڈ۔ اچھا۔ میں واپس آؤں گا۔

سیلچن۔ پھر کوئی دشوار گزار پہاڑ تو چڑھنے باقی نہیں رہیں گے۔ اور اگر یہ سرور آگئیں نہ ہو تو تم پروا بھی کب کرتے ہو؟

لیمنڈ۔ کتنی سمجھ دار ہو تم!

سیلچن۔ نہیں، میں سمجھ دار نہیں ہوں۔ یہاں ہر وقت کا رہنا دو بھر معلوم ہوتا ہے ــــ وہاں بڑی دنیا میں کیا تم (مجھے) یاد رکھوگے؟

لیمنڈ۔ (اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے) اس بڑی دنیا میں کوئی شے اس جیسی حسین اور شیریں نہیں۔

سیلچن۔ لیکن وہ بڑی دنیا بذات خود جو ہے۔

لیمنڈ۔ کیا میں شب بخیر کہنے کے لئے تمھیں پیار کرسکتا ہوں؟

(وہ اپنا چہرہ آگے کردیتی ہے اور وہ اس کے رخسار پر پیار کرتا ہے اور دفعتاً اس کے لبوں پر بھی۔ اور جونہی وہ پیچھے ہٹتی ہے)

لیمنڈ۔ مجھے افسوس ہے۔

سیلچن۔ کوئی ہرج نہیں۔

لیمنڈ۔ (شمع لیتے ہوئے) خواب شیریں! شب بخیر!

سیلچن۔ (ہولے سے) شب بخیر۔

فلزبین۔ (باہر سے آتے ہوئے اور انھیں دیکھ کر) ٹھنڈ ہوگئی ہے ــــ بڑا لطف رہے گا۔

(لیمنڈ، پیچھے مڑ کر دیکھتے ہوئے چلا جاتا ہے۔ فلزبین اس کے جانے کا انتظار کرتا ہے)

سیلچن۔ (دریچے کی جگہ پر بیٹھتے ہوئے) میں نے سوچا یہ جگہ اس کے لئے تکلیف دہ رہے گی۔

(وہ اس کے پاس جاتا ہے اور ایک منٹ خاموش کھڑا رہتا ہے۔ پھر جھک کر اسے اس طرح پیار کرتا ہے گویا بھوکا ہے)

سیلچن۔ کیا تو بھوکا ہے؟

(وہ کوئی جواب نہیں دیتا اور چراغ بجھا کر ایک اندرونی کمرے میں چلا جاتا ہے۔ سیلچن دریچے میں سے، چاندنی میں نہائی

ہوئی چوٹیوں کو بیٹھی دیکھتی رہتی ہے۔ پھر
کمبل اوڑھ کر وہیں دریچے والی جگہ پر
بمشکل لیٹ جاتی ہے)

سیلچن۔ (سوئی ہوئی آواز میں) انھوں نے مجھے پیار
کیا ہے —— دونوں نے۔
(وہ سو جاتی ہے)
منظر پر تاریکی چھا جاتی ہے۔

دوسرا منظر

(منظر صبح کے تڑکے کی طرح آہستہ آہستہ
روشن ہو رہا ہے۔ سیلچن دریچے والی جگہ
پر اب بھی لیٹی ہوئی ہے۔ وہ اپنا چہرہ
اور ہاتھ کمبل میں سے نکال کر اٹھ بیٹھتی
ہے اور گہری نیند کی بجائے رِدائے خواب
اسے ملفوف کر لیتی ہے۔ جھونپڑی کی
دیوار غائب ہو چکی ہے۔ سیلچن اور کہرے
ڈھکے ہوئے سیاہ پہاڑوں کے درمیان
سوائے تھوڑی سی تاریک فضا کے
اور کچھ حائل نہیں ہے۔ سیلچن کے پاس
ہی اس اندھیرے کے سرے پر، جو اس
کو پہاڑوں سے جدا کر رہا ہے، چار
"پھول" موگرا، گلاب، نیلوفر اور گلِ
اشرفی اُسے تاریکی میں سے جھانک رہے
ہیں۔ وہ اپنے سروں پر بے شمار پھولوں
کے تاج پہنے ہوئے ہیں جن پر شبنم کے
قطرے جمے ہوئے ہیں اور وہ ننھی ننھی
گھنٹیوں کی طرح بج رہے ہیں)

سیلچن۔ ارے! ان کے تو چہرے ہیں!
(چوٹیوں کے چاروں طرف صرف سیاہی
مائل نیلا آسمان نظر آتا ہے۔ چوٹیاں چمک
اٹھی ہیں)

موگرا۔ (دھیمی آواز میں) کیا تم؟ کیا تم؟ کیا تم؟ آہ
گلاب، نیلوفر اور گلِ اشرفی (ان کی گھنٹیاں
حسد سے بج رہی ہیں) او، او۔ او۔
(دفعتاً جبلِ بقر کی چوٹی ایسی آواز میں
بولنے لگتی ہے جو غیر مانوس ہے)

جبلِ بقر۔ میں پہاڑ ہوں اور اپنی گایوں اور بھیڑوں
میں رہتا ہوں۔ میں خاموش ہوں اور ایک
ہی سی آواز ہوں۔ میں خوف اور کوہستانی ہوا
ہوں، میری آنکھوں میں عمدہ چراگاہ اور بے پناہ
آرام دیکھو اور صرف مجھ ہی سے محبت کرو۔

سیلچن۔ (حیرت زدہ) جبلِ بقر! وہ ترجمانی کر رہا ہے ——
فلز بین اور پہاڑوں کی۔ یہ میرا نصف قلب ہے۔
(پھول خوش خوش ہنسنے لگتے ہیں)

جبلِ بقر۔ میں ابدی پہاڑیوں کو اُگاتا ہوں ——
میں کوہستانی برف پیتا ہوں۔ میری آنکھوں کا
رنگ دہکتی ہوئی شراب کا سا ہے۔ اور اُن ہی
میں اُداسی پناہ گزیں ہوتی ہے۔ گایوں کی آوازیں،
ہوا کی سرسراہٹ، چٹانوں کے گرنے کا شور،
سیلاب کا ترنم —— (بس) ان کے علاوہ
مجھے کوئی اور بات نہیں آتی —— خیالات
سادے، خون گرم، طاقت بے حد ——
گردش کا چغہ۔ (یہ میرا سراپا ہے)

سیلچن۔ ہاں، ہاں، مجھے اس کی ضرورت ہے۔ وہ

بہت طاقتور ہے!
جبلِ بقر۔ ننھی رُوح! میرے پاس آ! مجھ سے محبت
کر اور میرے ساتھ تاروں کی چھاؤں میں رہ!
سیلچن۔ (دبی آواز میں) شاید ایسا نہ ہو سکے!
(یکبارگی جبلِ شراب کی چوٹی ایک نوجوان
کی سی آواز میں بولنے لگتی ہے)
جبلِ شراب۔ میں وہ چھلاوا ہوں ——— جو
بازاروں میں ناچتا پھرتا ہے! میں قمری ہوں جو
شاہِ بلوط کے سائے تلے کوکتی ہے (دنیا میں)
کسی شے کو قیام نہیں لیکن میں اپنے ہزاروں
دیوتاؤں کو اپنی خوشبو پیش کئے جاتا ہوں۔ براق
سے ایوان اور جذبات کو برانگیختہ کرنے والے
خیابان میرے مسکن ہیں۔ سینکڑوں آدمیوں
کی زندگی میری ہے ——— اور صبح کے تڑکے
گلیوں کی روشنیاں بھی۔ (رسان سے) میری
اُلفتیں ہزاروں ہیں لیکن ان میں سے دائمی
ایک بھی نہیں کیونکہ میں تمہارے اُن پھولوں
سے بھی زیادہ سُبک رو ہوں جو دھوپ میں
کھیلتے مانتے ہیں۔
(پھول جن کی گھنٹیاں خوف میں بج رہی
ہیں، چیخنے لگتے ہیں "ہم اُنھیں خوب
جانتے ہیں!")
جبلِ شراب۔ میں مسرت کی تخلیق اور موت کی
آوازیں سُنتا ہوں اور پتوں کی گھڑگھڑاہٹ
بھی۔ میں لوگوں کی چیخ پکار سُنتا ہوں اور خاموش
رات میں محبت سے لبریز بوسوں کی آوازیں
بھی۔ میرے بغیر اے ننھی رُوح! تم بھوکی رہو گی

اور مرجاؤ گی۔
سیلچن۔ یہ اُن صاحب (لیمنٹ) کی اور شہری دُنیا کی
ترجمانی کر رہا ہے۔ میرا دل بیٹھا جاتا ہے۔
جبلِ شراب۔ میرے خیالات کا شمار تمہارے سبزہ زار
میں لہلہانے والے پھولوں سے کہیں زیادہ ہے
اور اُن کی پرواز ہوا میں اُڑنے والے عقابوں سے
زیادہ تیز۔ میں بلند حوصلگی کی شراب اور حقیقت
کی دوا پیتا ہوں اور اس لئے میں کبھی کاہل نہیں
ہوتا۔
سیلچن۔ مجھے شبہ ہے۔
جبلِ شراب۔ مجھ سے محبت کر اے ننھی رُوح! میں
زندگی کو پچاسوں رنگوں سے مزیّن کرتا ہوں۔
میں ہزاروں چیزیں بناتا ہوں! ——— میں تمہارے
قلب کا طواف کروں گا۔
سیلچن۔ وہ شہد کی طرح میٹھا ہے!
(پھول اپنی گھنٹیاں حسد سے بجانے
لگتے ہیں اور چیختے ہیں "تلخ بھی تو ہے!
تلخ!")
جبلِ بقر۔ میرے پاس رہو، سیلچن! میں تمھیں شفاف
ہوا سے بیدار کروں گا۔
(پھول کھکھلا کر ہنستے ہیں)
جبلِ شراب۔ میرے پاس آؤ سیلچن! میرا رنگ برنگا
پنکھا تمھیں بیدار کرے گا۔
(پھول ماتم کرتے ہیں)
سیلچن۔ (رنج میں) میرا دل! آہ! یہ ٹوٹے جاتا ہے۔
جبلِ شراب۔ اے ننھی رُوح، میرے ساتھ رہ کر
تم بازاروں کی سیر کرو گی اور بہت سے رازوں

سے واقف ہو جاؤں گی۔ ہم دونوں، ہاتھ میں
ہاتھ ڈال کر پنکھڑیوں کی طرح اُڑتے پھریں گے۔
گُلِ اشرفی۔ میری پنکھڑیاں زیادہ تیز اُڑتی ہیں!
جبلِ شراب۔ میں تمھیں سمندر کی سیر کراؤں گا۔
نیلوفر۔ میری نیلاہٹ زیادہ گہری ہے!
جبلِ شراب۔ میں تم پر شرم و حجاب کی بارش کردوں گا۔
گلاب۔ میرا حجاب زیادہ احمریں ہے۔
جبلِ شراب۔ ننھی روح، سُنو! میرے جواہرات!
ریشم! مخمل!
موگرا۔ میں مخمل سے زیادہ نرم و نازک ہوں!
جبلِ شراب (فخریہ) میرا پُر اسرار لباس!
پھول۔ (افسوس کرتے ہوئے) ہاں یہ ہمارے
پاس نہیں۔
سیلچن۔ اس کے پاس سب کچھ ہے۔
جبلِ بقر۔ یہ سیمیں بازو والے سحاب میرے ہیں
اور یہ دھوپ میں تپنے والی چٹانیں بھی۔ میرے
شبنم کے قطرے موتیوں سے زیادہ سرد ہیں۔
میرے برفانی سانس اور لطیف گھاس سے
دُور رہ کر، اے ننھی روح، تم پژمردہ ہو
جاؤ گی۔
جبلِ شراب۔ سیاہ لونگ میری خوشبو ہے!
سیلچن۔ (گھبرا کر) آہ!
جبلِ بقر۔ میں تمھیں کبھی اپنے سے جُدا نہ کروں گا۔
جبلِ شراب۔ میں تمھیں سینکڑوں مرتبہ چھوڑ دوں گا
اور سینکڑوں مرتبہ واپس آکر تمھیں پیار کروں گا۔
سیلچن۔ (سرگوشی میں) میرے قلب کی تسکین!
جبلِ بقر۔ میرے ساتھ رہ کر تم کوہستانی نرم و گرم
علف زار میں آرام کرو گی۔
(پھول خوش خوش ہنستے ہیں)
جبلِ شراب۔ میرے ساتھ رہ کر تم قمری کے پروں کے
ملائم بچھونے پر محوِ استراحت ہو گی۔
(پھول کراہتے ہیں)
جبلِ شراب۔ میں تمھیں پُرانی شراب دوں گا۔
جبلِ بقر۔ میں تمھیں تازہ دُودھ پلاؤں گا۔
جبلِ شراب۔ میرا گیت سُنو!
(دُور سے سِتار کی آواز آتی ہے)
سیلچن۔ (اپنا دل پکڑ کر) میرا دل ——— آہ! مجھ
سے جُدا ہو رہا ہے!
(بہت دُور سے کسی چرواہے کی بانسری
کا نغمہ لہراتا ہوا آتا ہے)
سیلچن۔ (کانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے) بانسری کا نغمہ،
آہ!
جبلِ بقر۔ میرے ہی ساتھ رہو سیلچن!
جبلِ شراب۔ میرے پاس آؤ سیلچن!
جبلِ بقر۔ میں تجھے ایقان دیتا ہوں۔
جبلِ شراب۔ میں تجھے امرِ اتفاقی دیتا ہوں۔
جبلِ بقر۔ میں تجھے سکون دیتا ہوں۔
جبلِ شراب۔ میں تجھے تلوّن دیتا ہوں۔
جبلِ بقر۔ میں تجھے خاموشی دیتا ہوں۔
جبلِ شراب۔ میں تجھے آواز دیتا ہوں۔
جبلِ بقر۔ میں تجھے واحد محبّت دیتا ہوں۔
جبلِ شراب۔ میں تجھے کئی محبتیں دیتا ہوں۔
سیلچن (گویا الفاظ اس کے قلب سے زبردستی چھینے
گئے ہیں ——) دونوں، دونوں سے ———

میں محبت کروں گی۔

(یکبارگی جبلِ عظیم کی چوٹی مخاطب ہوتی ہے)

جبلِ عظیم۔ تو دونوں ہی سے محبت کرے گی اے ننھی روح! تو پہاڑوں پر "خاموشی" کے ساتھ آرام کرے گی اور شہروں میں "علم" کے ساتھ محوِ رقص ہوگی۔ دونوں تجھ پر قابض رہیں گے! پہاڑوں پر چمکنے والے چاند اور سورج تجھے جلادیں گے، اور اے ننھے پروانے! شہر کے چراغ تیرے پروں کو جھلس دیں گے۔ ان میں سے ہر ایک تجھ کو ایک دُنیا معلوم ہوگا اور اپنی قبر بھی! تیرا دل اُس پر کی مانند ہے جسے ایک منہ پھونک مار کر اُڑا دے، اور پھر دوسرا۔ لیکن خائف نہ ہو! کیونکہ انسان کی زندگی باری باری بہت سی محبتوں کے لئے ہے۔ یہ ایک چھوٹے سے ڈونگے کی طرح ہے جو (ساحل پر) لنگر انداز ہو اور پھر نیلے سمندر میں تیرنے لگے۔ یہ ایک نغمہ ہے جو سکوت میں اُلجھا ہوا ہو اور پھر سرگوشی کرنے لگے۔ یہ ایک نوزائیدہ بچہ ہے، کچھ جری، کچھ غافل۔ اس میں "نور" "موسیقی" ہے۔ "تبدیلی" ہے۔ "شکوت" ہے "اتفاق" ہے اور "یقین" ہے۔ "واحد" ہے اور "بے شمار" ہے۔ بھٹکتا رہ۔۔۔ اے حسین شعلے! اس کوشش میں کہ تو تمام دُنیا کو خاکستر کر دے! پر آخر تو آئے گی میرے ہی پاس اے ننھی روح!

(مدہوش سی سیلچن اس منظر اور آواز کو آغوش میں لے لینے کے لئے اپنے بازو پھیلا دیتی ہے۔ مگر سب کچھ تاریک

نیند میں آہستہ آہستہ غائب ہو جاتا ہے۔)

تیسرا منظر

(تاریک منظرات کے آسمان تلے پھر چمک اُٹھا ہے۔ سیلچن کھڑی ہوئی ہے، اُس کے ہاتھ ایک شہر کے دروازے کی طرف جس میں سے روشنی کی ایک نہر بہہ رہی ہے، پھیلے ہوئے ہیں۔ دروازے کے ایک جانب ایک نوجوان کی مورت کھڑی ہے جس کے گرد روشنی کا ہالہ ہے، دوسری جانب سائے میں ملفوف ایک مجسمہ ہے۔ دروازے کے اوپر بیچ میں پتھر کا بنا ہوا ایک عجیب الخلقت جانور کا سر ہے جو دھندلا نظر آرہا ہے۔)

جبلِ شراب کا نوجوان گاتا ہے:-

"اے ننھی سی شہابی روح
جو کہر آلود نظارات میں غیر مطمئن اور
یکہ وتنہا ماری ماری پھر رہی ہے،۔۔۔
اس غضب کی سردی سے نکل آ،
میں تجھے آرام دہ اور گرم جگہ بُلا رہا ہوں۔۔۔
یہاں، جہاں میں اپنا بربط بجاتا ہوں۔۔۔
اس ماہتاب زرنگار کے نیچے"

سیلچن۔ (سرگوشی میں) کیا یہ "شہر" ہے؟۔۔۔ وہی وسیع دُنیا۔

جبلِ شراب کا نوجوان گائے جاتا ہے:-

"جیسے سُندر سہرا پروانہ
تحیر خیز فروزاں شمعوں کے گرد،
جل جانا چاہتا ہے، اسی طرح مایوس و بےچین۔

آہ! اے بے قراری قمری،
میں چاہتا ہوں کہ اس وقت جبکہ میں بربط
بجا رہا ہوں ——
تجھ میں بھی عشق کا قرمزی شعلہ بھڑک اُٹھے ——"
سیلچن۔ (دروازے کی طرف مسرت سے دیکھتے ہوئے)
وہاں گرمی اور روشنی ہے!
(جس وقت وہ بولتی ہے، دونوں جانب
سے پروانے آتے ہیں اور آپس میں مل
جُل کر ناچتے ہوئے دروازے تک چلے
جاتے ہیں اور پھر اُچھلتے کودتے سامنے
آجاتے ہیں)
سیلچن۔ (اپنے ہاتھ پھیلاتے ہوئے) یہ تو سچ مچ کے
ہیں —— ان کے پروں سے ہوا نکلتی ہے۔
(پروانے اس کے پاس سے گزر کر شہر
میں غائب ہو جاتے ہیں)
جبلِ شراب کا نوجوان گاتا ہے:۔
اے میرے گیت کے ہونٹو!
تم اس مرمریں دوشیزہ کے قلب کے پاس
جاؤ اور دل سوزی سے ان پُر اثر الفاظ
کو سرگوشی میں کہو کہ
"اے سُننے والی!
تیز پا محبت جب ایک دفعہ گزر جائے،
تو وہ دوبارہ واپس نہیں آتی!"
(سیلچن اس کی طرف دوڑتی ہے ——
لیکن اس نوجوان کے گرد جو روشنی کا ہالہ
ہے وہ مدھم ہو جاتا ہے اور وہ ایک سایہ
بن کر رہ جاتا ہے۔
دروازے میں سیاہ فرغل پہنے ہوئے
لیمنڈ کھڑا ہے)
سیلچن۔ ارے تم ہو؟
لیمنڈ۔ اپنی ننھی روح کے بغیر میں سرد اور بے جان
ہوں۔ آؤ ——،
(اس کے لئے اپنی آغوش وا کر دیتا ہے)
سیلچن۔ کیا میں محفوظ رہوں گی؟
لیمنڈ۔ حفاظت کسے کہتے ہیں؟ کیا تم اپنے پہاڑوں
میں محفوظ ہو؟
سیلچن۔ میں کہاں ہوں؟
لیمنڈ۔ شہر میں۔
(مسکراتے ہوئے وہ دروازے کی طرف
اشارہ کرتا ہے۔ بازار کی جگنو جیسی روشنیاں
رقص کرتی نظر آتی ہیں)
سیلچن۔ (سرگوشی میں) یہ کیا ہیں؟
لیمنڈ۔ روشنیاں، پیاری —— بازار کی روشنیاں.
چراغ ہیں —— زرِ حیات!
سیلچن۔ کیا یہ ہمیشہ ایسی ہی چمک دار رہتی ہیں؟
(جبلِ شراب کے نوجوان کے گرد جو ہالہ
ہے وہ دوبارہ چمک اُٹھتا ہے اور وہ اپنا
ساز بلند آہنگی کے ساتھ چھیڑتا ہے اور
جب سیلچن اس آواز کی طرف مڑتی ہے
تو اس کی دمک دھیمی پڑ جاتی ہے۔ وہ
اب پھر وہی نیلا سا سایہ ہے اور جگنوؤں
کی روشنیاں دروازے سے غائب ہو گئی
ہیں۔)
سیلچن۔ کیا وہ میرا مذاق اُڑا رہا ہے؟

لیمنڈ۔ آہ ۔

سیلچن ۔ مجھے ڈر لگتا ہے !

لیمنڈ۔ نئی باتوں سے ؟ کیا تم صرف نصف ماہتاب ہی سے لطف اندوز ہونا چاہتی ہو ؟ آہ ! اے ننھی روح کیا تم صرف اپنی بکریوں ہی میں رہو گی —— ایسی حالت میں جبکہ میں تمکو عجیب بات دکھا سکتا ہوں ؟

سیلچن ۔ کیا وہ اچھے ہیں ؟

لیمنڈ ۔ وہ سب کچھ ہیں ۔

سیلچن ۔ (دروازے کی طرف قدرے سرکتے ہوئے) شہر کس قدر عجیب وغریب اور روشن ہے ! کیا وہاں کبھی اندھیرا نہیں ہوتا —— ؟

لیمنڈ ۔ میں اپنی محبت سے اندھیرے کو تم سے دُور رکھوں گا ۔

سیلچن ۔ اوہ ! لیکن میں محبت نہیں کرتی ۔

لیمنڈ ۔ اری معصوم ! محبت کرنا ہی تو زندگی ہے —— عجوبے کی جستجو کرتے رہنا ، جب کوئی پر اُڑتا ہے تو کیا وہ ہوا سے ، جو ایک نامعلوم شے ہے ، محبت نہیں کرتا ہوتا ؟ اگر تاریکی اور روشنی بدلتی نہیں رہتیں تو کیا ہم سانس لے سکتے تھے ؟ اور جونہی وہ قریب آتی ہے ۔ محبت کرنا گویا ایک درخت پر چڑھنا ہے اور پھر چھوٹے سے سبز پھول کو دیکھتے ہوئے اُسے توڑنے کے لئے نیچے اُترآنا ! اُس کے پر ہیں ۔ یہ اُڑ گیا ہے —— تم کو پھر چڑھنا چاہئے —— یہ کانپ رہا ہے ، لیکن یہ صرف تمھارے ہاتھ کی ہوا ہی —— تم کو گھسٹنا چاہئے ، تم کو پھٹنا چاہئے ، تم کو کودنا چاہئے ، پھر بھی وہاں ہے ، یہاں نہیں —— کیونکہ سبز پھول پرندے کی طرح اُڑتا ہے اور صرف اس کے پروں کی ہوا ہی کو تم پکڑ سکو گی ۔ مگر تمھاری آنکھیں چمک رہی ہوں گی ، تمھارے رخسار دمک رہے ہوں گے ۔ تمھارے سینے کا زیروبم نمایاں ہو رہا ہوگا —— آہ ! اسے سُننے سے دل کا منظر تاریک ہو جاتا ہے ! اور جب رات ہوگی —— یہ ساکت ہو جائے گا گلِ مغیلاں کی طرح اندھیرے میں کہیں مُرجھایا ہُوا ، اور تمھارا گورا ہاتھ اس کو تلاش کرے گا لیکن تمھارا شیریں سانس اس کو کہیں دُور بہا دے گا اور تم ہرگز ہرگز اس کو نہ پکڑ سکو گی ——

ہاں ، زندگی خوبصورت ہو جائے گی (اس کی آواز ہولے ہولے ہوتے ہوتے سرگوشی بن جاتی ہے ۔ وہ اپنی آغوش وا کرتا ہے) میرے شہر میں آؤ —— آؤ ۔

سیلچن ۔ (لیمنڈ کے سینے پر ہاتھ رکھ کر) میں آتی ہوں ۔

لیمنڈ ۔ (اس کو دروازے کی طرف کھینچتے ہوئے) مجھ سے محبت کرو ۔

سیلچن ۔ میں محبت کرتی ہوں ۔

(بربط بجنے لگتا ہے ۔ وہ شہر میں چلے جاتے ہیں ۔ جبلِ شراب کا نوجوان اپنی قرمزی روشنی میں دوبارہ دکھائی دیتا ہے اور ساز کے ساتھ آہستہ آہستہ گانا شروع کرتا ہے :-

"ہوائی گھڑیاں تاریکی میں گزری جاتی ہیں ۔

میری پیاری کیا تو انھیں نہیں سن سکتی؟
نئی محبتیں پیدا ہوتی ہیں اور پرانی محبتیں فنا
ہو جاتی ہیں،
اور بو سے پینے ہوئے لبوں کو جدا ہونا پڑتا ہے۔
اے میری روح کیا تو نہیں دیکھ سکتی کہ گزرے
ہوئے سالوں کی خاکی مکھیاں ـــــ کبھی اس
پھول کے اور کبھی اس پھول کے آنسو چوستی
پھرتی ہیں۔
اور کبھی میٹھے شہد کی زرد شراب؟
(اس کی آواز عجیب و غریب اور پُرجوش
بن جاتی ہے)
اے وہ شعلے جو وقت کی بادیہ پیمائی کرتا ہے۔
دم بہ دم پستی کی طرف مائل ہونے والے!
جہاں، کالی کالی مسحور دلدل میں سے نکل کر
ہم مایوس لوگ تیری رہ نمائی میں پیچھے پیچھے جاتے
ہیں ـــــ اے آتشِ غیوروقت ہم التجا کرتے ہیں
کہ ذرا ٹھیر جا!
ادھر اندھیری ہوائیں
سنہرا خانہ بدوش مسافر کملا رہا ہے ـــــ
اور ایسا ہی محبت کے ساتھ ہوتا رہا ہے!"
(اس کے گانے کے دوران میں ہر چیز
تاریک ہو جاتی ہے سوائے اس روشنی
کے ہالے کے جو اس کے گرد ہے۔ گیت
ختم ہونے پر وہ بھی غائب ہو جاتا ہے۔
پو پھٹ رہی ہے۔ شہر کے تاریک دروازے
میں سے سرد اور سبز روشنی میں سیلچن آتی
ہے۔ وہ زرد ہے گویا اس کی زندگی گھٹ
گئی ہے۔ اس کی پھٹی آنکھیں اور چہرے
کی سفیدی سراسیمگی ظاہر کر رہی ہیں)

سیلچن۔ میرا دل مرجھا گیا ہے۔
(جیسے ہی وہ بولتی ہے دور سے گایوں
کی گھنٹیاں بجنے کی مدھم آواز آتی ہے اور
جب وہ کھڑی سنتی ہوتی ہے، شہر کے
دروازے میں لیمنڈ نظر آتا ہے)

لیمنڈ۔ ننھی روح!

سیلچن۔ تم! ہر وقت تم!

لیمنڈ۔ میرے پاس نئے عوے ہیں (سیلچن سر کو جنبش
دیتی ہے) بخدا تم مجھ سے اکتائی نہیں ہو کیونکہ
میں کبھی ایک سا نہیں رہتا۔

سیلچن۔ سنو!
(گایوں کی گھنٹیوں کی آواز پھر سنائی دیتی ہے)

لیمنڈ۔ (حسد سے) کاہل بیند کی موسیقی! تو کیا زندگی
میرے ساتھ غمگین رہی ہے؟

سیلچن۔ مجھے اس کا افسوس نہیں۔

لیمنڈ۔ آؤ۔

سیلچن۔ (اپنے سینے کی طرف اشارہ کرکے) پرند اڑتے
اڑتے تھک گیا ہے (اپنے لبوں کو چھوکر)
پھولوں میں شبنم نہیں رہی۔

لیمنڈ۔ کیا تم مجھے چھوڑ دوگی؟

سیلچن۔ دیکھو!
(صبح کے جھٹپٹے میں دروازے کے قریب
لیکن شہر سے دور، اشارہ کرتا ہوا مدھم
مجسمہ، جبلِ بقر کے چرواہے میں تبدیل
ہو گیا ہے)

لیمنڈ۔ یہ کیا ہے ؟
سیلچن۔ میرے پہاڑ!
لیمنڈ۔ وہاں کچھ نہیں (وہ اسے مضبوطی سے گرفت
میں لے لیتا ہے۔) مت جاؤ! مت جاؤ! میں
نے تمہیں اپنے شہر کے عجوبے دے دیے ہیں۔
میں تمہیں اور عجوبے دوں گا! (لیکن سیلچن اس سے
الگ ہٹ جاتی ہے) اگر اب میں تمہارے ساتھ
نہیں رہ سکتا تو آؤ ہم دونوں ساتھ مر جائیں!
دیکھو! وہ پیاری موتیں آرہی ہیں جو سونے اور
ڈوبنے سے واقع ہوتی ہیں۔
(شہر کے تاریک دروازے میں سے
دھندلی شکلیں نمودار ہو رہی ہیں۔ یہ
موتیں ہیں جو سونے اور ڈوبنے سے واقع
ہوتی ہیں۔ یہ سیلچن کی طرف آہستہ آہستہ
ناچتی ہوئی آتی ہیں اور کچھ دیر اس کو
مسکرا کر دیکھتی ہیں۔ پھر آہستہ آہستہ ناچتی
ہوئی چلی جاتی ہیں۔)
سیلچن۔ ہاں وہ اچھی اور نیک ہیں۔
(جب وہ شہر کی طرف دوبارہ حرکت
کرتی ہے، لیمنڈ کا چہرہ مسرت سے چمک
اٹھتا ہے لیکن جونہی وہ دروازے کے
پاس پہنچتی ہے دور سے گایوں کی گھنٹیوں
اور بانسریوں کے بجنے کی آواز پھر سنائی
دیتی ہے۔ جبلِ شراب کا چرواہا گاتا ہے:
آ! بیابان کی گھاس میں، اور
بہت دور گرنے والی چٹانوں کی مدھم
آوازوں میں۔
آ! پھولوں سے لدے ہوئے اپنے پہاڑی وطن
کے چمن زار میں جہاں عقاب پرواز کرتے ہیں۔
اور اون سے لدی ہوئی بھیڑیں دھوپ میں
چرتی ہیں۔
آ! پہاڑ پر! جہاں میں چاندی کی پتلی پتلی زرد
کرنوں کا تاج پہنے ہوئے
اپنے کہستان میں گھومتا پھرتا ہوں۔
آ! پُرسکون آسمان تلے، اور گلریز صبح کے
پُر آرزو نغموں میں ——— میری بیٹی!"
(وہ گا رہا ہے۔ سورج طلوع ہو گیا ہے۔
سیلچن لب کھولے اور ہاتھ پھیلائے ہوئے
علیحدہ ہو چکی ہے اور موت کی شکلیں شہر
میں واپس جا کر غائب ہو گئی ہیں)
سیلچن ۔ میں آتی ہوں۔
لیمنڈ۔ (اس کی ٹانگوں سے چمٹے ہوئے) ننھی روح!
تو کیا مجھے غروبِ آفتاب کے بعد مچھر کی طرح
مر ہی جانا چاہیے؟ آہ! تمہارے بغیر میں زندہ
نہیں رہوں گا۔
سیلچن ۔ (اپنے آپ کو چھڑاتے ہوئے) بے کس دل!
میں جا رہی ہوں ——— !
لیمنڈ۔ تاریکی ہو گئی (شہر کے دروازے میں وہ اپنے
چہرے کو فرغل سے چھپا لیتا ہے)
(جب سیلچن جبلِ بقر کے چرواہے کے
پاس پہنچتی ہے بانسری کا ایک طویل
نغمہ گونجتا ہے۔ منظر تاریک ہو جاتا ہے
اور کہیں دور گایوں اور پھولوں کی گھنٹیاں
اور بانسریوں کی ملی جلی مسلسل آوازیں

بلند ہوتی ہیں ۔)

چوتھا منظر

(منظر فجر کی گہری آلود سُرخی سے، آہستہ آہستہ روشن ہو رہا ہے۔ سیلچن ایک سبزہ زار پہاڑ پر کھڑی ہوئی ہے جس کے چاروں طرف سوائے نیلگوں آسمان کے اور کچھ نہیں ہے۔ اس کی پُشت پر ہلال چمک رہا ہے۔ ایک نیچی چٹان پر ایک گڈریا بیٹھا ہوا بانسری بجا رہا ہے اور "چار پھول" اپنے سبزی مائل سپید، نیلے، قرمزی اور سنہری رنگوں کی تبدیلیوں کے ساتھ رقص کر رہے ہیں۔ اور جب وہ اپنے رنگ کے پھولوں سے ایک دوسرے سے چھیڑ چھاڑ کرتے ہیں تو ان کی گھنٹیاں بجنے لگتی ہیں۔ ان میں سے ہر ایک اپنے رقص کی گردش پوری کرتے ہوئے باری باری سیلچن کی طرف پھول پھینکتا ہے جسے وہ اٹھا کر اپنے لبوں اور آنکھوں سے لگا لیتی ہے۔)

سیلچن۔ شبنم۔ (وہ چٹان کی طرف چلتی ہے) گڈریا! (لیکن "پھول" سیلچن کو گھیرے میں لے لیتے ہیں اور جب وہ اس کے گرد طواف کر کے چلے جاتے ہیں تو گڈریا بھی غائب ہو جاتا ہے۔ وہ "پھول" کی طرف متوجہ ہوتی ہے لیکن وہ غائب ہو جاتے ہیں۔ دھندلکے کی نقاب اُٹھ رہی ہے)

سیلچن۔ چلا گیا! (وہ اپنی آنکھیں ملتی ہے پھر چٹان کی طرف ایک بار اور مُڑتی ہے۔ سامنے فلزمین اپنے ہاتھ سینے پر رکھے ہوئے کھڑا ہے) تم ہو!

فلزمین۔ تو تو آ گئی ——— ایک زخم خوردہ پچھیا کی طرح کہ تکلیف سے نجات پائے؟ کیا شہر بہت ہی دل کش تھا جس نے تجھے اتنے عرصے تک وہیں جکڑے رکھا؟

سیلچن۔ مجھے کوئی افسوس نہیں۔

فلزمین۔ پھر واپس کیوں آئی؟

سیلچن۔ میں اُکتا گئی تھی۔

فلزمین۔ تو اب تو مجھے چھوڑ کر کہیں نہیں جائے گی۔

سیلچن۔ (طعن سے) تو کس چیز سے مجھے اپنے پاس روکے گا؟

فلزمین۔ (اپنی آغوش میں لے کر) اس طرح۔

سیلچن۔ میں تلوّن جان گئی ہوں ——— اور اب ڈرپوک دوشیزہ نہیں رہی۔

فلزمین۔ (فکر مندی سے) ہاں، اب تو بدل گئی ہے۔ تیری آنکھیں خالی ہیں ——— تیرا چہرہ سفید پڑا ہوا ہے۔

سیلچن۔ (طنزاً) لیکن تیرے پاس یہاں ہے ہی کیا جو تو مجھے روکے گا؟

فلزمین۔ سورج۔

سیلچن۔ مجھے جلانے کے لئے؟

فلزمین۔ ہوا۔

(ہوا کی دھیمی دھیمی نالہ وزاری سنائی دیتی ہے۔)

سیلچن۔ مجھے منجمد کرنے کے لئے؟

فلزمین۔ سکوت۔

(ہوا کا شور و غل ختم ہو جاتا ہے)

سیلچن ۔ ہاں اس میں تنہائی ہے ۔
فلزبین ۔ پھول تیرے لئے رقص کریں گے ۔
(پھول اپنی گھنٹیاں بجاتے ناچتے آتے ہیں اور پھر ایک ایک کرکے ناچنا بند کر دیتے ہیں۔ اُن پر غنودگی طاری ہوجاتی ہے اور وہ سو جاتے ہیں ——)
سیلچن ۔ دیکھو! یہاں ان تک کو نیند اور سُستی آجاتی ہے ۔
فلزبین ۔ بکریاں انھیں جگادیں گی ۔
(گڈریا اپنی چٹان پر بیٹھا اور بانسری بجاتا ہوا پھر نظر آتا ہے ۔ چار برہنہ، صحرائی آنکھوں والے خوب رو، کم سن لڑکے، جن کے پاؤں بکریوں کے سے ہیں، سوتے ہوئے پھولوں کے کبھی اندر اور کبھی باہر رقص کرنے لگتے ہیں۔ پھول بیدار ہوجاتے ہیں، اُچھلتے ہیں اور اُڑ جاتے ہیں اور اُن کے ساتھ ہی یہ بکرے بھی اپنے اپنے پھولوں سے لپٹے ہوئے غائب ہوجاتے ہیں گڈریے نے بانسری بجانی بند کردی ہے اور وہ اپنی چٹان پر بے حس و حرکت لیٹا ہوا ہے ۔)
فلزبین ۔ مجھ سے محبت کر!
سیلچن ۔ تو غیر شائستہ ہے!
فلزبین ۔ مجھ سے محبت کر!
سیلچن ۔ تو اکھڑ ہے!
فلزبین ۔ ہاں میری زبان سیمیں نہیں۔ سُن! میری آواز یہ ہے! (خاموش پہاڑ پر ہاتھ پھیر کر) صبح کا خوف سے لے کر ستارۂ اوّلیں کے جگمگانے تک مکمل خاموشی ہے! (اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر) اور اس طائر کے پر بھی ساکت ہوجائیں گے ۔
سیلچن ۔ (اس کی آنکھوں کو چھو کر) تیری آنکھیں مہیب ہیں۔ ان آنکھوں میں مجھے جنگلی درندے چھپے ہوئے نظر آرہے ہیں۔ کیا یہ ہمیشہ ایسی ہی ہیبت ناک رہتی ہیں؟
فلزبین ۔ اُس وقت نہیں ———— جب یہ تجھے دیکھیں، اے میرے گُلِ رعنا۔
سیلچن (اس کے ہاتھ چھو کر) تیرے ہاتھ گُل چینی کے لئے بہت سخت ہیں (وہ اس کے پاس سے ہٹ کر —— اُس چٹان کی طرف مُڑتی ہے جہاں گڈریا بیٹھا ہوا ہے) دیکھ! بالکل جنبش نہیں! دن بھی تو پُرسکوت ہے ۔ لڑکے! (لیکن گڈریا نہ حرکت کرتا ہے اور نہ جواب دیتا ہے) وہ آسمان کی نیلاہٹ میں کھویا ہوا ہے ۔ (جوشیلی آواز میں) لڑکے! آہ! میری آواز کا وہ جواب نہیں دے گا۔ یہاں میری آواز کا جواب کوئی نہیں دے گا ۔
فلزبین ۔ (پُرجوش تمنا کے ساتھ) "میں" کوئی نہیں ہوں؟
(شام کے دُھندلکے میں منظر تاریک ہوجاتا ہے)
سیلچن ۔ دیکھ! نیند نے دن چُرا لیا ہے! رات ہوچکی ہے۔
(نیند کی زنانی دُھندلی شکلیں تارِ عنکبوت میں ملبوس نمودار ہوتی ہیں اور اپنے ہاتھوں کو ہولے ہولے حرکت دیتے ہوئے گویا وہ بھی خواب ناک ہیں اس کے گرداگرد

چکر لگاتی ہیں ---)
سیلچن ۔ کیا تم نیند ہو؟ میری محبّ نیند! میری محبوب
------- آرام!
(مُسکراتے ہوئے وہ اپنے ہاتھ فلزبین کی
طرف پھیلا دیتی ہے۔ وہ اس کے نیند
میں جھولتے ہوئے جسم کو اپنی آغوش
میں لے لیتا ہے پھر نیند کے دُھندلکے
میں دونوں غائب ہو جاتے ہیں۔ ہر
طرف اندھیرا چھایا ہوا ہے، سوائے
چاند کی ہلکی سی روشنی کے جو یکا یک
چمک اُٹھا ہے۔ گڈریا چٹان پر بانسری
کے مدھم نغمے کے ساتھ ساتھ گاتا ہے)
اے میری چھوٹی سی بکری! جس پر چتیاں پڑی
ہوئی ہیں۔ جس کی آنکھیں زرد ہیں اور جس
کی خوشبو دل پسند ہے۔
خدا کرے چاند، ہوا، اور سنہری سورج،
اور بے شمار تارے،
ہر روز تیرے لئے چراگاہ میں عمدہ گھاس پیدا
کریں،
اور تیرا کودنا پھاندنا زیادہ ہو!
اور خدا کرے پہاڑی لومڑیاں تیرے پاس
سے گزر جائیں،
اور تیرے آرام میں خلل نہ ڈالیں۔
ذرا میری بانسری کو صاف اور دُور تک گونجنے
دے!
اور میں ذرا شیریں پانی تلاش کر لوں!
(خدا کرے) کوئی باز یا کوئی اور شکاری جانور،
تیرے قریب تک نہ آئے، میری ننھی سی بیٹی!
کاش یہ آتشیں چٹانیں دوپہر کے وقت تیرے
نازک پاؤں کو پھسلنے سے محفوظ رکھیں!
چمکتے چاند کے نیچے --- میری اس التجا کو سُن۔
اے آقا عظیم! --- اُچھلنے والے خدائے بز!
(ایک طویل نالہ کرنے کے ساتھ گڈریا
خاموش ہو جاتا ہے۔ پھر چاند کے غائب
ہوتے ہی اندھیرا چھا جاتا ہے۔ یہانتک
کہ صبح کاذب کی دُھندلی روشنی میں سیلچن
سوئے ہوئے فلزبین کے پہلو سے بیدار
ہو کر اُٹھتی ہوئی نظر آتی ہے۔ گڈریا جا
چکا ہے لیکن چٹان کے نزدیک جبلِ بقر
کا چرواہا اپنے کمبل میں لپٹا ہوا کھڑا ہے)
سیلچن ۔ سالہا سال تک میں سوتی رہی۔ میری رُوح
بھوکی ہے۔
(پھر جبلِ بقر کے چرواہے کو وہاں کھڑا ہوا
دیکھ کر)
میں اب تجھے جان گئی ہوں۔ اے حیاتِ ارض ---
تیری خوشبو کو، تیرے مناظر کو، تیری لذت کو، اور
تیری تمام موسیقی کو۔ میں نے تیری ہر ہر چیز کو برتا
ہے۔ (وہ جانے لگتی ہے)
فلزبین ۔ (جاگ کر) تو کہاں چلی؟
سیلچن ۔ دُنیا کے کنارے پر۔
فلزبین ۔ (اٹھ کر اور اُسے روکنے کی کوشش کرتے
ہوئے) تو مجھے چھوڑ کر نہیں جا سکتی!
(وہ مُسکرا رہی ہے لیکن فلزبین اُس سے
اس طرح کشمکش کرتا ہے گویا کسی سخت

منجمد شے سے اُلجھ رہا ہو)

سیلچن۔ اے دوست! اب وقت آچکا ہے۔

فلزمین۔ توکیا میرے بوسے وحشیانہ تھے؟ کیا میں
تیرے لئے بار تھا؟

سیلچن۔ مجھے اس کا رنج نہیں ہے لیکن مجھے جانا
ہی چاہیئے۔

(یک لخت جبلِ شراب کا نوجوان جبلِ بقر
کے بےحس وحرکت چرواہے کے سامنے کھڑا
نظر آتا ہے اور اس کا ساز بجنا شروع
ہوتا ہے)

فلزمین۔ شہر کی منحوس موسیقی! توکیا تُو اسی (جبلِ شراب
کے نوجوان) کے پاس واپس چلی جائے گی؟

سیلچن۔ خوف نہ کھا! میں آگے ہی بڑھتی رہوں گی۔

فلزمین۔ مجھے پہاڑوں کی آندھیوں پر نہ چھوڑ!
تیرے بغیر محبت مُردہ ہے اور تجھ بن میری
زندگی اجیرن ہو جائے گی۔

سیلچن۔ اے شکستہ دل! میں تو چلی!

فلزمین۔ (چٹان کا سہارا لے کر) یہ سرد ہو چکی ہے۔

(چرواہے کی بانسری بجتے ہی جبلِ بقر
اپنے ہاتھ سیلچن کی طرف بڑھاتا ہے۔
ساز بھی بجتا ہے اور جبلِ بقر بھی اپنی
آغوش اس کے لئے وا کر دیتا ہے۔ وہ
ساکت کھڑا ہے)

سیلچن۔ اے میرے رفیقوں، مجھے چلا ہی جانا چاہیئے
کوئی دم میں پو پھٹنے والی ہے۔

(جبلِ بقر اور جبلِ شراب خاموشی میں
اپنے چہرے چھپا لیتے ہیں۔ صبح کاذب
کا جنازہ نکلتا ہے مکمل تاریکی پھیل جاتی ہے)

پانچواں منظر

(بہت دُور مدھم روشنی سے جبلِ عظیم کی
برف آلود چوٹی چمک اُٹھتی ہے، اور پھر
یہ روشنی تیز ہو کر سیلچن پر بھی پڑتی ہے۔ کوئی
اور چوٹی نظر نہیں آتی، البتہ روشنی کے دونوں
جانب جبلِ بقر اور جبلِ شراب اپنے سروں
کو چھپائے سایوں کی مانند کھڑے ہوئے
ہیں۔)

سیلچن۔ جبلِ عظیم! میں آئی!

(جبلِ عظیم کی چوٹی ایک ایسی آواز میں،
جو دُور سے آ رہی ہو، مصروفِ تکلم ہوتی
ہے۔ اس کی آواز روشنی کے ساتھ ساتھ
صاف اور گرج دار ہوتی جاتی ہے۔)

اے شعلۂ آوارہ! اے بے چین تپش!
ہر شے کو خاکستر کرتی ہوئی، پر کسی بات پہ متاسف
نہ ہونے والی!

تقدیر کی ہوائیں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خاموش
ہو گئی ہیں ——

تیری پُرفیض زندگی کی کشتی کنارے آ لگی،
اور تیری تمام پُرشوق جستجوئیں ختم ہو چکیں!
تُو اب ایسے سمندر کی مسافر ہے جہاں مدوجزر
بھی نہیں ہوتا۔

جہاں روشنی اور تاریکی، تلوّن اور سکون،
ایک ہیں —— آ! اے ننھی رُوح، ہمارا ساتھ دے
میں!

(سیلچن گھٹنے ٹیک کر اپنا سر زمین پر ٹیک دیتی ہے۔ روشنی دھیمی ہو رہی ہے۔ یہانتک کہ منظر بالکل تاریک ہو جاتا ہے)

چھٹا منظر

(تاریکی آہستہ آہستہ کم ہو رہی ہے اور صبح کاذب کی دھندلی روشنی پہاڑی جھونپڑی میں چھنتی ہوئی آرہی ہے۔ سیلچن دریچے والی جگہ پر سو رہی ہے۔ لیمنڈا اور فلزمین اُس کے پاس کھڑے ہوئے اُسے دیکھ رہے ہیں۔)

فلزمین (اُسے جگاتے ہوئے) وہ کوئی دم میں پو پھٹنے والی ہے (وہ چونکتی ہے اور اُس کے لب حرکت کرتے ہیں)

لیمنڈا۔ اسے سونے دو، یہ محوِ خواب ہے۔

(فلزمین چراغ اُٹھاتا ہے اور اُس کی روشنی سیلچن کے چہرے پر اچھی طرح پڑتی ہے۔ پھر دونوں آدمی آہستہ آہستہ دروازے کی طرف چلتے ہیں، اور جب وہ کچھ بولتی ہے تو دونوں جا چکتے ہیں۔)

سیلچن۔ (کھڑے ہو کر اور اپنے ہاتھ وجد میں پھیلاتے ہوئے) آقائے عظیم! میں آتی ہوں! (جاگ کر وہ چاروں طرف دیکھتی ہے اور پاؤں کو کمبل سے چھڑاتی ہے) میرا خواب کتنا مختصر!

(دروازے میں سے آسمان پر نور کے تڑکے کی پہلی جھلک دکھائی دیتی ہے کہ ریوڑ کی گھنٹیاں بجنے کی آواز آرہی ہے)

پردہ گرتا ہے

ساقی (سالنامہ ۱۹۳۸ء) — جون گولزوردی

چراغِ کشتہ

برسوں بیتے جھیل بیوا کے قریب ایک سرائے میں اوطامی نامی ایک دوشیزہ، خادمہ کے فرائض انجام دیتی تھی۔ وہ کسی نابینا فقیر کی بیٹی تھی۔ لیکن اُس کا حُسن دیکھنے والوں کو مسحور کئے بغیر نہ رہتا تھا۔ اُس کی جلد پنکھڑیوں کی طرح ملائم تھی اور آنکھیں ایسی حسین تھیں جیسے جاپانیوں کی قندیلیں! اُس کی مسکراہٹ میں مہاتما بدھ کی جھلک تھی اور اُس کا رقص ایک شعلہ مسلسل تھا۔

ایک شب یہاں ایک نوجوان آیا اور اُس نے ساکے کی دو تین بوتلیں پیں۔ اس کا چہرہ خوبصورت تھا مگر آنکھوں سے شرارت ٹپکتی تھی۔ وہ عورتوں کے ساتھ نہایت عیار تھا۔ اس لئے اگرچہ وہ اس کی خاطر یہاں کئی بار آیا مگر اُس پر ظاہر نہ ہونے دیا کہ وہ اُس کی طرف ملتفت ہے۔ یہاں تک کہ اُس کی ظاہری لاپروائی نے اثر دکھایا اور جب وہ یہاں آتا اوطامی کے دل میں ایک دھڑکن سی پیدا ہو جاتی۔ ایک شام کو وہ سرائے میں مقیم تھا کہ طوفان باد و باراں سر پر آگیا، چنانچہ اس کو رات وہیں بسر کرنی پڑی۔ ایک کمرے میں اُسے پہنچا کر اوطامی نے دستور کے مطابق آتشدان روشن کی، فرش پر توشک بچھائی اور دوسرے انتظامات سے فارغ ہو کر شب بخیر کہنے کے لئے اُس نے چٹائی پر اُسے سجدہ کیا .... مگر یہ دیکھ کر اُس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی کہ اُس نوجوان نے یکبارگی اُسے اپنی آغوش میں لے کر خوب بھینچا اور اُس کے رُخسار پر اپنا رخسار رکھ دیا۔ شاید یہ وارفتگی تھی لیکن وحشیانہ، کیونکہ فوراً ہی اُس نے شوجی کھول کر اوطامی کو برآمدے میں دھکیل دیا جس سے اُس بچاری کو سخت اذیت ہوئی۔

رات گئے جب جاپان نیند کی لہروں میں جھکولے کھا رہا تھا، بے چین و مضطرب اوطامی انتہائے غیظ و غضب میں بستر سے یہ کہتی ہوئی اُٹھی: "اس نے میری توہین کی ہے میں اسے قتل کروں گی"۔

سفید سلک کا لانبا لباس پہن کر اُس نے اپنی آستین میں چھوٹا سا خنجر رکھا اور شوجی کھول کر نوجوان کے کمرے میں داخل ہوئی۔ مگر جونہی وہ خنجر نکال کر اُس پر جھکی، نوجوان نے اُس کی کلائی پکڑ لی اور کہا "اس سے کیا کروگی؟"

"تمہارا قتل!"

اس پر وہ ہنس دیا اور خنجر باہر پھینک کر اُس نے اُسے سینے سے چمٹا لیا ———— اور اُس وقت اُسے ایسا معلوم ہوا کہ وہ غصّے میں نہیں تھی بلکہ اُس کے خون میں وہ مقدس شعلہ رقصاں تھا جسے فضائی دیویاں روشن کیا کرتی ہیں۔ صبح جب پو پھٹنے کے قریب تھی، اوطامی نے کہا۔ "اے آقا! الفت اور کرما نے ہمارے بستر ایک دوسرے کے قریب کر دیئے ہیں۔ بتاؤ کیا تم مجھ سے ہمیشہ اسی طرح محبت کرتے رہا کرو گے؟"

لیکن وہ نوجوان اُس کے حُسن کی خوشہ چینی کر چکا تھا، اس لئے اُس نے کہا" اور تم؟ مجھے معلوم ہے کہ تمہارے چاہنے والے سینکڑوں ہیں۔"

مگر دوشیزہ سچے دل سے بولی "نہیں۔ تم مذاق کرتے ہو تمہارے ہوتے ہوئے میں زندگی کی دوسری رنگینیوں سے نا آشنا رہوں گی اور یقین جاننا کہ آج سے پیشتر میرے گلِ حیات کی رعنائی نے کسی کو محظوظ نہیں کیا ——— پیارے! اب میں کسی سے محبت نہیں کر سکتی۔"

نوجوان نے جواب دیا" ایسا تو سب ہی کہتی ہیں اور جہاں تک میرا تعلق ہے تو میں کسی عورت پر اعتماد نہیں کرتا، تاوقتیکہ میں اُسے آزما نہ لوں۔"

وہ بولی" اے میرے مالک تو مجھے آزما لو۔"

نوجوان نے جواب دیا" اس خلیج کے پار تمہیں جگنو کی طرح ایک روشنی نظر آتی ہے؟" وہ بولی "ہاں" "تو یہ ایک چراغ ہے" اُس نے کہا" جو میرے مکان کے دریچے میں ہمیشہ رکھا رہتا ہے، اگر تم مجھے چاہتی ہو تو وہاں ہر شب آیا کرو اور اُس چراغ کے نیچے اپنی الفت کی نشانی رکھ دیا کرو ——— شاید مجھے تم پر یقین آجائے۔"

یہ اُس نے اس لئے کہا تھا کہ اُسے علم تھا کہ سرائے حریمہ میں کوئی کشتی نہیں ہے اور خلیج میں اس قدر روانی اور بھنور ہیں کہ کوئی تیراک اُس میں داخل ہونے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ لیکن وہ بیچاری کہنے لگی" اچھا! میں ایسا ہی کروں گی۔"

سپیدۂ سحر کے نمودار ہونے سے پیشتر وہ وہاں سے رخصت ہو گئی اور نوجوان اپنے گھر چلا گیا۔

دوسری رات جب وہ مہمانوں کو کمرے میں پہنچا کر اپنے فرائض سے فارغ ہو گئی تو اُس نے سفید سلک کا لباس پہنا اور جب میدار کا مندر نصف شب کی گھنٹیاں بجا رہا تھا، وہ نہایت خاموشی کے ساتھ ایک معمولی سے ڈونگے میں سوار ہوئی اور اپنے دونوں ہاتھوں سے چپوؤں کا کام لیتے ہوئے بہت دُور دمکنے والے چراغ کی سمت میں ڈونگے کو ہولے ہولے کھینے لگی۔ بڑی جدوجہد کے بعد وہ پار پہنچی اور پیٹی میں سے ایک کاغذ نکال کر اُس نے سیاہی کے برش سے ایک خط لکھا۔

"آہ! یہ جان کر کہ اتنے طویل راستے میں پھیلا ہوا پانی بھی بھڑکی ہوئی آگ کو نہیں بجھا سکتا، او ظالم! یہ چند سطریں لکھ رہی ہوں کہ ایسا نہ ہو اس بدنصیب کی ہستی دل سے محو ہو جائے۔"

اس خط کو تہ کر کے اُس نے دریچے میں چراغ کے نیچے رکھ دیا اور سرائے واپس آگئی۔ صبح جب وہ نوجوان ناشتہ کرنے بیٹھا تو اُسے چاولوں کے پیالے کے پاس یہ خط پڑا ہوا ملا۔ اُسے پڑھ کر اُس نے ملازم سے پوچھا" اسے کون لایا ہے؟" ملازم نے جواب دیا "دریچے میں چراغ کے نیچے رکھا ہوا تھا۔"

نوجوان نے حکم دیا" اسے جلا دو۔" اور فوراً ہی (کیونکہ وہ جانتا تھا کہ سرائے حریمہ میں کوئی کشتی نہیں ہے) باہر نکل کر اُس نے دیکھا کہ خشک ریت پر ڈونگے کے نشان باقی ہیں جہاں وہ اُتری تھی۔ نشانات دیکھ کر وہ ہنسنے لگا" ہوں!! محبت میرے پاس ایک شکستہ ڈونگے میں گھسٹی چلی آتی ہے؟" اور اُس شام کو چائے پیتے وقت اُس نے اپنے دوستوں میں اس کا خوب

مذاق اُڑایا۔

دوسری صبح وہ ذرا جلدی بیدار ہوا اور دیکھا کہ چراغ کے نیچے دوسرا خط رکھا ہوا ہے، اُس میں لکھا تھا:۔

"میری خود غرضی تو دیکھو، طوفانی خلیج کو پار کر کے اپنے تئیں کس قدر اہمیت دے رہی ہوں۔ آہ! میرے یہ دن اُس وقت تک پتّوں کی مردہ لاشوں کے مانند رہیں گے جب تک میری آنکھیں دیدارِ محبوب نہ کر لیں۔ اوطامی"

(۳)

"یہ تو ذہن کی بکّی معلوم ہوتی ہے لیکن آخر کب تک"؟ کہہ کر نوجوان نے خط ایک طرف پھینک دیا اور دوسرے کاموں میں لگ گیا۔ اگلی صبح کو اُسے تیسرا خط وہیں رکھا ہوا ملا، جس میں تحریر تھا:۔

"کیا اوطامی آپ کی مصروفیتوں میں مُخل ہوتی ہے؟ خدارا اپنے دل کے دریچے میں چاہے مدھم ہی سہی مگر ذراسی روشنی ضرور چمکتی رکھنا جیسا کہ تمہارا چاند کی طرح چمکنے والا چراغ فروزاں رہتا ہے تاکہ مجھ دُکھیاری کا یہاں تک آنا تمہاری نظروں میں رہے"!

اسے پڑھ کر اُس نے تیوری چڑھالی اور کہا "پچھلی راتیں پُرسکون رہی ہیں، اگر موسم تبدیل ہو جائے تو یہ روز روز کا دق کرنا ختم ہو جائے گا"۔ اتفاقاً اُس روز طوفان آگیا اور خلیج کے بھنور جھاگ پیدا کرنے لگے۔ چنانچہ دن ڈھلتے اُس نے سوچا کہ آج رات وہ مرلے ہی میں رہے گی...... مگر پھر بھی صبح ہوتے اُس نے دریچے میں ایک اور خط دیکھا۔ لکھا تھا:۔

"اوطامی اپنے محبوب ہی کی ہے جس کا دریچہ ہمیشہ بند رہتا ہے۔ محبت کا پھول صرف ایک بار تخلیق ہوتا ہے، صرف ایک دفعہ کھلتا ہے، صرف ایک مرتبہ عطر بیزی کرتا ہے اور آخرکار ..... ایک ہی دفعہ مُرجھا جاتا ہے، ہمیشہ کے لیے! اس کے بعد یہ مٹھی بھر مسلی ہوئی پنکھڑیاں صرف اس لئے رہ جاتی ہیں کہ التجا کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھادی جائیں۔

آج رات تمہارے چراغ کا شعلہ ہوا میں لرز رہا تھا"!

خط پڑھ کر اُسے مظلوم دوشیزہ کی محبت پر غصہ آگیا۔ اُس کے بلاناغہ آنے سے وہ چڑ سا گیا تھا۔ اس کے گہرے تعلق اور سچے لگاؤ پر وہ رات بھر بگڑتا اور پیچ وتاب کھاتا رہا۔ پو پھٹتے ہی اُس نے ایک اور خط دیکھا لیکن بغیر پڑھے ہی اُسے چاک کر دیا اور اُس کے پُرزے اِدھر اُدھر پھینک دئے مگر وہ سطحِ ذہن سے وہ خطوط تو نہیں مٹا سکتا تھا جو اُس نے پڑھ لیے تھے۔ تمام دن ان خطوں کے الفاظ اُس کے کانوں میں گونجتے رہے۔ یہاں تک کہ اُس نے آستینوں میں اپنی مٹھیاں بھینچ لیں اور تانے بانے کو نوچنے لگا۔

سورج غروب ہوتے خلیج میں بھنور پڑنے لگے۔ اور طوفانِ بادوباراں زور شور سے شروع ہو گیا۔ اُس نے دل میں کہا "اگر آج کی طوفانی اور ڈراونی رات بھی اُس نے اپنے شکستہ ڈونگے میں یہاں آنے کی جرأت کی تو میں اپنے آباد اجداد کے پاک مقبروں کو حقارت سے ٹھکرا دُوں گا" ــــــ لیکن نہ جانے کیسے اُس کے بے رحم دل میں یہ خیال بناہ گزیں ہو گیا کہ اوطامی کی محبت نے

آج کی رات بھی یہاں کھینچ لائے گی۔

جب رات آدھی جا چکی، وہ خاموشی سے اُٹھا، تاکہ کوئی لونڈی اس کے ارادے سے آگاہ نہ ہو جائے، اور دریچے کے پاس پہنچ کر اُس نے چراغ بجھا دیا۔ اُسی وقت خلیج میں بہت دُور اوطامی نے دیکھا کہ چراغ کی روشنی جس کے بھروسہ پر وہ ڈونگا کھیتی تھی، تاریکی میں گم ہو گئی ہے۔ فوراً ہی بھنور اور ڈراؤنی لہروں نے چاروں طرف سے اُسے گھیر لیا اور سیلاب کی زد میں دیارِ محبوب کی سمت، بھٹک گئی اور لہروں نے تہ آب اُسے ایسی جگہ پہنچا دیا جہاں غرق شدہ جہازوں کی قبریں ہیں۔ اور سمندری دیویوں نے خود غرض نوجوان کی سنگ دلی پر طیش میں آکر سیلاب میں شد و مد کے ساتھ مدوجزر پیدا کر دیا اور خوفناک رَوؤں نے چراغ کشتہ والے مکان کو قابو سے نکلی ہوئی خلیج میں غرق کر دیا —— اور مکان دار کے کانوں میں حُسنِ سوگوار اور عشقِ ناکام کی متلاطم آوازیں پانی کی طویل گہرائیوں میں سُنائی دینے لگیں +

پیرس کا صنم

صدؔ

شام ہو چکی تھی۔ پادری فلبرٹ مسکراتا ہوا گھر میں داخل ہوا۔ اُس کے چہرے پر اپنی بھتیجی ہیلوآئزی کی پیشانی چومتے ہوئے مسرت کے آثار نمایاں ہو گئے۔ قدرت نے ہیلوآئزی کو پرورش کے لئے اُس کے سپرد کر دیا تھا اور کلیسائے نوطریدیم کے پادری ہونے کی حیثیت سے اُس کو ایسے ذرائع بسر آ گئے تھے جن کی وجہ سے اُس نے ہیلوآئزی کو عمدہ تعلیم دلوائی۔ ورنہ گیارھویں صدی میں علم صرف مردوں تک محدود تھا اور اُن میں بھی صرف خواص کے لئے۔ ہیلوآئزی نے ابتدائی تعلیم اپنی انتھک کوششوں سے ارگنطائل میں حاصل کی تھی اور یہاں اپنے چچا کے زیرِ نگرانی اس کے بڑھتے ہوئے شوق نے اس کے علم کے دائرے کو نہایت وسیع کر دیا۔

بھتیجی کے اصرار پر فلبرٹ نے بڑے فخر سے یہ خوش خبری سنائی کہ اُس کی مزید تعلیم کے لیے وہ ابیے لارڈ کی خدمت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ ابیے لارڈ! فرانس کا سب سے بڑا معلم! فلسفے کا ماہر! دینیات کا فاضل اور ہزاروں شاگردوں کا اُستاد!! فلبرٹ کی خوشی کی کوئی انتہا نہیں تھی کہ اُس کے دوست ابیے لارڈ نے اس کی تجویز منظور کر لی ہے اور وہ عنقریب اس کا مہمان بن کر اپنا کچھ وقت ہیلوآئزی کی تعلیم و تادیب پر صرف کرے گا۔

ہیلوآئزی نے ابیے لارڈ کے استقبال کی تیاریاں شروع کر دیں اور جب وہ دونوں تنہائی میں ملے تو ایک ایسے رومان کا آغاز ہوا جس کی موسیقی نو سو سال گزر جانے پر بھی ہمارے کانوں میں آج تک گونجتی ہے۔ ہیلوآئزی کی عمر اٹھارہ سال تھی اور اُس کے حسن کی دلفریبی نے ابیے لارڈ پر بڑا اثر کیا۔ وہ دونوں ایسی عمر میں سے گزر رہے تھے جب ایک تنہا ملاقات جذباتِ آتش فشاں تخلیق کر دیتی ہے۔ دماغی قابلیت کے علاوہ اس کی جسمانی خوبصورتی نے بھی ہیلوآئزی کو مسحور کر لیا۔ علاوہ ازیں وہ ابیے لارڈ کے جادو بھرے الفاظ سے بھی بے حد متاثر ہوئی۔ لیکن تعلیم؟ محبت کی طویل باتوں کے سوا اُن کے اسباق ہی کیا ہو سکتے تھے۔

پھر بھی ہیلوآئزی کی تعلیم ارگنطائل کی خانقاہوں میں ہوئی تھی۔ جہاں عورت کا ایمان یہ تھا کہ وہ خواہشات سے احتراز کرے اور نفس پر قابو پائے...... مگر دُنیا کے تمام قوانین، مذہب کے سارے احکام، گرجا کے کُل اصول، بعد الموت جہنم کی آتشیں لپٹیں...... ان سب کی اس وقت کیا حقیقت ہے جب ایک عورت کا ہاتھ کسی مرد کے ہاتھ میں تھرتھرا جائے؟ اور اس طرح ابیے لارڈ نے حسین و جمیل ہیلوآئزی کو، جس میں مزاحمت و مخالفت کی مطلق طاقت یا خواہش نہیں تھی، اپنے قوی بازوؤں کی آغوش میں لے کر اُلفت کا پُرفسوں

راگ سُنایا۔

وہ دونوں دُنیا کو بھول گئے اور صرف محبت اُن کی زندگی کا مقصد رہنے لگا۔

(۲)

ایبے لارڈ نے اپنے جسم اور روح کو محبت میں ایسا منہمک کیا کہ اسے شاگردوں اور لکچروں کا بھی خیال نہ رہا۔ فلسفہ، منطق، فقہ، الٰہیات، لسانیات، جن پر بے پناہ قدرت نے اُسے وحیدالعصر بنایا تھا، اب اس کے لئے کچھ وقعت نہیں رکھتے تھے اور اُس کا بیشتر وقت محبت کی نغمہ سرائی میں گزرتا تھا۔۔۔۔۔ افسوس یہ نغمے اب ہم سے ہمیشہ کے لیے چھن گئے ہیں۔

تھوڑے عرصے میں دنیا ان کے عشق سے واقف ہوگئی۔ لیکن بوڑھے پادری کو علم نہ ہوا۔ اُس نے کبھی نہیں دیکھا، خیال تک نہیں کیا۔ حالانکہ وہی سب سے قریب تھا۔ مگر اُس کو سب سے آخر میں خبر ہوئی۔ وہ غضب ناک ہوگیا۔ اُس کے ماتھے کی نیلی رگیں اُبھر آئیں اور وہ طیش میں چلا کر بولا "میرے ساتھ یہ فریب؟ اُس نے مجھ سے مل کر دغا کی؟ میں اس محبت کا (آہ! یہ تو انسانی قیاس اور خیالی گھمنڈ ہے) خاتمہ کرکے رہونگا۔"

اس کا سخت دل جو مقدس اور مذہبی فضا میں پتھر ہوچکا تھا اپنے ارادے کی تکمیل کے لئے ہر فعل پر مستعد تھا اور اس لئے ایبے لارڈ —— لسانیات کا ماہر، مباحثہ میں لاثانی، الفاظ کا جادوگر —— اس غضبناک پادری کے آگے بے بس ہوگیا۔ علاوہ ازیں ہیلوآئزی کے آنسو بھی فلبرٹ پر کوئی اثر نہ کرسکے اور محب و محبوب جُدا کردیے گئے۔

فلبرٹ بوڑھی دُنیا کی طرح جو اپنے عالم شباب کو محو کرچکی ہے، ان کی اس جدائی سے مطمئن ہوگیا۔ بھلا وہ کیسے جان سکتا تھا کہ عام نظر میں وہ دونوں صرف اس لئے ایک دوسرے سے لاپروا رہتے ہیں کہ تنہائی میں چھپ چھپ کر اُن کی ملاقاتیں ہوجاتی ہیں۔ جذبہ کلی ہے! محبت پھول! لیکن پھل؟ یہ زندگی ہے! اور ایک دن، خوف زدہ پرندے کی طرح ہیلوآئزی نے یہ بات ایبے لارڈ سے کہہ دی۔ اِدھر چچا کی خشمناک آنکھیں اس کے لئے ناقابلِ برداشت تھیں۔ کبھی کبھی وہ سوچنے لگتی کہ چچا میرے شکم کو کیوں گھور رہے ہیں؟ حالانکہ فلبرٹ کو اس کا گمان بھی نہیں تھا۔

فرار ہی اُن کا آسرا رہ گیا تھا۔ چنانچہ ایک شب کو جب پادری کہیں گیا ہوا تھا، وہ دونوں برٹنی روانہ ہوگئے اور جب تک پیرس کی سڑکیں نظر آتی رہیں، وہ چوروں کی طرح پردے ڈالے، گاڑی میں دبکے رہے۔ برٹنی، ایبے لارڈ کا آبائی وطن تھا جہاں اُس کی بہن نے ہیلوآئزی کا نہایت پُرجوش استقبال کیا۔ اور یہیں اُس کے ہاں لڑکا پیدا ہوا۔

فلبرٹ عزت پر جان دیتا تھا اور اس کی رائے میں اُسے برقرار رکھنے کے لئے انسانی قربانی تک جائز تھی۔ ان دونوں نے رازدارانہ شادی کا فیصلہ بھی کرلیا تھا لیکن فلبرٹ کو اس سے اطمینان نہیں ہوا۔ اس وقت ہیلوآئزی نے دنیا پر ظاہر کردیا کہ اس کی فطرت نہایت بلند اور تقدس مآب ہے۔ چنانچہ بجائے اس کوشش کے کہ وہ جلد سے جلد شادی شدہ عورت کا مرتبہ حاصل کرلیتی، اس نے شادی کی آرزو نہیں کی۔ اس قدر رفیع شخص کی بیوی ہونا بڑے فخر کا باعث تھا۔ لیکن اس کا

دل اس سے بھی بلند خیال کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ اس کے پیش نظر، اس کی زبردست شخصیت، اس کی محبوب ہستی، اس کی تمام عمر، آزادی، شہرت اور عزت تھی! وہ ان کو داغ لگانا نہیں چاہتی تھی۔ ایک دفعہ جب خیالات کا سیلاب اس کے دماغ میں گردش کر رہا تھا، وہ سوچنے لگی "اگر خدانخواستہ شادی ہو گئی تو مذہب کو نقصان پہنچ جائیگا! فلسفہ نامکمل رہ جائے گا! اور یہ کس قدر شرمناک امر ہی کہ وہ شخص جو تمام دنیا کے لئے پیدا ہوا ہی صرف ایک عورت کا ہو کر رہ جائے؟ آہ یہ شادی اس کے لئے بار ہو جائے گی! بھلا دنیا میں کوئی ایسا آدمی ہو سکتا ہی، جو فلسفے اور مذہب کے لئے وقف ہوتے ہوئے بھی بچے کے رونے، انّا کی لوری، نوکروں کی آمد و رفت اور اولاد کی بڑھتی ہوئی پریشانیوں کو برداشت کر لے؟"

ہیلوآئزی کی بے غرض محبت ان چند فقروں سے ظاہر ہوتی ہی جو اُس نے ایبے لارڈ کے نام اولین خطوط میں لکھے :۔

"میں نے اپنی آرزوؤں کا کبھی خیال بھی نہیں کیا۔
تم اچھی طرح جانتے ہو کہ یہ صرف تمھاری ہی خواہشات تھیں جن کی تکمیل میں اپنا فرض سمجھتی تھی۔
اگرچہ "شریکِ حیات" کہلوانا زیادہ مقدس اور اچھا معلوم ہوتا ہی، لیکن میں اپنے آپ کو تمھاری خادمہ، بلکہ لونڈی ہی کہلوانے کو ترجیح دیتی ہوں ——— کیونکہ میرا خیال ہی کہ جتنا میں اپنے آپ کو تمھاری خاطر دوسروں کی نظروں میں گرا دوں گی، اُتنا ہی کم دھبہ، میری وجہ سے، تمھاری عزت اور بڑھتی ہوئی شہرت پر لگے گا۔"

لیکن فلبرٹ نے اصرار کیا کہ ہیلوآئزی کم از کم رازدارانہ شادی ہی پر رضامند ہو جائے۔ کیوں کہ اس طرح ان کا بچہ بدنامی سے بچ جائے گا۔ چنانچہ وہ پیرس واپس آ گئے اور تھوڑے دنوں بعد فلبرٹ اور اُس کے چند دوستوں کی موجودگی میں ایبے لارڈ اور ہیلوآئزی کی شادی ہو گئی۔

(۳)

جوں جوں وقت گزرتا گیا۔ بوڑھے پادری کی دشمنی جائز ثابت ہوتی گئی۔ کیونکہ ایبے لارڈ مغرور ہو گیا۔ اور ایک موقع پر جب اُس نے یہ کہا کہ "میری شہرت کی کوئی ہمسری نہیں کر سکتا اور میں اس قدر خوبصورت ہوں کہ چاہے جس عورت سے محبت کروں اور چاہے جس سے شادی کروں۔ مجھے کسی کا خوف نہیں ——— فلبرٹ نے اپنی بھتیجی کو میرے حوالے کر دیا اور مجھ سے توقع رکھی کہ میں اپنا قیمتی وقت اس کی تعلیم پر صرف کروں۔ اُدھر وہ محبت کے افسانے پڑھنے لگی اِدھر [illegible] ...... خوب ہوا!" تو فلبرٹ کو سخت اذیت ہوئی۔ اُسے ہیلوآئزی سے بڑی محبت تھی۔ بچپن سے پالا پوسا پڑھایا لکھایا اور جب وہ تعلیمیافتہ ہو کر جوان ہوئی تو اُس وقت اُسے پوری مسرت نصیب ہوئی کہ قدرت نے جو کام اس کے سپرد کیا تھا وہ پورا ہو لیا ہم ہے [illegible] کی پرورش اور تعلیم پر اپنی زندگی صرف کر دی تھی اور جب پھل پک کر تیار ہو گیا تو ایک اجنبی آگے بڑھا کہ اسے توڑے۔ یہ بھی برداشت ہو سکتا تھا لیکن اجنبی تو سنگدل اور اپنے غرور میں پھولا ہوا تھا! اس چیز نے اُسے فلبرٹ کی

نگاہ میں رہزن بنادیا مگر ہیلوآئزی اس کے لئے ڈھال کی مانند ثابت ہوئی اور اس لئے اُسے نقصان پہنچانا مشکل تھا۔ تاہم جب فلبرٹ کو یہ علم ہوا کہ اس کی بھتیجی ایبے لارڈ کی ہر کم ظرفی اور خودغرض خواہش کی تکمیل اپنا ایمان سمجھتی ہے تو اس کا قلب سراسر نفرت و حقارت کا مرکز بن گیا۔

ایبے لارڈ نے فلبرٹ سے وعدہ لے لیا تھا کہ شادی کی تشہیر نہیں ہوگی۔ چنانچہ کچھ عرصے تک اس نے ایفار وعدہ کیا مگر جب اُس کی بدعنوانیاں ناقابلِ برداشت ہوگئیں تو لوگوں کو ہیلوآئزی اور ایبے لارڈ سے رشتۂ ازدواج کا علم ہوگیا۔ اس پر ایبے لارڈ کے قہر کی انتہا نہ رہی لیکن ہیلوآئزی نے اُسے اطمینان دلا دیا اور جب اُسے یقین ہوگیا کہ معصوم ہیلوآئزی اُس کی خوشنودی کے لئے ہر مصیبت کا سامنا کرے گی تو ایبے لارڈ نے شادی ہی سے انکار کر دیا۔ اس سے فلبرٹ کو بے حد رنج ہوا اور یہ سُن کر اس کا غم اور بھی بے اندازہ ہوگیا کہ اس کی عزیز بھتیجی نے بھی مقدس ترین قسم کھالی ہے کہ وہ اب ایبے لارڈ کی بیوی نہیں بلکہ "خادمہ" ہے۔

فلبرٹ نے ہیلوآئزی (جو جھوٹ بولنے کی ہمت اور اہلیت سے قاصر تھی) کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر آخری بار پوچھا "کیا تیری شادی نہیں ہوئی ہے؟"

ہیلوآئزی نے جواب دیا "نہیں"۔

فلبرٹ غضب ناک ہوگیا۔ قہرآلود! خشمناک!!

(۴)

ایبے لارڈ نے اب ایک اور گل کھلایا۔

جن دنوں فلبرٹ غم و غصے کی کشمکش میں مبتلا تھا، ایبے لارڈ نے ہیلوآئزی کو ترغیب دی کہ وہ ارگنطائل چلی جائے جہاں اُس نے بچپن میں تعلیم حاصل کی تھی تاکہ اس کو سکون نصیب ہو، لیکن وہاں پہنچ کر ہیلوآئزی کو یہ جان کر بڑا صدمہ ہوا کہ ایبے لارڈ اُسے خانقاہ میں رہنے اور راہبہ بننے پر مجبور کر رہا ہے۔

ہیلوآئزی نے اپنے بچے کو ایبے لارڈ کی بہن کے سپرد کرتے وقت ہی دل میں دُکھ محسوس کیا تھا اور آخر کار وہی ہو کر رہا۔ فلبرٹ کو جب معلوم ہوا کہ وہ خانقاہ بھیج دی گئی ہے تو اُسے یقین ہوگیا کہ ایبے لارڈ اس سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتا ہے۔ "وہ اُسے راہبہ بنا دیگا؟ خانقاہ میں رہنے والی راہبہ!!" اس خیال نے اُسے ایک شیطانی ارادے پر آمادہ کر دیا اور وہ یہ کہ "میں اُسے راہب بنا کر چھوڑوں گا"۔

اس ارادے کی تکمیل کے لئے اس نے دو بدمعاشوں کو ایبے لارڈ کے پیچھے لگا دیا جنھوں نے ایبے لارڈ کے ملازم کو رشوت دے کر اپنی سازش میں شریک کر لیا۔ پھر اُنھوں نے آدھی رات کو اس کی مدد سے کمرے میں گھس کر ایبے لارڈ کے جسم کو اس طرح زخمی اور ناکارہ کر دیا کہ وہ مردانہ جذبات و احساسات سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے محروم ہوگیا ——— اس طرح اس جوان و خوبصورت مرد کا غرور اور جوانی خاک میں مل گئی، اور تھوڑے عرصے بعد وہ بھی سینٹ ڈینس کی خانقاہ میں شریک ہوگیا۔

ہیلوآئزی راہبہ بن گئی۔ ایبے لارڈ راہب بن گیا۔

(۵)

ان دونوں کی خط و کتابت سے معلوم ہوتا ہے کہ ہیلوآئزی ہمیشہ ایبے لارڈ کی محب اور وفادار رہی اور خانقاہ اور ارگنطائل کی راہبہ ہونے کے باوجود اس

کی محبت میں کوئی فرق نہیں آیا بلکہ اس کے بربطِ روح کے تار ہمیشہ محبت کی موسیقی سے کانپتے رہے۔ اس کے ایک خط سے چند فقرے نقل ہیں جو اس کے جذبات کی صحیح ترجمانی کرتے ہیں :-

"تم معبد میں شریک ہوئے، اور میں بھی۔
بلکہ میں نے ہی پہل کی۔ تم نے پہلے مجھے
راہبہ بننے پر مجبور کیا۔ آہ! اس قدر بدگمانی؟
تمہاری قسم! مجھے اس سے سخت صدمہ ہوا۔
خدا بہتر جانتا ہے مجھے ہمیشہ تمہارا خیال
رہا، اور اس سے زیادہ، تمہیں خوش
رکھنے کا ارمان ـــــــ
تم نے صرف کہا ہی تھا ـــــــ کوئی
خدائی احکام تو تھے ہی نہیں!........
اور میں نے فوراً راہبہ بننا قبول کرلیا۔
صرف اتنا بتادو کہ تم مجھے اس قدر جلد
کیوں بھول گئے؟ ـ"

۱۱۲۷ء میں حکومت نے خانقاہ ارگنطائل پر قبضہ کرلیا۔ چنانچہ تمام گوشہ نشین، زاہد خواتین کو وہاں سے جانا پڑا اور دو سال تک وہ اِدھر اُدھر ماری ماری پھرتی رہیں۔ اس پریشانی کو دیکھتے ہوئے ایبے لارڈ نے اپنی نئی عمارت ان کی سکونت کے لئے پیش کی اور روحانی تبلیغ و تلقین کے لئے وہ خود وہاں اکثر آنے جانے لگا۔

ایک دفعہ ایبے لارڈ نے تمنا ظاہر کی کہ مجھے اسی عمارت میں دفن کیا جائے۔ ہیلو آئزی جواب میں بولی "لیکن میری آرزو ہے کہ تم سے پہلے میں تہ خاک ہوجاؤں!"

سولہ سال بعد ایبے لارڈ کی تمنا پوری ہوگئی۔ یہ اپریل کا مہینہ تھا۔ ہیلو آئزی نے اُس کی قبر پر پھولوں کی تمام دولت نچھاور کردی۔

ہیلو آئزی بھی زیادہ دن تک زندہ نہ رہ سکی اور تھوڑے عرصے بعد اس کی نعش دفن کرنے کے لئے مقبرے کو پھر کھولا گیا۔ مئی کے مہینے میں جب گلاب کے پھول اپنی فراوانی اور تعطر کی وجہ سے مرکزِ نگاہ بنے ہوئے ہوتے ہیں، اس عمارت میں جہاں ایبے لارڈ اور ہیلو آئزی کی لاشیں دفن تھیں، پاک محبت کی شادی رچائی گئی اور تمام مقبرہ رنگین پھولوں کا تختہ بن گیا۔

اور یوں مرنے کے بعد بھی ان کی شادی ناقابلِ تنسیخ ہوگئی اور اب گرجے کا کوئی قانون اُن کو جُدا نہیں کرسکتا۔

تجدیدِ حیات

(۱)

صبح ہو چکی تھی۔ کسان اپنے خیالات میں مگن، ہل چلا رہے تھے اور تھوڑے فاصلے پر ایک دوشیزہ دوسری عورتوں کے ساتھ کھیتوں میں بیج ڈال رہی تھی۔

"کرسٹشیا! او کرسٹشیا! اری کدھر چلی گئی؟" بوڑھی خادمہ نے ہانپتے ہوئے پکارا۔

"آئی ماں"۔ دوشیزہ نے دُور سے جواب دیا اور فوراً اس کے پاس آ گئی۔

"اری!" خادمہ نے ذرا غصے اور محبت سے کہا "تو اپنا بچپن نہیں چھوڑے گی۔ میں نے تجھ سے صبح ہی کہا تھا کہ کاؤنٹ انٹونیو بہت عرصے بعد اپنی خالہ سے ملنے آ رہے ہیں۔ سب لوگ ان کا استقبال کریں گے اور ہر شخص کوئی نہ کوئی تحفہ بھی پیش کرے گا۔ تو نے کچھ تیار کیا؟"

"ماں!" کرسٹشیا نے بھول پن سے کہا "کاؤنٹ آج ہی آئیں گے؟"

"اور کیا؟ یہی تو کہہ رہی ہوں۔ بلکہ اب آتے ہی ہوں گے۔ جلدی گھر چل چل اور وہاں اُن کے سامنے کوئی طفلانہ حرکت نہ کیجیو!"

"ماں! کاؤنٹ تو بہت بڑے ہو گئے ہوں گے۔" کرسٹشیا نے بوڑھی خادمہ کی ہدایت سُنی اَن سُنی کرتے ہوئے کہا "وہ بہت دنوں بعد آ رہے ہیں۔ جب ہم دونوں بچپن میں ساتھ کھیلتے تھے ......"

"چُپ رہ!" خادمہ بولی "اپنی باتوں کو چھوڑ! بیٹی، کاؤنٹ بہت بڑے آدمی ہیں۔"

(۲)

دونوں خالائیں اپنے بھانجے انٹونیو سے مل کر بہت خوش ہوئیں اور جاگیر کے تمام باشندوں نے اس کی آمد پر مسرت کا اظہار کیا۔ بوڑھی خادمہ نے چاروں طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا مگر کرسٹشیا نظر نہیں آئی۔ وہ دل ہی دل میں بگڑنے لگی۔ کاؤنٹ اپنی خالاؤں کے ساتھ محل میں چلا گیا جہاں دفعتاً اس کی نگاہ ایک الھڑ دوشیزہ پر پڑی۔ وہ سفید اور سادہ کپڑوں میں ملبوس تھی اور اُس کے سیاہ بال شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ اُس کے چہرے سے بھول پن برستا تھا اور وہ سادگی اور حُسن کا مکمل سراپا معلوم ہوتی تھی۔ کاؤنٹ اُسے دیکھ کر فوراً بول اُٹھا "کرسٹشیا! خالہ، یہ تو اب بڑی ہو گئی!"

کرسٹشیا اُسے ٹکٹکی باندھے دیکھتی رہی۔ اُس نے نہ کوئی تحفہ پیش کیا اور نہ اُس کی آمد کی خوشی میں زبان سے کچھ کہا۔ اتنی دیر میں اُس کی ماں اندر آ گئی۔ کرسٹشیا کو یوں دیکھ کر کان میں بولی "آداب بجا لا" کرسٹشیا نے کاؤنٹ کے آگے احتراماً سر جھکا دیا۔

انٹونیو بچپن میں کرسٹشیا کے ساتھ کھیلتا تھا۔

ہوش سنبھالنے پر وہ فوج میں داخل ہونے چلا گیا اور اب عرصۂ دراز بعد یہاں آیا تھا۔ خالاؤں اور دوسرے لوگوں سے مل کر وہ محل کے باہر احاطے میں آ گیا۔
کرسٹیا دودھ دوہ رہی تھی۔
"کرسٹیا!___" انٹونیو نے اس کی طرف بڑھتے ہوئے آواز دی۔
"انٹونیو!___ نہیں، کاؤنٹ انٹونیو...... معاف کیجیے، میں بھول گئی تھی۔" کرسٹیا نے ندامت محسوس کرتے ہوئے کہا۔
"ارے نہیں___" وہ اس کی طرف ہاتھ پھیلائے ہوئے بولا "انٹونیو ہی کہو___ کرسٹیا! کیا میں اب بھی تمھیں یاد ہوں؟"
کرسٹیا نے انٹونیو کے پھیلے ہوئے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور آہستہ سے بولی "کیا میں تمھیں کبھی بھول سکتی ہوں؟ بلکہ میں یہ سمجھتی تھی کہ تم بڑے ہو کر، کاؤنٹ اور فوج کے افسر ہو کر، مجھے بھول جاؤ گے۔"
"ہرگز نہیں کرسٹیا!" انٹونیو نے کرسٹیا کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

انٹونیو وہاں چند روز مقیم رہا اور اس دوران میں بچپن کے وہ نقوش جو جوانی میں مدھم ہو گئے تھے، از سرِ نو تازہ ہو گئے۔ رخصت ختم ہونے کی وجہ سے انٹونیو کو جلدی واپس جانا تھا، اس لئے اُس نے ارادہ ظاہر کیا کہ وہ کل صبح روانہ ہو جائے گا۔
مملکتِ آسمانی پر شب کا حکمراں جلوہ فگن تھا۔ ہر طرف پُرسکون خاموشی پھیلی ہوئی تھی اور ایک گوشۂ تنہائی میں انٹونیو اور کرسٹیا اپنی معصوم باتوں میں مصروف تھے۔
"میں صبح چلا جاؤں گا۔" انٹونیو نے اُسے اپنے قریب کھینچتے ہوئے کہا۔
کرسٹیا نے اُس کے سینے پر اپنا ہاتھ رکھ دیا اور آہستہ سے بولی "پھر کب آؤ گے؟"
"آتا تو میں بہت عرصے بعد، مگر اب شاید جلدی....."
"جلدی کیوں؟" کرسٹیا نے شرارتاً پوچھا۔
"کیا تم اس قدر انجان ہو؟ تم اس کی وجہ نہیں جانتیں؟" انٹونیو نے سرگوشی کے لہجے میں کہا۔
"ہاں، جانتی ہوں انٹونیو! تم جلدی آنا، میں تمھارا بےچینی سے انتظار کروں گی۔" وہ اس کو بھولی نظروں سے دیکھتی ہوئی بولی۔

(۳)

انٹونیو کی طویل جدائی کے ساتھ ساتھ کرسٹیا کا انتظار روز بروز ترقی پذیر ہوتا گیا۔ آخر ایک دن اُس نے اپنی ماں سے پوچھا "ماں! کاؤنٹ کب آئیں گے؟"
بوڑھی خادمہ کی پیشانی پر شکنیں پڑ گئیں "مجھے کیا معلوم؟ دیکھو کرسٹیا! کاؤنٹ سے تجھے اس طرح گھل مل کر نہیں رہنا چاہیے تھا۔ بڑی خالہ اسے اچھی نظر سے نہیں دیکھتی۔"
بات آئی گئی ہوئی مگر خالہ کی ٹیڑھی نگاہیں کرسٹیا کے لئے پریشان کن تھیں۔
چند ماہ بعد انٹونیو خالہ سے ملنے خلافِ توقع آ گیا۔ اُس کا عہدہ بڑھ گیا تھا اور اس خوشی میں اُس کو چھٹی بھی آسانی سے مل گئی۔ خوب خوشیاں منائی گئیں اور جاگیر والوں نے کاؤنٹ کا بڑا شاندار استقبال کیا مگر انٹونیو کو کرسٹیا بڑے تجسس کے بعد نظر آئی۔ وہ اور بھی

زیادہ حسین معلوم ہوتی تھی اور اُس کی خوبصورتی نے کاؤنٹ کے دل پر پوری طرح جادو کر دیا۔

دن بھر کے مشاغل سے فارغ ہوکر رات کو سب سونے کی تیاری کرنے لگے۔ کرسٹنیا اپنے بستر پر بیٹھی رہی۔ نیند اس سے کوسوں دُور تھی۔ اندر سے تحکمانہ لہجے میں آواز آئی "کرسٹنیا روشنی گُل کر دو!"

روشنی گُل ہوگئی مگر وہ پھر بھی بیٹھی رہی اور کھڑکی میں سے بھیگتے ہوئے درختوں کو دیکھنے لگی۔

برسات کا چاند کسی رجبیں کے دُھلے ہوئے مکھڑے کی طرح چمک رہا تھا۔ کرسٹنیا اپنے خیالات میں اُلجھی ہوئی تھی۔ کسی نے آہستہ سے پکارا "کرسٹنیا!" مگر وہ نہیں سُن سکی اور چند ساعت بعد اس نے معاً انٹونیو کو کھڑکی کے باہر کھڑا دیکھا۔

وہ بیتاب ہوکر آگے بڑھی اور سوزِ عشق سے اس کی آنکھوں میں آنسو جھلک آئے۔ "آؤ، باہر آجاؤ، ایسا نہ ہو کوئی جاگ اُٹھے!" انٹونیو نے کرسٹنیا کو باہر آنے میں مدد دیتے ہوئے کہا۔ پھر وہ دونوں محل سے نکل کر تھوڑے فاصلے پر چلے گئے۔ یکایک چاند بدلی میں چھپ گیا۔ بادل گرجنے لگے اور گھٹائیں چاروں طرف اُٹھ اُٹھ کر سروں پر جھومنے لگیں۔ پُرسکون چاندنی رات خوفناک تاریکی میں بدل گئی اور انٹونیو کے دل میں شیطانی بجلیاں کوندنے لگیں۔ اس نے کرسٹنیا کو اس دفعہ کچھ اس طرح اپنی آغوش میں لے لیا کہ اس کا احساس اس کے لئے بالکل نیا تھا اور وہ بیچارگی سے بولی "نہیں —— نہیں انٹونیو!"

"اچھا! تو تم بدل گئیں؟ میں نہ کہتا تھا کہ تم مجھے بھول جاؤ گی؟ تمھیں مجھ سے محبت نہیں ہے۔" وہ والہانہ انداز میں کہنے لگا۔

"نہیں انٹونیو! ایسا نہ کہو —— میں بالکل نہیں بدلی۔ میں تمھیں چاہتی ہوں۔" کمزور عورت قوی مرد کے آگے بے بس ہوکر بولی۔

صبح ہوتے انٹونیو، کرسٹنیا کے نام دو ہزار کا چک دے کر چلا گیا۔ کرسٹنیا کو کسی نے بیدار کیا۔ وہ نیند کی ماتی محبت کا خواب دیکھ رہی تھی۔ جھنجوڑنے سے وہ اُٹھ بیٹھی اور یہ سُن کر بڑی متعجب و مغموم ہوئی کہ انٹونیو جا چکا ہے، لیکن چک دیکھ کر اس کا چہرہ سُرخ ہوگیا۔ غصے میں اس نے چک کے پُرزے پُرزے کر دئے اور غیظ و تحیر سے مغلوب ہوکر آپ ہی آپ کہنے لگی "انٹونیو! میں تمھاری محبت کی بھوکی تھی، دولت کی نہیں!"

(۳)

وقت کے ساتھ ساتھ ماں بننے کے آثار نمایاں ہوتے گئے۔ کرسٹنیا اپنی حالت سے مجبور و متنفر تھی۔ اُسے نہیں معلوم تھا کہ مرد کی طرح عورت اپنا گناہ نہیں چھپا سکتی اور جوں جوں بچے کی پیدائش کا وقت قریب آتا گیا خالہ کی آتشِ غضب تیز سے تیز تر ہوتی گئی۔ ایک دن اس نے کرسٹنیا کو تنہائی میں بُلایا اور دیر تک اُسے ڈانٹتی رہی لیکن وہ بچاری سوائے دم بخود ہونے کے کر ہی کیا سکتی تھی۔ خالہ غصے سے بے قابو ہوکر بولی "ہماری بدنامی ہو جائے گی۔ آج انٹونیو یہاں سے گزرے گا۔ اگر اس کو علم ہو گیا تو اور بھی مصیبت ہوگی۔ تمھارے لئے دو ہزار کافی ہیں۔ اس گناہ کے بار کو لے کر تم آج ہی یہاں سے کہیں چلی جاؤ!"

گھر سے نکل جانے کا حکم اس کے لئے پریشانی اور مصیبت میں ایک اور اضافہ تھا۔ اس نے رو رو کر اپنی ماں سے تمام حال کہہ دیا۔

دفعتاً اس کی پُرنم آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی، اور وہ کھڑی ہو گئی۔

"کیوں؟" ضعیف ماں نے آنسو روکتے ہوئے پوچھا۔

"ماں"۔ وہ بولی "میں اسٹیشن جا رہی ہوں۔ انٹونیو سے ملوں گی"۔

"دیوانی ہو گئی ہو؟ اپنی حیثیت کو نہ بھول! کہاں وہ کاؤنٹ اور کہاں تو؟" ماں نے اپنی بے بسی ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

مگر کرسٹنیا پر کوئی اثر نہیں ہوا اور وہ اسٹیشن چلی گئی۔

دھونتال پانی پڑ رہا تھا۔ گاڑی آہستہ آہستہ چلنے لگی مگر کرسٹنیا کی متجسس نگاہیں انٹونیو کو نہ پا سکیں۔ وہ گاڑی کے ساتھ چلتی رہی۔ یکایک اس کی نظر انٹونیو پر پڑی جو اپنے دوستوں کے ہمراہ کھانے پینے اور قہقہوں میں مصروف تھا۔ کرسٹنیا نے چیخ کر آوازیں دیں مگر کھڑکی کے شیشے چڑھے ہوئے تھے۔ وہ ساتھ ساتھ بھاگتی رہی مگر اس کی آوازیں فضا ہی میں منتشر ہوتی رہیں۔

گاڑی نکل گئی اور کرسٹنیا ٹھوکر کھا کر گر پڑی۔

بچہ مردہ پیدا ہوا۔ کرسٹنیا اپنی ماں کے ساتھ اس کو دفن کرنے قبرستان لے گئی۔ تابوت کو زمین کی تاریک گہرائی میں اُتار دیا گیا لیکن مٹی ڈالنے سے پہلے وہ بیتاب ہو کر تابوت سے لپٹ گئی "اے ماں"! وہ آنسو بہاتی ہوئی بولی "یہ معصوم ...... !"

اُس عورت کے لئے سوسائٹی میں کوئی جگہ نہیں جو ایک ناجائز بچے کی ماں ہو۔ لیکن کرسٹنیا کو بہر حال زندہ رہنا تھا۔ اس لئے جب چاروں طرف سے اُس پر لعنت ملامت کی گئی تو اُس نے اُس جگہ کا رُخ کیا جہاں انسانیت شرم کے مارے اپنا چہرہ چھپا لیتی ہے۔ کرسٹنیا حُسن فروش بن گئی۔

اس واقعہ کو کئی برس گزر گئے اور اس عرصے میں انٹونیو جیوری کا رکن بنا دیا گیا۔

عدالت میں قتل کا ایک مقدمہ پیش ہوا جس میں اور ملزموں کے علاوہ ایک عورت بھی ماخوذ تھی۔ اس کے چہرے سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اپنی رعنائی کھو چکی ہے۔ جرح اور اصرار پر اُس نے کہا "میں اپنے آپ کو بے قصور سمجھتی ہوں۔ مجھے واقعات کا صحیح علم نہیں۔ مجھ سے ایک معمر عورت نے کہا تھا کہ مقتول کو یہ سفوف کھلا دو۔ اس سے وہ بے خبر ہو جائے گا اور ہم حصول زر میں کامیاب ہو جائیں گے۔ میں نہیں جانتی تھی کہ وہ سفوف دراصل زہر ہے"

عدالت کے ایک اور سوال کے جواب میں اس نے رو کر کہا "میرا پہلا نام کرسٹنیا ہے"۔

جج نے حکم دیا کہ اراکین جیوری اپنے فیصلے سے مطلع کریں۔

انٹونیو، کرسٹنیا کا نام سُنتے ہی مختل الحواس ہو گیا تھا۔ وہ اسے بھول چکا تھا۔ کیونکہ شاہی زندگی اور ایک جج کی بیٹی سے معاشقے نے اس کے لئے نئی دُنیا بسا دی تھی مگر اب اُسے پھر ایک دفعہ اپنے سامنے دیکھ کر انٹونیو کو گزری ہوئی باتیں یاد آگئیں۔ چنانچہ

اُس نے دوسرے اراکین جیوری کو اس کی بے گناہی کا یقین دلانے کی انتہائی کوشش کی مگر وہ کامیاب نہیں ہو سکا۔ وہ لوگ اس نتیجے پر پہنچے کہ جرم اگرچہ عمداً نہیں کیا گیا مگر کرسٹنیا سے سرزد ضرور ہوا ہے۔

عدالت نے فیصلہ کیا کہ کرسٹنیا کو پانچ سال کے لئے سائبریا میں قید بامشقت کی سزا دی جائے۔

(۵)

انسان کی زندگی میں ایک وقت ایسا بھی آتا ہے کہ وہ اپنے گناہوں کی تقصیر کے لئے بے تحاشا آنسو بہانے لگتا ہے۔ ضمیر نے انٹونیو کے خیالات میں ہیجان برپا کر دیا تھا۔ کرسٹنیا کی معصوم صورت اس کے سامنے بار بار آ رہی تھی۔ وہ یوں محسوس کر رہا تھا جیسے اس کی تباہ حالی کا وہی ذمہ دار ہے۔ اور پھر یکایک یہ خیال اُس کے دل میں نشتر بن کر چُبھ گیا کہ سائبریا کی قیامت خیز سردی میں جہاں سانس لینا بھی دوبھر ہے، اس کے ناتواں ہاتھ کس طرح کام کریں گے؟

قیدی عنقریب سائبیریا روانہ ہونے والے تھے۔ رشتے داروں اور عزیزوں کو ملنے کی اجازت دے دی گئی۔

ایک اژدہام تھا اور شور و غُل کا طوفان کہ کان پڑی آواز سُنائی نہیں دیتی تھی۔ مجرم اپنے رشتے داروں سے رخصت ہو رہے تھے۔ ہر طرف آہ و بکا گونج رہی تھی۔ کہیں بیٹا جُدا ہو رہا تھا اور کہیں شوہر کہیں باپ چھُٹ رہا تھا اور کہیں بھائی۔ کسی کی ماں پھڑک رہی تھی، کسی کی بیٹی۔ غرض جُدائی اور فراق کا المناک نظارہ تھا۔ انٹونیو، کرسٹنیا کو ہزاروں مجرموں میں تلاش کر رہا تھا۔ آخر بمشکل تمام، وہ اسے اکیلے میں مُلوانے میں کامیاب ہو گیا۔

"تم مجھے جانتی ہو؟" اُس نے آہستگی سے پوچھا۔ وہ پہلے سے بالکل بدل گیا تھا۔

"نہیں۔ لیکن تمھیں مجھ سے کیا کام ہے؟" کرسٹنیا نے لاپروائی سے جواب دیا۔

"تم نے کبھی انٹونیو کا نام سُنا ہے؟" وہ گلوگیر آواز میں بولا۔

"انٹونیو! ——" اُس کے آنسو رواں ہو گئے "تم؟ آہ! تم نے کیوں مجھے پچھلی باتیں یاد دلا دیں؟ تم چلے جاؤ، میں تمھاری شکل دیکھنا نہیں چاہتی۔ میں نے تم کو ہمیشہ بھولنے کی کوشش کی۔ اسی لئے میں نے شراب شروع کر دی تھی کہ مجھے رنج و الم کا احساس نہ رہے! لیکن تم پھر میرے زخموں کو ناخن سے کُھرچنے آئے ہو۔" کرسٹنیا بے اختیار ہو کر وہاں سے نکل جانے کے لئے دروازے کی طرف دوڑی۔

"ٹھہرو تو سہی!" وہ اس کو روکتے ہوئے بولا "میں تمھاری رہائی کی کوشش کرتا ہوں، کرسٹنیا!"

"مجھے رہائی کی ضرورت نہیں ہے۔" اس نے غصّے اور رنج سے کہا "تم خود غرض ہو۔ تم نے مجھے برباد تو کر دیا۔ اب کیا چاہتے ہو؟"

"میں تمھیں یوں نہیں چھوڑ سکتا۔" انٹونیو غمناک لہجے میں بولا۔

"نہیں۔ مجھے تمھاری ضرورت نہیں ہے۔ مجھے جانے دو۔" وہ یہ کہتی ہوئی وہاں سے نکل گئی اور قیدیوں میں جا ملی۔

انٹونیو نے اپنا پورا زور لگالیا۔ تمام حکام کی منت

سماجت کی۔ یہانتک کہ زار سے بھی ملا مگر کسی نے کرسٹنیا کا جُرم معاف نہیں کیا۔ قیدیوں کے روانہ ہونے میں اب صرف ایک رات رہ گئی تھی۔ جب ہر طرف سے ناکامی ہوئی تو وہ شام کو پھر وہاں پہنچا اور کرسٹنیا بہزار دقت علیحدہ کمرے میں آئی۔

"کیوں آئے ہو؟" کرسٹنیا اس کی صورت دیکھتے ہی چیخی۔

"ایک درخواست کرنے! میں التجا کرتا ہوں کہ تم مجھ سے شادی کرلو۔"

"شادی؟ آہ تم سے! لیکن...... اُس بچے کا کیا ہوگا جو گزوں نیچے زمین میں دفن ہے ——— جاؤ تم کسی امیر سے شادی کرو جو تمھارے برابر کی حیثیت کی ہو۔ میں تو صرف اس لئے تھی کہ تمھاری خواہشات پر قربان ہوجاؤں۔"

"بچہ کیسا؟" انٹونیو نے حیرت سے پوچھا۔

.... کرسٹنیا نے تمام واقعات بےکم وکاست بیان کردئے۔ جنھیں سُن کر انٹونیو کی آنکھیں پرنم ہوگئیں۔

"مجھے معاف کردو۔ کرسٹنیا!" اُس نے ضبط کرتے ہوئے کہا۔

"تمھیں معاف کردوں؟ معافی تم اپنے ضمیر کی تسکین کے لئے چاہتے ہو، میرے لئے نہیں۔" کرسٹنیا نے شدّتِ غم سے اپنا چہرہ چھپا لیا، اور پھر بولی "تم دولت مند ہو اور تم نے جو کچھ کیا وہ امیری کے کرشمے ہیں۔ آہ، تم نے اپنی شکل دکھا کر، میری زندگی کو جو پُرسکون ہو چلی تھی، پھر تاراج کردیا۔"

کرسٹنیا چلی گئی ——— انٹونیو روتا رہا۔

دوسرے روز قیدی سائیبریا روانہ کردئے گئے۔

(۶)

سائیبریا کی حدود میں داخل ہوکر، پہلی منزل پر سب لوگ ٹھیر گئے اور وہ ابھی میلوں مسافت کی تھکن دُور کرنے کے لئے بیٹھے ہی تھے کہ گاڑی میں کاؤنٹ انٹونیو بھی وہاں پہنچ گیا۔ میرِ منزل نے اس سے کچھ دیر باتیں کرنے کے بعد، قیدیوں میں کرسٹنیا کو پکارا اور ایک تنہا کمرے میں وہ آہستہ آہستہ داخل ہوئی۔ اُس نے حیرت سے دیکھا کہ انٹونیو خاموش کھڑا ہے۔ دفعتًا وہ بولی "تم؟ ——— تم یہاں بھی آگئے، کیوں؟"

"سُن تو لو۔" انٹونیو نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا "میں تمھیں نہیں چھوڑ سکتا...... مجھے تم سے محبت ہے۔"

کرسٹنیا خاموش رہی۔

انٹونیو کہنے لگا "میں نے اپنی تمام جائداد اور جاگیر غربا کے لئے وقف کردی اور اپنی تمام دولت کسانوں میں تقسیم کردی ہے۔ میں نے سب کچھ چھوڑ دیا ہے۔ اب تو تم مجھے معاف کردو۔"

کرسٹنیا سر نیچے کئے، سب کچھ سُنتی رہی۔

وہ پھر بولا "میں نے انتہائی کوشش کی کہ تمھیں رہا کرواسکوں، کیونکہ مجھے یقین ہے کہ تم نے جُرم نہیں کیا۔ مگر مجھے ناکامی ہوئی۔ اس لئے میں نے سب کچھ تج دیا ہے اور چاہتا ہوں کہ تمھارے ساتھ میں بھی سائیبریا چلوں۔"

"میرے ساتھ؟...... سائیبریا؟" وہ حیرت سے بولی۔ محبت اس پر غالب آرہی تھی۔

"ہاں کرسٹنیا! میرے گناہ بہت زیادہ ہیں اور اُن کو صرف تم ہی دھو سکتی ہو ——— تم مجھے معاف

کردو اور آج سے ہم ایک نئی زندگی شروع کریں گے۔"
انٹونیو نے کرسٹینا کی جانب بڑھتے ہوئے کہا۔

اس دفعہ وہ پیچھے نہیں ہٹی بلکہ اس کے لبوں پر غمگین مسکراہٹ نمودار ہوئی اور اُس نے چپکے سے کہا
"انٹونیو!"

انٹونیو اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے بولا
"کیا تم مجھے معاف کرتی ہو؟"

فرطِ مسرت و محبت میں وہ اُس سے لپٹ گئی
"ہاں.........."

دور دور تک برف پھیلی ہوئی تھی اور قیدی سردی کی شدت سے لرز رہے تھے مگر ان قیدیوں میں دو دل جوشِ محبت سے گرم تھے+کرسٹینا اور انٹونیو ہاتھ میں ہاتھ ڈالے مسکراتے ہوئے اپنے برفستانی سفر پر گامزن ہو گئے۔

ٹالسٹائی

افسانہ عنوان طلب

(۱)

بہار کا آغاز ہو چکا تھا ——— !

نازورہ نے میری طرف اپنے مخصوص انداز سے گھورتے ہوئے کہا "کیوں سلمینی! اگر اب کے ہم کچھ روز کے لئے فردوس نگر ہو آئیں تو کیا اچھا ہو"

میں اُس کی شربتی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتی ہوئی بولی "چلنے میں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں، کیونکہ آجکل فرصت ہے۔ مگر سوال روپے کا ہے، میں ذرا اپنے منگیتر سے گفتگو کرلوں!"

"واہ" نازورہ ذرا تنک کر بولی "تم تو ہر بات میں اپنے منگیتر کو لے بیٹھتی ہو۔ اگر ان دنوں بھی وہاں کا لطف نہ اُٹھایا، تو کیا بڑھاپے میں وہاں جاؤ گی؟ گفتگو کرنا ہی کیا۔ اطلاع کردو۔ وہ خود تمھیں اخراجات کے لئے روپے دیں گے"

میں نے کہا "اچھا! کل صبح جواب دوں گی، میں وہاں جانا تو چاہتی ہوں ——!"

(۲)

میرے منگیتر کی عمر تیس سال سے زیادہ ہوگی، اور گو وہ بہت حسین نہیں تھے، لیکن میں ان کو سب کچھ سمجھتی تھی، کیونکہ میری زندگی اُن سے منسوب ہو چکی تھی۔ علاوہ ازیں کمال عشق نہ سہی لیکن مجھے اُن سے ہمدردی ضرور تھی، جو محبت کے قریب قریب کہی جاسکتی تھی۔

جب دفتر سے تھکے ہارے وہ اٹھے تو راستے میں مجھ سے ملنے آئے۔ شام ہو چکی تھی۔ اور سڑکوں پر لالٹینیں اپنی روشنی پھیلا رہی تھیں۔ میں نے اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد اپنا ارادہ ظاہر کیا تو میں نے دیکھا کہ اُن کا چہرہ اُتر گیا اور وہ خاموش ہوگئے۔ میں نے دوبارہ کہا "......... تو آپ کی کیا رائے ہے؟"

"میں پسند نہیں کرتا کہ تم تن تنہا ان دنوں فردوس نگر جاؤ" اُن کا جواب بڑا سنجیدہ تھا۔

"تن تنہا کیوں؟ میں نازورہ کے ساتھ جاؤں گی"

"عورت کا ہمراہ ہونا کچھ مفید نہیں۔ تم جوان ہو۔ عورت ہو۔ حسین، ایسی حسین کہ ہر شخص ......" انھوں نے کہنا شروع کیا۔ لیکن میں نے بات کاٹ دی اور کہا "میں ایسی باتیں اس وقت نہیں سنوں گی .... آپ چاہتے ہیں کہ دم گھٹ کر مر جائے"

وہ اس سے بڑے متاثر ہوئے اور گھبرا کر بولے "نہیں نہیں سلمینی! تم ضرور ہو آؤ۔ وہاں موسم اچھا ہوگا۔ اور تمھاری صحت بھی بہت اچھی ہو جائے گی"

پھر انھوں نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اور آہستہ سے بولے "پیاری سلمینی! تم ضرور جاؤ...... میں صبح تمھیں الوداع کہنے آؤں گا"

میں فردوس نگر کے خوب صورت خیالی مناظر دیکھنے میں محو ہوگئی۔

دوسرے روز وہ علی الصباح آئے۔ اور انھوں نے مجھے سفر خرچ کے لئے اس قدر روپیہ دیا کہ چار آدمیوں کے لئے کافی ہوتا۔ انھوں نے میرے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے کر اپنی پہنائی ہوئی انگوٹھی کو پھرانا شروع کیا۔ اس انگشتری پر اُن کی چمکتی ہوئی نظریں بار بار پڑ رہی تھیں۔

اتنی دیر میں نازو رہ بھی تیار ہو کر آگئی اور آتے ہی کہنے لگی "ایسا نہ ہو کہ آج کی ٹرین چھوٹ جائے" وہ بھی اُٹھ کھڑے ہوئے "اچھا خدا حافظ .... دیکھو روز خط لکھنا...... بہت طویل......"

میں اپنی خوشی میں پھولی نہ سمارہی تھی۔ ان کی طرف دیکھ کر مسکرائی اور ان کے جانے کے تھوڑی دیر بعد ہم فردوس نگر روانہ ہوگئے۔

(۲)

نازو رہ میری بچپن کی سہیلی تھی، بڑی شوخ اور چلبلی، اور نوجوان مردوں سے مذاق کرنے میں اُسے خاص لطف آتا تھا۔ اس کے باوجود وہ بڑی مخلص تھی اور مجھے یاد ہے کہ اس نے میری خاطر کئی قربانیاں بھی کی تھیں، تمام راستے وہ ایک لال کی طرح چہکتی رہی وہ کبھی مردوں کی خصلت کے متعلق گفتگو کرتی اور کبھی عورتوں کی طاقتِ حسن کی، میں کھڑکی کے شیشے میں سے باہر جھانک رہی تھی اور بڑے بڑے سرسبز درخت بڑی تیزی سے ہماری مخالف سمت میں دوڑ رہے تھے۔ مجھے اس طرح محو دیکھ کر وہ بولی "فردوس نگر میں آجکل بڑی رونق ہوگی، اور بہت سے نوجوان دیکھنے میں آئیں گے، ایک سے ایک حسین ــ!"

میں شرما گئی، لیکن وہ کہے گئی "تم کہیں ایسی لغویت نہ کر بیٹھنا کہ...... کیونکہ...... تم منسوب ہوچکی ہو!"

مجھے یہ بات بڑی ہی بیوقوفی کی معلوم ہوئی۔ میں نے بگڑ کر کہا "کیا تم مجھ کو بھی اپنا جیسا سمجھتی ہو؟ تم کو میرے رشتے کا احترام کرنا چاہیئے!"

وہ شرمندہ سی ہوگئی ــــ لیکن میں نے فوراً ہی مذاق کرنا شروع کر دیا، کہ کہیں وہ نادم ہو کر مغموم نہ ہو جائے۔ وہ اس کی متلاشی ہی تھی، اس نے پھر باتیں شروع کردیں...... چاندنی راتوں کی جبکہ محبت کی کبھی فتح ہوتی ہے، کبھی شکست!

ریل سے اُتر کر ہم بس میں بیٹھ گئے۔ کیونکہ پہاڑی پر ریل نہیں جاتی۔ ہم دونوں کونے میں بیٹھی ہوئی تھیں، اس لئے باتیں کرنے کا آسانی سے موقع تھا۔ اس کے علاوہ گڑگڑاہٹ کی وجہ سے کوئی ہماری گفتگو سُن بھی نہیں سکتا تھا۔

حسبِ عادت اس نے اپنے گھٹنے سے مجھے اشارہ کیا۔ اور میں اُس کی طرف متوجہ ہوگئی۔ اُس نے کان میں کہا "اس ڈرائیور کو دیکھا؟ کیسا بانکا جوان ہے!"

"ہٹو بھی ــــ تمھیں تو بس یہی باتیں رہتی ہیں" میں نے لاپروائی سے کہا۔ مگر جھک کر ڈرائیور کی طرف دیکھنے کی کوشش کی ــــ اگرچہ ناکام رہی!

"کہو تو اس سے ذرا بات چیت کروں؟" اس نے اس طرح کہا گویا مذاق کر رہی ہو۔ "کر لینا ــــ اگر تمھارا جی چاہے" میں نے بھی مذاق میں کہہ دیا۔

"اچھا! ــــ مگر تم خاموش رہنا" اس نے ذرا سنجیدگی سے کہا۔

مجھے کیا معلوم! وہ کیا کرنے والی تھی۔ میں نے کہا

"سب لوگ بیٹھے ہیں، کوئی پاگل پن کی حرکت نہ کر بیٹھنا!"
"تم دیکھتی تو رہو"—— اس نے ڈرائیور کی طرف دیکھ کر کہا،
جوں جوں موٹر آگے بڑھتی تھی، مناظر بہت ہی دلکش ہوتے جاتے تھے، سرسبز پہاڑیاں تھیں، اونچے اونچے درخت تھے، جو پھلوں اور پھولوں سے لدے ہوئے تھے، اور آس پاس کی معطر فضا نے عجب بہار پیدا کر رکھی تھی، چنانچہ میں قدرت کے ان حسین و نازک کھلونوں کے مطالعے میں مشغول ہو گئی۔

بس رُک گئی اور لوگوں نے اُترنا شروع کیا۔ میں نے بھی اٹھنا چاہا۔ لیکن ناروزہ نے میرے زانو کو دبا کر بیٹھے رہنے کا اشارہ کیا۔ میں بیٹھی رہی۔
جب سب لوگ اُتر گئے تو صرف ہم تین شخص باقی رہ گئے، نازورہ کے اشارے پر میں بھی اُتر آئی۔ اس نے مجھ سے کان میں کہا "آہستہ آہستہ چلو!"
ہم تھوڑی ہی دور گئے تھے کہ موٹر ڈرائیور نے زور سے کہا "خاتون! آپ کا یہ بکس رہ گیا ہے!"
نازورہ مسکرائی۔ اور فوراً ہی سنجیدہ بن کر اس طرف مڑی، ڈرائیور قریب آ گیا تھا، وہ بکس کو نازورہ کے آگے رکھ کر بولا "یہ شاید آپ ہی کا ہے، اس پر یہ نام.........آپ ہی ہیں!"
"شکریہ!" وہ مسکرا کر بولی "جی ہاں! میرا نام نازورہ اور ان کا نام سلمیٰ ہے....."
"خوب!......" وہ میری طرف دیکھ کر مسکرایا۔ اور میرا نام سمری ہے.........مجھے آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی!"

سمری نوجوان تھا، اور شاید خوبصورت بھی، میں نے اس کا کوئی فیصلہ نہیں کیا۔ کیونکہ —— میری منگنی ہو چکی تھی۔
جب اُس نے اپنا تعارف کرا کے ہاتھ ملایا تو مجھے یاد ہے کہ اس نے نازورہ کا ہاتھ اتنی دیر اپنے ہاتھ میں نہیں لیا، جتنا کہ میرا، اگرچہ میں نے ہاتھ جلدی چھڑانے کی کوشش کی لیکن اس کی گرفت مردانہ تھی۔
نازورہ اس سے باتیں کرتی رہی، اور میں ایک طرف کھڑی ہو گئی۔ آخر میں نے محسوس کیا کہ وہ دونوں دوست ہو گئے ہیں۔ وہ نازورہ سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہا تھا۔ اور کبھی کبھی کنکھیوں سے میری طرف بھی دیکھ لیتا تھا۔
اُس نے کہا "میں اپنے کام سے فارغ ہو کر شام کو آپ کے پاس آیا کروں گا۔ اور بہت جلد آپ کو یہاں کی سیر کرا دوں گا۔ آپ کہاں ٹھیریں گی؟"
"اسی پہاڑی پر کسی جگہ —— لیکن آپ معلوم کیسے کریں گے؟" نازورہ نے ایک طرف اشارہ کر کے کہا۔
"اس کی آپ فکر نہ کریں، میں سب معلوم کر لوں گا۔ یہاں کے چپے چپے سے واقف ہوں، اچھا! اب خدا حافظ!" یہ کہہ کر اس نے نازورہ سے ہاتھ ملایا۔ اور میری طرف بھی بڑھنا چاہتا تھا۔ لیکن میں کترا کر بچ گئی۔
ہم نے فردوس نگر میں نیلی پہاڑی پر ایک مکان کرایہ پر لے لیا، لیکن چونکہ یہ جگہ بے حد پُر فضا تھی اور آس پاس کے مناظر نہایت دلکش تھے، اس لئے

اس کا کرایہ نسبتاً زیادہ دینا پڑا۔ ہمارے مکان سے تھوڑے فاصلے پر ایک "راگ گھر" تھا جہاں سے ہر وقت موسیقی کی تانیں بلند ہوتی رہتی تھیں۔

سمری قریب قریب روز آتا اور ہم اس کے ساتھ بہت دیر تک سیر کرتے رہتے، شاید نازورہ نے اس کو بتا دیا تھا کہ میں منسوب ہو چکی ہوں، اس لئے وہ مجھ سے بات چیت نہیں کرتا تھا۔ صرف کبھی کبھی مجھے اس طرح دیکھ لیا کرتا تھا کہ نازورہ نہ دیکھے۔

شام کے وقت نازورہ اس کے ساتھ تنہا بھی چلی جاتی تھی، اور مجھ کو ایک دو گھنٹے اکیلا رہنا پڑتا تھا۔ تھوڑے دنوں بعد سمری کی آمد و رفت اور بھی زیادہ ہو گئی یہاں تک کہ اس نے نازورہ کو اپنے خاندان والوں سے بھی ملایا۔ اور وہ کبھی کبھی ان لوگوں کے ہاں بھی مدعو ہوتی۔ ایک آدھ دفعہ نازورہ نے مجھ سے کہا بھی کہ میں چل کر وہاں بلوں بُلوں، لیکن میں نے پسند نہیں کیا۔

میں کئی کئی صفحات کا خط اپنے منگیتر کو روزانہ لکھتی اور بلا ناغہ ان کا خط بھی آتا، وہ اپنے ہر خط میں لکھتے "دیکھو بدل نہ جانا" جس سے میں خفا ہو جاتی کہ کیا یہ میری کوئی چڑ بنالی ہے، بدلنا نہ ہوا کوئی مذاق ہو گیا۔ میں اپنے خطوں میں ہر روز کے مشاغل اور سیر و تفریح کے حالات لکھتی، اور یہ کہ میں بہت خوش ہوں۔ البتہ آپ کی عدم موجودگی کا مجھے خیال رہتا ہے، میں نے نازورہ کی "دلچسپ حرکتوں" کا بھی تذکرہ کر دیا۔ اور سمری سے اس کی دوستی کے حالات بھی کچھ نہ کچھ لکھتی رہتی تھی۔

ایک شام کو جب نازورہ سمری کے ساتھ چہل قدمی سے واپس آگئی اور سمری چلا گیا تو اُس کو ایک خط ملا۔ مجھے نہیں معلوم اس میں کیا لکھا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ کپڑے پہن کر تیار ہو گئی۔ اور بولی "........ مجھے اس وقت بیگم حارث کے ساتھ کھانا کھانا ہے۔ اس کے علاوہ ناچ بھی ہے۔ اس لئے میں رات گئے واپس آؤں گی۔ آج سمری کو کہیں کام ہے اس لئے وہ وہاں موجود نہ ہوگا، سچ پوچھو تو اس کے بغیر مجھے کچھ لطف نہیں آتا ــــ تمہاری تو منگنی ہو چکی، مگر سلیمنی! مجھے تو وہ بہت اچھا معلوم ہوتا ہے، اور جب کبھی وہ مجھے اپنے سینے سے ...." میں اس کی طرف حیرت سے تکنے لگی۔ "........ لگا لیتا ہے تو میں سمجھتی ہوں کہ فردوس اسی کا نام ہے۔ شاید وہ اپنے کام سے واپسی پر یہاں سے گزرے تو اس سے کہہ دینا کہ میں بیگم حارث کے ہاں اس کی سخت منتظر ہوں"۔

"اچھا" میں نے کہہ دیا اور وہ باہر چلی گئی۔

(۵)

رات کے نو بجے ہوں گے کہ میں کھانے سے فارغ ہو کر دریچے کے پاس کھڑی ہو گئی اور باہر کے فردوسی مناظر دیکھنے لگی۔ آج چودھویں رات تھی اور ماہِ کامل رواں آسمانی پر پوری تابانی سے جلوہ فگن تھا۔ خوش گوار ہوا کے جھونکے شبنم کے سبز پتوں سے راز و نیاز میں مصروف تھے، اور "راگ گھر" میں کوئی بربط بجا رہا تھا۔ اس وقت میرے دل میں آئی کہ باہر چلوں اور تھوڑی دور چہل قدمی کر لوں حالانکہ اس سے پہلے میں رات کے وقت تنہا نہ نکلتی تھی۔ دروازہ بند کر کے میں ابھی تھوڑی ہی دور گئی ہوں گی کہ سمری نے "سلیمنی! ــــ" کہہ کر آواز دی۔ اور میرے برابر آگیا۔

پیشتر اس سے کہ وہ کچھ کہتا میں نے جلدی سے کہہ دیا، "نازورہ مسز حارث کے ہاں گئی ہوئی ہیں اور آپ کی منتظر ہوں گی اس لئے آپ وہاں جلدی چلے جایئے"۔
وہ لاپروائی سے بولا "نہیں! میں نہیں جاؤں گا۔ آؤ ذرا وہاں چلیں۔ یہ کتنا دلفریب وقت ہے!"
میں نے سوچا کہ سمری کوئی بالکل اجنبی بھی نہیں۔ اس کے علاوہ دلفریب مناظر سے لطف اندوز ہونے کا اشتیاق مجھے مجبور کر رہا تھا کہ چلنے کی حامی بھر لوں۔
چلتے چلتے اُس نے دفعتہً اپنے ہاتھ میں میرا ہاتھ لے لیا اور کہنے لگا"—— تم جانتی ہو سلیمنی کہ میں یہاں کیوں آتا ہوں؟"
اُس کی اس جسارت پر مجھے خفا ہو جانا چاہئے تھا، لیکن برخلاف اس کے مجھے کچھ لذت سی محسوس ہوئی۔ میں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا وہ گلاب کی طرح کھلا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کی چمک میرے دل میں اُتر گئی۔ میں نے توقف کے بعد کہا"....... ہاں! آپ نازورہ کے پاس آتے ہیں، اُن سے آپ کی دوستی ہے"۔
اُس نے آہ سرد بھری، اور آہستہ سے گویا ہوا، "....... نہیں سلیمنی! دراصل میں صرف تمھارے لئے یہاں آتا ہوں، لیکن چونکہ تم شرمیلی ہو۔ اور تم بےتکلفی سے گفتگو نہیں کرتی تھیں اس لئے نازورہ سے راہ و رسم بڑھانی پڑی"۔
میں کچھ کچھ سمجھ رہی تھی۔ میں نے بغیر اُس کی طرف دیکھے ہوئے کہا "مجھ کو اب گھر واپس جانا چاہئے مبادا نازورہ واپس آجائیں"۔
"نہیں! وہ نصف رات سے پہلے نہیں آئیں گی۔ سامنے ایک بہت ہی پُرفضا اور علیحدہ قطعہ ہے۔ وہاں سے قدرتی موسم کی بہار اُٹھانے میں ایک خاص لطف آتا ہے" سمری نے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ا
مجھ سے انکار کرتے نہ بنا، اور تھوڑی دیر میں ہم ایک باغ میں داخل ہو گئے۔ جھیل کا پانی چاندنی رات میں لہریں لے رہا تھا۔ اور اس کے کنارے سنگِ مرمر کی چار سیڑھیاں اس طرح نمایاں معلوم ہوتی تھیں جیسے سنہری دھوپ میں تاج محل کے گنبد! میں سیڑھی پر ایک طرف سرک کر بیٹھ گئی اور باوجود میرے کئی دفعہ کھسکنے کے وہ میرے قریب ہی ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ ہمارے جسم ایک دوسرے سے مس کرنے لگے۔
تھوڑے ہی فاصلے پر راگ گھر میں سے موسیقی کی بسمل کر دینے والی صدائیں فضا میں منتشر ہو رہی تھیں۔ چاندنی رات میں تنہائی تھی، اور جوانی! باوجود میرے ضبط کرنے کے میرے جذبات میں ہلچل مچی جا رہی تھی۔ اور جبکہ میں ایسی حالت میں اپنے آپ کو بھولی ہوئی تھی، سمری نے مجھے اپنی آغوش میں لے لیا۔ اس کے ہاتھ میری کمر کے گرد حائل ہو گئے، اور اس کے حلقے کی گرفت دم بدم مضبوط ہوتی گئی، اس وقت میرے جذبات اور محسوسات کی جو کیفیت تھی، میں بیان نہیں کر سکتی۔
اس نے اپنی پیشانی میرے سینے پر جھکا دی، اور باوجود میرے ارادے کے میں اپنے آپ کو اس سے الگ کرنے کی کوشش میں کامیاب نہ ہو سکی۔
میں نے بصد مشکل کہا"...... کیا کر رہے ہو...... تم سمری؟...... میری منگنی ہو چکی ہے......!"
وہ شکستہ آواز میں بولا "کچھ حرج نہیں... پیاری...... جب دو دل ملے ہوں تو فکر کی کیا ضرورت ہے؟"

میں تعجب کرنے لگی کہ اُسے میرا دل ملنے کی کیسے خبر ہو گئی کہ......یکبارگی اس کے لب گرمیٔ جوش سے میرے......

یہ میرے گناہ کی سب سے تاریک رات تھی!

میں واپس آکر سونے کی تیاری کر رہی تھی کہ نازورہ ہنستی ہوئی گھر میں داخل ہوئی اور کپڑے اُتارتے ہوئے بولی "سلیمی! کیا تم سو گئیں؟"

میں دل میں ایک جرم سا محسوس کر رہی تھی، چونک پڑی اور فوراً کہا "نہیں! ابھی نہیں!"

"کافی دیر ہو گئی، میرا خیال تھا کہ تم اکیلی ہو گی۔ اس لئے آنے میں جلدی کی مگر پھر بھی نہ آسکی۔ کیونکہ مجھے سمری کا انتظار تھا، سلیمی! تم نہیں سمجھ سکتیں کہ جب کوئی کسی کے دامِ محبت میں گرفتار ہو جاتا ہے تو اس کو انتظار کی گھڑیاں کس قدر بے چین کر دیتی ہیں!"

مجھے پھر ایک مجرمانہ کیفیت محسوس ہوئی اور میں اس کی کسی بات کا جواب نہ دے سکی، بالآخر مجھے جس چیز کا اندیشہ تھا وہ ہوئی اور مجھے ایسا محسوس ہونے لگا کہ میرا جی مجھے ملامت کر رہا ہے،

اس نے یکبارگی کہا: "......سمری تو یہاں نہیں آئے؟"

میری قوتِ گویائی سلب ہو چکی تھی۔

وہ میرے قریب آکر ذرا زور سے بولی "کیا نیند آرہی ہے؟ باتیں کرتے کرتے سونے لگتی ہو، سمری آئے تھے کیا؟"

"ہاں! آئے تھے" مجھے کہنا پڑا۔

"مجھے پوچھتے تھے؟" اس نے میرے پلنگ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"ہاں میں نے اُن سے کہہ دیا تھا کہ نازورہ تمھارا انتظار کر رہی ہوں گی" میں بولنے کی کوشش کرتی تھی۔ مگر میری آواز نہیں نکلتی تھی۔

"ہاں! سلیمی! میں اُن کا انتظار کرتے کرتے تھک گئی۔ بالآخر چلی آئی......وہ سن کر کیا کہنے لگے؟" اس نے عجیب انداز سے کہا۔

"کچھ نہیں!" میں نے اپنے دلی جذبات پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"کچھ بھی نہیں؟ تعجب ہے.........وہ فوراً ہی چلے گئے یا کچھ دیر ٹھیرے بھی؟" خلافِ عادت وہ سنجیدگی سے گفتگو کر رہی تھی۔

"ٹھیرے ــــ بہت دیر......" زبان میرے قابو میں نہ رہی۔ "تم سے باتیں کرتے رہے......"

"کچھ میرے متعلق بھی گفتگو ہوئی؟" اس نے حیرت سے کہا۔

"نہیں! تمھارے متعلق کچھ بھی گفتگو نہیں ہوئی" میں نے صاف صاف کہہ دیا ــــ!

"بس گھر میں بیٹھی رہیں یا باہر بھی نکلی تھیں؟" اس کی گفتگو میں حد سے زیادہ متانت تھی،

"میں سیر کی غرض سے باہر جا رہی تھی کہ وہ آگئے اور میرے ساتھ......" میں نے تمام واقعہ بے کم و کاست سُنا دیا۔

مجھ پر عجیب کیفیت طاری تھی، اور تمام واقعات من وعن بیان کرتے ہوئے مجھے اس کا خیال بھی نہیں آیا کہ اِن سے نازورہ کو تکلیف ہو سکتی ہے۔ بہر حال جب میں ختم کر چکی اور نازورہ کی طرف دیکھا تو اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے۔

وہ دفعتاً کھڑی ہوگئی، اور دیوانہ وار اِدھر اُدھر ٹہلنے لگی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُس کے دل میں تلاطم مچا ہوا ہے۔

اس نے بصد دقت کہا "سلینی! مجھے تم سے ہرگز اس کی اُمید نہ تھی .... آہ! تم نے میرے محبوب کو مجھ سے چھین لیا!"

اس فقرے سے میں بڑی متاثر ہوئی اور میرے بھی آنسو نکل پڑے۔ یہ سب کچھ ہوا لیکن میں نہیں جانتی اس کا ذمہ دار کون تھا۔

اس نے رات کا تمام حصہ اسی حالتِ اضطراب میں گزارا، اور صبح ہوتے ہی وہ اپنا ٹرنک لے کر گھر سے روانہ ہوگئی۔

میں نے سوچا کہ نازورہ کے پیچھے سیر کیا خاک ہوگی، میں بھی چلی چلوں، لیکن نہ جانے فردوس نگر چھوڑنے کو اب جی کیوں نہ چاہا۔

(۶)

دوسرے روز میری طبیعت بڑی اُلجھن میں رہی، اور میں نے اپنے منگیتر کو خط بھی نہیں لکھا۔ ذرا دن چڑھے میں نے لباس تبدیل کیا اور کوشش کی کہ رات کے واقعات کو بھول جاؤں۔ اور واپس وطن چلی جاؤں مگر میں کچھ ایسے تذبذب میں تھی کہ کسی طرح کوئی فیصلہ نہ ہونے پاتا تھا۔ اسی اثنا میں سمری نہایت خوش نما لباس میں اندر داخل ہوا۔ میں نے چاہا کہ ایک دم اس کی طرف سے مُنھ پھیر لوں مگر رات کے واقعات —— جھیل کے کنارے چاندنی رات میں ..... محبت کی سرگوشیاں ...... میرے سامنے آگئیں، اور میں خود بخود اس کے استقبال کو آگے بڑھی۔

نازورہ کے افسوس، غصے اور روانگی کے متعلق سُن کر اُس کو قطعاً ملال نہ ہوا۔ بلکہ مجھے تو ایسا معلوم ہوا کہ اُس نے اطمینان محسوس کیا ہے۔

"راگ گھر" میں سے جلترنگ اور سرود کی نہایت مسرور آگیں آوازیں آرہی تھیں، اور سامنے پہاڑی کے ساتھ ساتھ بگلوں کی ایک لمبی قطار اپنے سفید بازوں کو جنبش دیتی ہوئی گزر رہی تھی۔

سمری میرے قریب آگیا، اور میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر بولا "پیاری سکینی! —— یہ مجھے بڑا اچھا معلوم ہوا۔"

اس کے بعد ہماری باتیں ہوتی رہیں، اس نے کہا "...... کچھ حرج نہیں ...... منگنی ہی تو ہوئی ہے، نکاح تو نہیں۔ میرا خیال ہے جب تک محبت نہ ہو کسی سے شادی کرنی حماقت ہے۔"

"بہر حال" .... میں نے کہہ کر بات ٹالنی چاہی، لیکن وہ مصر ہوا کہ میں اپنے منگیتر سے تعلقات قطع کرکے سمری سے شادی کرلوں۔

میں راضی ہوگئی —— دل سے مجبور ہوکر —— اور وعدہ کرلیا۔

میں وہاں ایک ماہ تک مقیم رہی، اور اس عرصے میں اپنے منگیتر کو ایک خط بھی نہیں لکھا۔ میں نے ایک آدھ دفعہ سوچا کہ خط تو لکھ دوں، لیکن دل ہر بار اچاٹ ہو جاتا۔ اُن کے خط روز آتے، لیکن میرے لئے اب وہ جاذبِ نظر نہ ہوتے۔

ایک دن سمری نے کہا "....... وہاں شائر میں بڑے کارخانے کے پیچھے ...... ولیم پیلس میں میرے چچا رہتے ہیں۔ تم اُن سے جاکر ملو۔ میں تمھیں ایک خط

لکھ دیتا ہوں، اُس خط کو پڑھ کر وہ تمہارا استقبال کریں گے۔ اور تمہیں اپنی بیٹی سمجھیں گے۔ تھوڑے دنوں بعد میں بھی وہاں آجاؤں گا اور چچا ہی ہماری شادی رچائیں گے۔ لارڈ ولیم کا نام تو تم نے ضرور سُنا ہوگا؟ میری تمام جائداد میرے والد نے انھی کی نگرانی میں منتقل کردی تھی اور انھوں نے یہاں مجھ کو تمام کام سیکھنے کے لئے بھیجا ہے، تاکہ اس میں مہارت پیدا کرکے اعلیٰ پیمانے پر کام شروع کردوں...... میرا خیال ہے کہ تم آج ہی شام کی گاڑی سے روانہ ہوجاؤ۔"

میرا دل جانے کو نہیں چاہتا تھا۔ لیکن اس قدر شاندار مستقبل دیکھ کر مجھے بڑی مسرت ہوئی اور لارڈ ولیم کی بہو کے خیال نے مجھے ذرا مغرور سا بنا دیا۔ سمری نے اپنے چچا کے نام ایک خط لکھ کر مجھے دیا، اور میں شائر روانہ ہوگئی ——۔

(۷)

یہ سوچ کر کہ اب سمری سے شادی ہونے والی ہے میں نے اپنے منگیتر کو اطلاع دے دی کہ مجھ سے اسٹیشن پر مل لیجیے، میرا ارادہ تھا کہ اُن سے صاف صاف کہہ دوں، اور انگشتری بھی واپس کردوں۔ چنانچہ اسٹیشن پر فلپ موجود تھے، مجھے دیکھتے ہی وہ میری طرف لپکے، لیکن میں نے فوراً ہی بھانپ لیا کہ اُن کے قدم بھاری تھے، اُن کا چہرہ بیحد افسردہ تھا۔

وہ میرے بالکل قریب آگئے۔ مگر نہ وہ کچھ بات کرسکے اور نہ میں کچھ کہہ سکی، تھوڑی دیر بعد ہم دونوں موٹر میں بیٹھ گئے۔ اور بالآخر میں نے سخت دل کرکے کہنا شروع کیا "........ مجھے بڑا افسوس ہے فلپ ...." اور انگشتری اُتار کر اُن کو دیتے ہوئے بولی "........ میں تم سے شادی نہیں کرسکتی ......"

"مجھے نازورہ نے پہلے ہی بتادیا تھا" انھوں نے رُک رُک کر کہا۔ موٹر تیزی سے جا رہی تھی۔ اور میرا گھر قریب آگیا تھا۔ اُن کی خاموشی اور غمناک چہرہ دیکھ کر میں نے محسوس کیا کہ میرے دل کی گہرائی میں اشکوں کے چشمے اُبلا چاہتے ہیں۔

موٹر گھر کے سامنے رُکنے والی تھی کہ وہ دبی زبان سے بولے "سلینی! اگر تم کسی اور سے شادی نہ کرو یا بعد میں تمھارے تعلقات اچھے نہ رہیں، تو مجھے یاد کرلینا۔"

یہ سُن کر میرے تن بدن میں آگ لگ گئی، اور میں نسوانی ہمت سے کام لے کر بولی "یہ کیا کہہ رہے ہو فلپ! تمھیں اس قسم کی گفتگو کرتے ہوئے شرم نہیں آئی؟ مجھے یہ الفاظ سُن کر بڑا رنج ہوا۔ اگر تم کو مجھ سے واقعی محبت ہوتی تو تم میری مسرت پر بجائے افسوس کرنے کے خوش ہوتے۔ تمھاری باتوں سے حسد اور رقابت کی بُو آتی ہے، خدانخواستہ ایسا ...... کیوں ہونے لگا......؟"

میں موٹر سے اُتر کر اپنے گھر چلی آئی۔ مجھے معلوم ہے کہ میرے اُترتے ہی فلپ بھی اُترے، اور چاہتے تھے کہ معافی مانگ لیں۔ مگر میں جلدی سے اندر داخل ہوگئی، اس لئے وہ مجبور ہوکر واپس لوٹ گئے۔

دوسرے روز شام کو میں نے اپنی بہترین پوشاک پہنی اور خوش خوش سمری کا خط لے کر بڑے کارخانے روانہ ہوئی۔ اس وقت جو محسوسات میرے دل میں تھے اُن کا بیان کرنا ناممکن ہے، میں ابھی سے اپنے آپکو کسی لارڈ کی بہو سمجھنے لگی تھی۔ اور خوش ہو رہی تھی کہ محبت کے ساتھ امارت بھی مل رہی ہے۔

بڑے کارخانے کے پیچھے جاکر میں نے ولیم ہیلیس کو تلاش کیا۔ گھنٹوں اسی جستجو میں لگ گئے۔ مگر وہاں کوئی مکان بھی اس نام کا نہ تھا۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ اس کے بعد میں نے لوگوں سے لارڈ ولیم کو دریافت کیا کہ شاید انھوں نے مکان تبدیل کرلیا ہو۔ لیکن سب نے یہی کہا کہ اس نام کا یہاں کوئی شخص نہیں رہتا۔ میرے پیروں تلے کی زمین نکل گئی "۔۔۔۔ کیا ۔۔۔۔ یہ سچ ہو سکتا ہے؟۔۔۔۔ " میں پریشانی کے عالم میں ادھر سے اُدھر پھر رہی تھی، لیکن منزل مقصود کا کہیں پتہ نہ تھا۔ میں تھک کر مجبور ہو گئی، خط کھول کر دیکھا ـــ اندر خالی پرچہ رکھا تھا۔!

غصّے اور رنج نے مجھے دیوانہ بنادیا اور میں غصّے میں بھری ہوئی سیدھی فردوس نگر پہنچی تو دیکھا کہ سمری بس کے پاس کھڑا ہوا سواریوں کا انتظار کر رہا ہے بھوکی شیرنی کی طرح میں اس کی طرف لپکی لیکن اس نے مجھے دیکھ کر میری طرف سے منہ پھیر لیا اور جب میں بالکل قریب پہنچی تو وہ یہ کہہ کر "عورتیں بے وقوف ہوتی ہیں، اور میں اتنا گدھا نہیں کہ تم سے شادی کرتا" جلدی سے بس میں سوار ہو گیا۔

میرا سینہ دھڑک رہا تھا اور میں اپنے کئے پر نادم تھی۔ میں نے سوچا کہ "اب فلپ کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہی، اس لئے شاید ۔۔۔۔ خودکشی ۔۔۔۔۔ بہتر ہے۔۔۔۔۔"

میں ابھی تک کوئی فیصلہ نہ کر چکی تھی، کہ معاً ایک خیال میرے دل میں آیا

اس ارادے سے پہلے فلپ کی بھی آزمائش کر لوں۔ چنانچہ میں نے اس کو فردوس نگر سے اپنی روانگی کی اطلاع دے دی۔

(۸)

اس دفعہ بھی ان کی صورت سے حسرت و یاس ٹپک رہی تھی، ان کو دیکھتے ہی میرے آنسو نکل پڑے۔ وہ کچھ نہیں سمجھے، اور بمشکل تمام انھوں نے مجھ کو موٹر میں بٹھایا۔ گھر پہنچ کر میں نے اُن سے تمام واقعات بیان کر دئے اور گڑگڑا کر بولی "کیا مجھے معاف کر دوگے؟"

انھوں نے میرے ہاتھ فوراً پکڑ کر لبوں سے لگا لئے اور وہ گلوگیر آواز میں بولے "تم آگئیں ۔۔۔۔۔!! ۔۔۔۔ سلیمی !۔۔۔۔۔۔" اور جیب میں سے وہی انگشتری نکال کر میری اُنگلی میں دوبارہ پہنا دی۔

غیر ارادی طور پر اس دفعہ میں نے اس انگوٹھی کو جسے میں ایک بار اُتار چکی تھی چوم لیا۔

ہماری شادی ہو گئی ـــ!

فلپ مجھ سے اس گرمی اور جوش کے ساتھ محبت کا اظہار نہیں کرتے، اور نہ ہی اس مضبوط گرفت سے مجھے اپنے سینے سے لگاتے ہیں جس طرح ۔۔۔۔ سمری نے ۔۔۔۔ جھیل کے کنارے چاندنی رات میں ۔۔۔۔ سنگ مرمر کی سیڑھیوں پر ۔۔۔۔ لیکن پھر بھی میں جانتی ہوں کہ وہ مجھے سچے دل اور خلوص کے ساتھ چاہتے ہیں۔ اُن کی باتوں میں خوشامد نہیں بلکہ حقیقت ہوتی ہے اور اُن کے ہر فعل سے وہ چیز مترشح ہے جس کی ایک عورت ـــ شریف عورت کو ضرورت ہے۔

نامعلوم

اپنے بل لی

برسوں بیتے ——
ساحلِ سمندر پر پھیلی ہوئی سلطنت میں ایک دوشیزہ رہتی تھی۔
شاید آپ اُسے جانتے ہوں۔ اسکا نام اینے بل لی تھا۔
اُس کے دل میں سوائے اس کے اور کوئی خیال نہیں آتا تھا کہ وہ مجھ سے محبت کرے اور میں اُس سے محبت کروں۔

میں بچہ تھا اور وہ بھی بچی تھی۔
ساحلِ سمندر پر پھیلی ہوئی اُس سلطنت میں۔
لیکن ہم دونوں کے جذبات، عشق کی حدود سے آگے نکل چکے تھے —— اور اس قدر آگے کہ فردوسی فرشتے بھی ہم دونوں پر رشک کرنے لگے۔
اور یہی وجہ تھی کہ بہت دن گزرے —— کسی سموم جھونکے نے اس کی روح قبض کرلی۔
اس کے شریف النسل رشتے داروں نے اُسے مجھ سے جُدا کرکے لحد کی آغوش میں سُلادیا —— ساحلِ سمندر پر!
یہ فرشتے، جنہیں ہماری جیسی نصف مسرّت بھی میسّر نہ آتی ہوگی، ہم دونوں سے حسد کرتے تھے۔

ہاں! یہی وجہ تو تھی (اس سلطنت کے سب باشندے جانتے ہیں) کہ بادِ سموم کے ایک جھونکے نے میری اینے بل لی کو مجھ سے چھین لیا۔

مگر ہماری محبت اُس سے بھی گہری تھی۔
جو ہم سے معمر لوگوں کے دلوں میں ہوتی ہے۔
اس لئے (سچ پوچھئے تو) نہ آسمانی فرشتے میری رُوح کو خوبصورت اینے بل لی کی رُوح سے جُدا کرسکتے تھے۔
اور نہ ارضی فرشتے۔

—— کیونکہ چاند کبھی نہیں چمکتا جبتک کہ خوابوں میں اینے بل لی جلوہ فگن نہیں ہولیتی۔
اور ستارے کبھی نہیں جگمگاتے تاوقتیکہ میری قوتِ تخیلہ حسین اینے بل لی کی منوّر آنکھیں تخلیق نہیں کرلیتی۔
اور اس طرح میں تمام رات اپنی محبوبہ، اپنی زندگی اور اپنی دُلہن کے پہلو میں لیٹا رہتا ہوں ——
جہاں وہ اپنی تربت میں آرام کر رہی ہے!
اور سمندر زیریں لہجے میں اُسے یاد کر رہا ہے!!

شادی

شام ہوگئی۔ دُولھا آگیا، اور شادیانے بج رہے ہیں۔ کمرے میں زرو جواہرات پر روشنی جگمگا رہی ہو اور چہرے خوشیوں سے چونچال ہیں۔ دُلھن اور کنور کے کپڑوں میں گرہ باندھ دی گئی جو شادی کی نشانی ہے۔

اتنے میں بگل بجتا ہو اور ایک جنگجو اندر گھس آتا ہو۔ لوگ گھبرا کر اُچھل پڑتے ہیں۔ سنتری کا سانس پھولا ہوا ہو۔ باغیوں نے راجدھانی پر حملہ کر دیا ہو۔ وہ چیختا ہو۔ "رانا رام سنگھ لڑائی کے میدان میں جا رہے ہیں۔ انکو سب کی مدد کی ضرورت ہو۔ چلئے! ہر راجپوت کو اپنی لاج کے لئے چلنا چاہیئے۔"

"مارواڑ کے رانا رام سنگھ کی فتح ہو"! بہادروں کی آوازیں گونجتی ہیں۔

"مارواڑ کے رانا رام سنگھ کی فتح ہو"! کنور چیختا ہو۔ دُلہن کا دل اس آواز پر کانپ اٹھتا ہو اور آنکھوں میں آنسو بھر آتے ہیں۔

"اپنی لاج کے لئے آؤ راجپوتو!" سنتری زور سے کہتا ہو۔ "آؤ! اے میتری کے کنور! اب وقت نہیں رہا۔"

شادیانے تھم گئے۔ دُولھا لگن کی گرہ کھولتا ہو۔ اپنی دُلہن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہتا ہو۔ "الوداع رانی! مجھے جنگ اور موت بُلا رہی ہے۔"

شادی ہی کے لباس میں دُولھا گھوڑے پر سوار ہوکر سرپٹ دوڑتا ہو۔ ہزار و شمعیں بُجھ گئیں۔ گردن میں ہار اور سر پر شادی کا تاج پہنے کنور میدانِ جنگ میں پہنچ جاتا ہو۔

دُلہن کی ماں رونے لگتی ہو۔ "اپنا شادی کا لباس اُتار دے اے بدنصیب بچّی!"

لیکن بیٹی جواب دیتی ہو "نہیں۔ رہنے دو ماں! میں میتری جا رہی ہوں کہ اپنے کنور کو تلاش کر لوں۔"

جب وہ اپنی شاندار پالکی میں سوار ہوتی ہو تو برہمن اسے اشیرباد دیتے ہیں۔ جب وہ محل کے دروازوں پر پہنچتی ہو تو اندھیرے میں آوازیں سُنائی دیتی ہیں۔ "کون ہو؟ باجے کو بند کرو۔ میتری کا کنور لڑائی میں مارا گیا ہو۔ ہم اس کی چتا جلانے جمع ہوئے ہیں۔"

دُلہن پالکی میں سے باہر آتی ہو اور کہتی ہو "بگل بجاؤ نفیری بجاؤ۔ شادی مکمل ہوگئی۔ لگن کا بندھن پھر باندھا جائے گا۔"

وہ میتری کے کنور کے پاس آتی ہو جو عروسی لباس میں چتا پر لیٹا ہوا ہو۔ وہ اُس کے کپڑوں سے اپنے کپڑوں کی گرہ باندھتی ہو اور اس کا سر گود میں رکھ کر اس کے سرد چہرے کو بوسہ دیتی ہو۔

پروہت اسے دُعا دیتے ہیں اور کہتے ہیں "تم نے موت کو فتح کر لیا ہو۔"

چتا میں شعلے بھڑکنے لگتے ہیں۔ شادی مکمل ہوگئی۔

شاہجہاں (مئی ۱۹۳۶ء) ——— ٹیگور

عجیب بھکاری

"جاگو اے شہریو! جو کچھ تمھارے پاس ہے لے بدھ کے نام پر اس کشکول میں دے دو۔" یہ آواز شاہی بستی سروستی کی گلیوں میں گونجتی ہے۔

مشرقی آکاش پر روشنی نمودار ہونے لگی ہے۔ لیکن بستی نیند میں مدہوش ہے۔ کوئل کوک رہی ہے۔ آواز آرہی ہے "سُنو! بادل اپنا سب کچھ دھرتی کو دے دیتے ہیں۔ تجنے سے بہتر کوئی چیز نہیں۔"

بادشاہ سُنتا ہے اور امارت کے بے سود ہونے پر غور کرتا ہے۔ امرا معاً دینا تج دینے کا خیال کرتے ہیں۔ ایک لڑکی آنسو بہانے لگتی ہے۔ لیکن وجہ نہیں جانتی بسنت کی خوشیاں پھولوں کا مسلا ہوا ہار معلوم ہوتی ہیں۔

کھڑکیاں کھل جاتی ہیں اور مرد اور عورتیں ایک راہب کو دیکھتی ہیں۔ وہ بازاروں میں اکیلا گشت کر رہا ہے۔ تاجر اُسے زر و جواہر پیش کرتے ہیں۔ وہ اُنھیں لوٹا دیتا ہے اور اپنے خالی کشکول کو اوپر اٹھائے ہوئے کہتا ہے۔ "سُنو! اے شہریو! اپنے مالک کو وہ دو جو اپنے لئے بہترین سمجھتے ہو۔"

بادشاہ نادم ہو کر چلا جاتا ہے۔ تاجر شرمندہ ہو کر واپس ہو جاتے ہیں۔ کوئی بھی مناسب نذر نہ لا سکا۔ بستی کی تمام دولت اس عجیب بھکاری کے قدموں میں ٹھکرائی ہوئی پڑی ہے۔

وہ دولت مند بازاروں کو چھوڑ کر اندھیری گلیوں میں چلا جاتا ہے۔ جہاں مفلسی چھائی ہوئی ہے۔ یہاں ایک عورت اسکی آواز سُنتی ہے۔ اور مٹی کی جھونپڑی میں سے باہر نکلتی ہے۔ وہ اس کے قدموں کی خاک اُٹھاتی ہے اور کہتی ہے ذرا ٹھیرو۔ پھر دروازے کی آڑ میں کھڑے ہو کر وہ اپنے پھٹے پرانے کپڑے اتار کر اسکے ہاتھوں پر پھینک دیتی ہے۔ اس نے اسے اپنا سب کچھ دیدیا۔ وہ چھپی ہوئی برہنہ کھڑی ہے۔ راہب کا چہرہ شعلے کی طرح چمک اٹھتا ہے۔ "تیرا بھلا ہو! اے ماتا تو نے مجھے بادشاہ کی دولت سے بھی کہیں زیادہ دے دیا ہے۔"

اور وہ ان چیتھڑوں کو اپنے سینے سے چمٹا لیتا ہے۔ اور اپنے مالک پر کھینٹ چڑھانے کے لئے چلا جاتا ہے۔

شاہجہاں (مئی سنہ ۱۹۳۶ء) —— رابندر ناتھ ٹیگور

گُلِ پژمُردَہ

سوئیٹزرلینڈ کے پہاڑی علاقوں میں لوسیرن کو جو اہمیت حاصل ہے وہ کسی سیاح سے پوشیدہ نہیں۔ اس سے تھوڑی دور آگے چل کر ایک اور سبزپوش نگری ہے جس کا چپہ چپہ سمن زار ہے اور جسے ہم صحیح معنی میں دُنیا کا حسین ترین گوشہ کہہ سکتے ہیں۔ یہاں جھیل کی شہزادی اپنی نیلگوں وسعتوں میں سمٹی سمٹائی۔ چمکتی دمکتی بہا کرتی ہے۔ اور اس کے اردگرد بہار آفریں پہاڑوں کی شاہانہ چوٹیاں، جن پر برف کے بلوریں گالے دعوتِ نظر دیتے ہیں، ایسا دلفریب نظارہ پیش کرتی ہیں گویا تاروں کے جھرمٹ میں کوئی مہتابی چھوڑ رہا ہے۔ دونوں جانب میلوں شمشاد وصنوبر کے لمبے لمبے درختوں کے گھنے جنگل پھیلے ہوتے ہیں ——— ایسے جنگل جہاں ہرسمت ہریاول کلیسا کی محرابوں کی طرح دل ودماغ کو سرور والہام سے معمور کرتی ہے۔ البتہ کہیں کہیں چرخِ نیلوفری کی رنگین جھلکیاں اور خورشید زرنگار کی منور شعاعیں اپنے دیدارِ مختصر سے لطفِ نظر میں اضافہ کر دیتی ہیں۔ یہاں کا فرشِ زمردیں اتنا نرم ونازک ہے کہ رہرو کو خود اپنے قدموں کی آہٹ بھی نہیں سُنائی دیتی اور اسے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ کسی دبیز قالین پر محو خرام ہے۔ بس یوں سمجھئے کہ حسینۂ فطرت اس ارضی فردوس میں اپنی پوری سج دھج کے ساتھ رونق افروز ہوتی ہے اور اس کی ہر ہر جنبشِ لب سے حسن وجمال کے بے شمار پھول چڑھتے ہیں۔

اس سبزہ زار میں ایک خوبصورت ہوٹل ہے جسے "گنجِ بہاراں" کہتے ہیں۔ اس کی تعمیر خالص سوئس انداز میں ہوئی ہے۔ اس لئے اس کی سادگی، خوبصورتی اور شور و شغب سے علیحدگی، لوسیرن کے ان ہنگامہ پرور ہوٹلوں کے مقابلے میں خاص طور پر قابلِ ذکر ہے جن پر امریکی رنگ چڑھا ہوا ہے اور جہاں لوگ اپنا واحد مقصد یہ سمجھتے ہیں کہ یہ مقامِ عیش وعشرت، پوشاک ونمائش، عشق ومحبت اور کھیل تماشوں کے لئے مخصوص ہے، اس لئے جس سے جہاں تک ہو سکے دُنیا کے جھنجھٹوں سے آزاد ہو کر خوب جی بہلائے اور تعیش کے خم پر خم لنڈھائے۔

لوسیرن کی ہوٹلوں میں ایک بات اور مضحکہ خیز ہے اور وہ یہ کہ یہاں قیام کرنے والوں کو رات کا کھانا ٹھیک غروبِ آفتاب کے وقت کھلا دیا جاتا ہے ——— حالانکہ یہی وقت سبزہ وگل کی دلفریبی ورعنائی سے محظوظ ہونے کا ہے۔ اسی وقت جبلِ عظیم قرمزی اور سُنہری رنگوں میں غسل کرتا ہے۔ جھیل سیال جواہرات کی طرح جھلمل جھلمل کرتی ہے۔ اور نسیم جانفزا اپنے دوش پر صحت وانبساط کے ساغر ومینا لئے رقص کرتی آتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ لوگ جو حسن پسند طبیعت اور شاعرانہ تخیل رکھتے ہیں اور روحانی غذا کو جسمانی خوراک پر ترجیح دیتے ہیں،

شہر کے بڑے بڑے ہوٹلوں کو چھوڑ کر "گنج بہاراں" میں قیام کی تمنا کرتے ہیں۔ جہاں کسی قسم کی کثافت نام کو نہیں اور جہاں ہر شے مرضی کے مطابق مہیا ہو جاتی ہے۔ مہتمم کا حسنِ انتظام سونے پر سہاگہ ہے جس کی قابلیت اور ہر دلعزیزی نے اس کے ہوٹل کو مصوروں، شاعروں اور ابتدائی ایام ازدواج منانے والوں کی محبوب قیام گاہ بنا دیا ہے۔ البتہ ان لوگوں کے لئے جو تخیل پسند نہیں ہیں اور شاعرانہ طبیعت نہیں رکھتے اس جگہ کوئی کشش نہیں ہے۔ کیونکہ یہاں صرف حسنِ فطرت کے مطالعے اور تصور و تفکر کا سامان ہے۔ اس کے علاوہ کچھ نہیں۔

پہر ڈھلے ایک ہلکی پھلکی اور چھوٹی سی گاڑی میں دو مہمان وارد ہوئے، ایک بھاری بھرکم اچھے ڈیل ڈول کا بارعب شخص جو نہایت طمطراق سے اُترا، اور دوسری ایک نوعمر خوشرو خاتون جھجکتی اور بھٹکے ہوئے آہو کی طرح گھبراتی ہوٹل میں داخل ہوئی۔ "گنج بہاراں" کے اقامت گزیں ان دونوں کے طور طریق سے بہ یک نظر سمجھ گئے کہ یہ نیا جوڑا یہاں اپنی شادی کے اولین ایام بسر کرنے آیا ہے۔ ان میں سے ایک نوجوان کی توجہ اس جوڑے پر خاص طور سے مرکوز ہوئی۔ جب وہ دونوں اپنے کمروں میں چلے گئے اور مہتمم ان کی چیز بست احتیاط سے رکھوا کر واپس آیا تو نوجوان نے مسکرا کر پوچھا۔

"ایامِ ازدواج منانے آئے ہیں نا؟"

"نظر تو ایسا ہی آتا ہے" مہتمم جواباً بولا "دُلہن کمسن ہے لیکن دولہا کم عمر نہیں معلوم ہوتا۔ خیر ہمیں کیا۔ انھوں نے "گنج بہاراں" کے سب سے اچھے کمرے اپنے لئے محفوظ کرائے ہیں۔"

"ان کے پاس دولت بہت ہوگی"

"اور کیا!" مہتمم ہنستے ہوئے کہنے لگا۔ "دُلہن کی خدمت کے لئے ملازمہ الگ ہے اور دولہا کے لئے خدمتگار الگ۔ یہ لوگ انگریز ہیں اور ایک عالی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ آپ تو البنگھم خاندان سے واقف ہوں گے —— یہ مسٹر اور مسز البنگھم آف ڈنس کیپ ہال ہیں۔ نورفوک سے آئے ہیں۔"

نوجوان مصوّر کی سیاہ آنکھوں میں سوچ کی لہر اٹھی۔ مگر اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ اسے خیال پڑتا تھا کہ اس نے کہیں ڈنس کیپ ہال کی تصویر دیکھی ہے لیکن اُسے صحیح طور پر یاد نہ آسکا۔ اتنے میں مہتمم کو کوئی بلانے آیا اور گفتگو کا سلسلہ ختم ہو گیا۔

بہار کی ایک خوشگوار صبح کو نوجوان مصوّر نے جس کا نام فرانسس فین تھا۔ مسز البنگھم کو چیڑ کے درختوں کے سائے میں چہل قدمی کرتے ہوئے نزدیک سے دیکھا۔ اور یہ دیکھ کر اس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی کہ مسز البنگھم کے حسین مکھڑے پر غضب کا بچپن اور بھولپن برس رہا ہے۔ جب وہ اس کے پاس سے لباس صباحی میں سبک روی سے گزری تو وہ اپنی نازک اندامی، بھولے بشرے اور چال ڈھال سے اتنی کمسن نظر آتی تھی کہ یہ خیال ہی لغو معلوم ہونے لگا کہ وہ کتخدا ہو سکتی ہے۔

دُور تک وہ اُسے خواب آلود نگاہوں سے دیکھتا رہا اور دل ہی دل میں کہنے لگا "اس کی عمر پندرہ سولہ سال سے زیادہ نہیں ہو سکتی"۔ حالانکہ وہ کم و بیش بیس برس کی تھی، البتہ امتدادِ زمانہ ابھی تک اس کے ناک نقشے پر کمسنی کے نقوش کھینچنے سے مجتنب رہا تھا۔ اور اس کی آنکھیں آلودگیوں سے بے داغ اور معصومیت سے لبریز تھیں —— اسی

لئے وہ اگرچہ بیاہی تھی۔ مگر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اب بھی بچپن کی حدود میں محصور ہے۔

"یہ! اور مسز ایلنگھم آف ڈنس کمب ہال!"

نین نے ازراہِ تفنن سوچا "یہ تصور ہی واہیات ہے! اس کی دوشیزگی ابھی ختم نہیں ہوئی۔"

بے شک یہ تصور کچھ اچھا نہیں معلوم ہوتا تھا کہ اس کی شادی ہو چکی ہے۔ خود روز ایلنگھم بھی کبھی کبھی یہی سوچتی تھی۔ مگر محض سوچ سے کیا ہوتا ہے؟ یہ خوش پوشاک، بنا ٹھنا، لمبی لمبی مونچھوں والا، ہیرلڈ برینٹ وڈ ایلنگھم آف ڈنس کمب ہال (نورفوک) اس کا شوہر تھا اور وہ مسز ہیرلڈ برینٹ وڈ ایلنگھم، آف ڈنس کمب ہال (نورفوک)۔ پھر بھی یہ حقیقت کچھ عجیب عجیب سی معلوم ہوتی تھی جسے دل نہیں مانتا تھا۔ وہ بار بار ان واقعات کو یاد کرتی جو بالآخر اس کی شادی اور اس اعزاز و افتخار پر منتج ہوئے۔ وہ رقص گاہ اور محفلِ رقص و سرود! وہ خوبرو ہیرلڈ ایلنگھم سے ملاقات اور اس کے ساتھ ناچ رنگ میں شرکت! وہ اس کا جھیل کے کنارے شکارے میں ٹہلانا اور خوشنما گلدستوں کی پیش کش! پھر ایک جلسے میں اس سے مڈھ بھیڑ! اور اسی سہ پہر کو اس کا پائیں باغ میں اس کے ہاتھ سے غزلوں کی کتاب لے کر اظہارِ محبت کرنا .... اور یہ محبت! ایک عجیب و غریب عشق تھا یہ! جن جذبات و احساسات کا شعرا ذکر کرتے ہیں۔ ان کا اس کی باتوں میں ہلکا سا بھی عکس نہیں تھا۔ مسٹر ایلنگھم نے "دل چرانے" "جان دینے" اور "جذبۂ بے اختیار" کا ذرا بھی تو اشارہ نہیں کیا اس کے نزدیک شادی دیوانگی اور وارفتگی کا انجام نہیں۔ بلکہ ایک ایسے رشتے کا قیام تھی۔ جو سمجھ اور توقیر و تکریم پر مبنی ہوتا ہے اور صرف اسی انداز سے وہ اپنی شادی کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ لمبی چوڑی باتیں اور اس کے حُسن کی بے ضرورت تعریف کئے بغیر اس نے سیدھے سادے لفظوں میں پوچھا۔

"روز! تم مجھ سے شادی کروگی؟"

وہ کچھ نہیں بولی۔

"میں نے تمہارے والدین سے بات چیت کر لی ہے" ایلنگھم نے اس کے ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا "وہ راضی ہیں۔ روز، تم کتنی اچھی ہو! میں تم سے عمر میں چند سال بڑا ضرور ہوں، مگر میاں بیوی میں اتنا فرق تو ہونا ہی چاہیے۔ مجھے یقین ہے ہم دونوں ہمیشہ خوش رہیں گے۔ تم جانتی ہو کہ تمہیں جس چیز کی خواہش ہوگی میرے لئے اس کا مہیا کرنا بہت آسان ہے۔ میری بیوی ——" یہاں اس کے لہجے میں تمکنت آگئی۔ "ظاہر ہے سوسائٹی میں ایک ممتاز جگہ کی مالک ہوگی۔"

روز کے جسم میں سنسنی سی دوڑنے لگی۔

"یہ میں جانتی ہوں۔" وہ ہچکچاتے ہوئے بولی۔ "لیکن مجھے —— مجھے آپ سے محبت نہیں ہے مسٹر ایلنگھم!"

وہ ہنسا "ہو جائے گی۔ تم اپنے دل اور فطرت کو اتنا نہیں جانتیں، جتنا میں جانتا ہوں تمہیں کسی اور کی تو چاہت نہیں؟"

"نہیں"۔ اس نے آہستہ سے جواب دیا۔ اور یہ اصلیت تھی۔ آج تک کسی نے بھی سوائے مسٹر ایلنگھم کے اس سے یہ تمنا ظاہر نہیں کی۔

"بس تو تمھیں رضامند سمجھوں!" اُس نے اُسے سہارا دیتے ہوئے کہا۔ اور تھوڑی دیر اس کے ہمراہ پائیں باغ میں چہل قدمی کرتا رہا۔ کچھ روز بعد اُس نے اُسے شادی کی انگشتری پہنادی جس میں بیش بہا جواہرات جڑے ہوئے تھے۔

دن یونہی گزرتے رہے۔ اور آخرکار وہ رشتۂ ازدواج میں منسلک ہوگئی، اور اب یہاں سوئٹزرلینڈ میں وہ اپنی شادی کے اوّلین ایام بے فکری سے بسر کرنے آئی تھی — اسی رعب داب اور سیاہ مونچھوں والے شخص کے ساتھ جو اس پر سالہا سال حکومت کرے گا۔ بہرحال ..... اسے شادی کا بار اور اس کی مشکلات کا احساس اسی وقت ہوا جب اس نے سچ مچ اس منزل میں قدم رکھا، ورنہ اس نے تو محبت کے جو افسانے اور غزلیں پڑھی تھیں اُن سے اس نے اندازہ کیا تھا کہ محب و محبوب بڑی بہکی بہکی باتیں کرتے ہیں۔ اُن کی گفتگو شاعرانہ یا مجنونانہ ہوتی ہے۔ اور ان کی داستانِ محبت کا اختتام خودکشی یا دوسرے کو جان سے مار ڈالنے پر ہوتا ہے۔ شادی ہوجانے کے بعد کی بے کیف اور بدمزہ زندگی کا تو اُسے ذرہ بھر بھی علم نہیں تھا۔ بھلا وہ کیا جانتی کہ ایک اہلیہ کی کتابِ زندگی، دوشیزہ کی طرح رنگین غزل نہیں ہے۔ بلکہ خشک نثر کے مسلسل ٹکڑے ہیں۔ کبھی کبھی وہ محسوس کرنے لگتی کہ وہ خوش نہیں ہے اور جب اس کی وجہ سوچتی تو دل کے اندر سے آواز آتی "تمھیں اس سے محبت ہی کہاں ہے؟" اس سے وہ اور بھی مضطرب ہوجاتی، کیونکہ وہ حد درجہ حساس تھی اور ضمیر کی ٹیسیں سہنے کے ناقابل۔

سچ تو یہ ہے کہ اس کے اور اس کے شوہر کے درمیان اب تک جو تعلق تھا، اس میں رسم و تکلف کو جذبۂ محبت سے زیادہ دخل تھا۔

مسٹر لینگھم میں ایک کمزوری یہ بھی تھی کہ وہ دوسرے کو اپنے سے کمتر سمجھنے سے باز نہ آتے تھے، اس لئے سوئٹزرلینڈ کا دلچسپ سفر کرکرا ہوگیا۔ مزید براں اگر کوئی اُن سے علیک سلیک کرلیتا تو اس پر وہ شبہ کرنے لگتے کہ اسے میری شادی کا علم ہوگیا ہے۔ اور یہ ہمارے ایامِ ازدواج کا مذاق اُڑا رہا ہے۔ چنانچہ ہر ملاقاتی کو دیکھ کر اُن کی پیشانی پر جو بل پڑ جاتے وہ بہت دیر تک قائم رہتے اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ ان کی کم عمر شریکِ حیات زچ ہو ہو کر رہ جاتی، لیکن انھیں اس کا کبھی احساس نہ ہوا "سچ بہاراں" پہنچ کر تو انھوں نے ایسے طور طریق اختیار کئے کہ ہنس مکھ روز کا دل اور بھی بجھ گیا۔

بہار کے خوبصورت اور چمکیلے دن آہستہ آہستہ گزرتے رہے اور ہر متنفس اس روح پرور موسم اور حسین ساعتوں سے بہرہ مند ہوتا رہا — سوائے روز لینگھم کے جس کی امنگوں پر دم بدم بڑھنے والی پریشانی اوس ڈال رہی تھی۔ اس کا دل بیحد نازک تھا اور وہ فطرتاً ذرا ذرا سے احسان سے بڑی متاثر اور متشکر ہوتی — اسی لیے وہ مسلسل ذہنی انتشار میں مبتلا رہتی کہ باوجود کوشش کے اسے اپنے شوہر سے محبت نہیں ہے۔ ان دونوں کی طبیعتوں میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ اور کوئی نامعلوم شے ان کو ایک دوسرے سے کھنچا کھنچا رہنے پر مجبور کرتی تھی۔ لیکن اپنے دل کا بھید کوئی ظاہر نہ ہونے دیتا تھا۔

پھر بھی چھوٹی چھوٹی باتوں سے قلبی کیفیات کا اندازہ لگایا جا سکتا تھا۔ ایک دفعہ وہ اس کے ہمراہ صنوبر کے جنگل میں ٹہل رہی تھی کہ اُسے محبت سے لبریز وہ گیت یاد آ گئے جنھیں وہ شادی سے پہلے اکثر پڑھا کرتی تھی۔ اور جن کی شیرینی اور لطافت سے محظوظ ہوتے ہوئے کسی فوری جذبے کے تحت اس نے اپنے شوہر کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔ پھر اُسے اپنی کمر کے گرد حمائل کرنے اس آرزو کے ساتھ وہ ذرا پیچھے جھکی کہ اس کا طاقتور رفیق اسے اپنی آغوش میں لے لے۔ لیکن فوراً ہی اس کی نگاہیں الینگھم کی نظروں سے دوچار ہوئیں جن میں اس کے جذبۂ محبت کی قدر کا شائبہ تک نہ تھا۔

"یہ کیا؟" الینگھم نے خشک لہجے میں کہا۔ "اور جو کوئی سیلانی ہمیں یہاں اس حالت میں دیکھ لے! بس سارے شہر میں خبر اُڑ جائے گی کہ رومیو جولیٹ کا ایک نیا جوڑا اپنی محبت کی تکمیل کے لئے جنگل میں مارا مارا پھر رہا ہے۔ تمھیں شرم نہیں آتی؟ کس قدر خفیف الحرکتی ہے یہ!"

اس نے جلدی سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور ہولے سے اُسے پرے دھکیل کر الگ چلنے لگا۔ اُس کے چہرے کے اُتار چڑھاؤ سے ایسا معلوم ہوتا تھا، گویا اس کی پاکیزگی کو ٹھیس لگ گئی ہے۔ اس کی نوعمر بیوی اس کے حقارت آمیز غصے کو بھانپ گئی تھی، چنانچہ نیچی نظریں کئے، خاموش، محجوب و نادم، وہ اس کے ساتھ ساتھ چلتی رہی۔ دفعتاً وہ تکبر سے بولا "تمھیں نہیں معلوم کہ سڑک پر محبت کے مظاہرے کرنا شریفوں کا شیوہ نہیں ہے؟"

روز نے اُسے نگاہ بھر کر دیکھا، اس طرح کہ اُس کی آنکھوں سے نفرت ٹپک رہی تھی۔ "یہ سڑک ہے؟" اُس نے رُک کر جواب دیا "یہاں تو کوئی بھی نہیں۔ بس ہم دونوں ہیں اور یہ تنہا جنگل۔ غروبِ آفتاب کا دلفریب سماں اور بارشِ انوار! لیکن اگر تمھیں ناگوار گزرا تو مجھے افسوس ہے کہ کیوں ——"

"ناگوار؟" اُس نے حسبِ عادت درشتی اختیار کرتے ہوئے کہا۔ "ناگوار کیوں نہ گزرتا؟ ہم چاہے سڑک پر ہوں یا تنہائی میں، ہمیں اس قسم کے بازاری مظاہر کبھی نہیں کرنے چاہییں، اور دیکھو، خدا کے واسطے تم شاعرانہ باتیں نہ کیا کرو۔ میں اس سے جلتا ہوں۔ "یہ تنہا جنگل۔ غروبِ آفتاب کا دلفریب سماں اور بارشِ انوار!" یہ کیا بدتمیزی ہے!"

روز نے ایک ٹھنڈا سانس بھرا اور چپکی ہو گئی۔ پھر تھوڑی دیر بعد اُس نے خاموشی کو نحیف آواز اور مدھم لہجے میں توڑا "ہیرلڈ! بتاؤ، کیا تمھیں مجھ سے واقعی محبت ہے؟"

الینگھم نے ابھی ابھی اپنی مونچھوں پر تاؤ دیا تھا۔ ایکاایکی یہ سُن کر وہ کسی قدر متحیر ہوا۔ سر سے پیر تک روز پر ایک نگاہ ڈالی اور معاً اس کے دل میں یہ خیال آیا کہ ایسا نہ ہو اس پر غشی کا دورہ پڑ جائے —— سب عورتیں ہسٹیریا کی مریض ہوتی ہیں!

"روز!" اُس نے بہ دقت اپنی گفتگو میں نرمی پیدا کرتے ہوئے جواب دیا۔ "اگر تمھیں یہ یاد رہے کہ میں تم سے شادی کر چکا ہوں تو تم ایسے بیوقوفی کے سوال کبھی نہ کرو۔ اگر مجھے تم سے محبت نہ ہوتی تو

تمھیں اپنی بیوی کیوں بناتا؟ تمھیں اسے کافی سمجھنا چاہیے کہ تم میری منکوحہ ہو۔ اور یہ تم جانتی ہو کہ دلی جذبات الفاظ کے ذریعے بیان نہیں کئے جا سکتے ——"
یہاں اُس کی آواز میں پھر کرختگی پیدا ہوئی۔ "عنقریب رو تو نہیں پڑو گی؟ یہ محض بچپن ہے! شاید اب تم تھک گئی ہو، چلو واپس چلیں، اور خدا کے واسطے اس کا خیال رکھو کہ لوگ ہمیں دیکھتے ہیں، کہیں ہوٹل والے تمھاری وجہ سے ہمارا تماشا نہ بنالیں۔"

"بے فکر رہو" روز نے اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جواب دیا۔ "میں روؤں گی نہیں۔ میری وجہ سے تمھارا تماشا نہیں بنے گا۔"

وہ چپ چاپ اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اینگھم باہر ہی ٹھیر گیا اور سگار سلگا کر برآمدے میں ٹہلنے لگا۔

دوسرے روز صبح ——

فرانسس فین شمشاد کے درخت کی چھاؤں میں اپنی قریب الختم تصویر کو آخری نقوش سے مکمل کر رہا تھا۔ یہ تصویر صنوبر کے ایک ہرے بھرے درخت کی تھی جسے برقِ فلک نے چشم زدن میں گر کر تاخت و تاراج کر دیا تھا۔ معاً اُس نے دیکھا کہ تھوڑے فاصلے پر کوئی بقچی سی پڑی ہوئی ہے۔ اس کے دل میں تجسس پیدا ہوا اور اُسے دیکھنے کی غرض سے تصویر کشی کا سامان وہیں چھوڑ کر اس سمت چل پڑا۔ وہ چند قدم چلا ہو گا کہ گٹھڑی ایک لڑکی کی ہیئت میں نظر آئی جو سفید لباس پہنے ہوئے تھی اور جس کی کمر پر نیلا فیتہ بندھا ہوا تھا۔ قریب پہنچ کر اُس نے سسکیوں کی آواز سُنی، اور وہیں ٹھٹک گیا۔

"ارے!" اس نے استعجاب سے دل میں کہا "مسز اینگھم!"

اسے اس پر بڑا ترس آیا، لیکن اس خیال سے کہ وہاں ٹھیرنا مناسب نہیں، اُلٹے قدموں لوٹنا چاہتا تھا کہ روز اس کے قُرب سے آگاہ ہو گئی۔ اور اپنی ذہنی کیفیت چھپاتے ہوئے اُسے بیچارگی سے دیکھا۔

"معاف —— کیجئے گا" فین کے مُنہ سے الفاظ پوری طرح نہیں نکلے "میں تصویر بنانے آیا تھا ——"

"میری تصویر تو نہیں؟" روز نے مسکرانے کی کوشش کی اور رومال سے آنسو پونچھتے ہوئے بھولپن سے کہا۔ "کبھی کبھی اکیلے میں رونا بڑا اچھا معلوم ہوتا ہے" پھر پُرنم آنکھوں سے اسے دیکھتے ہوئے بولی "مجھے آپ اپنی تصویر دکھائیں گے؟ میں نے آپ کو کئی بار رنگوں کا ڈبہ اور بُرش وغیرہ لئے ان قطعات میں دیکھا ہے۔ آپ کا نام مسٹر فرانسس فین ہے نا؟ اور آپ اسی ہوٹل میں مقیم ہیں جہاں ہم ٹھیرے ہوئے ہیں؟"

اس نے سب باتوں کا جواب اثبات میں دیا۔ اور اس کے ساتھ آہستہ آہستہ اس طرح چلنے لگا گویا خوابستان کی سیر کر رہا ہے۔ مگر یہ احساس ایک لمحے کے لئے بھی اس سے دور نہیں ہوا کہ یہ بے حد کم عمر ہے۔ یکایک اس جگہ پہنچ کر جہاں اس کی تصویر رکھی ہوئی تھی۔ وہ اپنے خیالات سے چونکا کہ اس وقت وہ کسی بن کی اپسرا کے ساتھ نہیں بلکہ ایک "معزز شادی شدہ خاتون" کی معیت میں ہے۔

"یہ تصویر آپ کے لائق نہیں ہے، مسز اینگھم!" اس نے رسماً کہا۔

مسز اینگھم قطع کلام کرتے ہوئے بولی "آپ نے مجھے

جانتے ہیں؟" اور اس کے لبوں پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ آگئی۔

"کیوں نہیں! "گنجِ بہاراں" میں ہر شخص جانتا ہے کہ آپ مسز الینگھم ہیں۔"

وہ حیران ہو گئی "تو وہ لوگ میرے متعلق کیا سوچتے ہوں گے؟"

فین پر اس کے استفساریہ لہجے اور معصومانہ انداز کا بڑا اثر ہوا۔ سوچنے لگا یہ اس پر اتنا چونکی کیوں ہے۔ "یہی کہ آپ بہت کم عمر اور خوبصورت ہیں، اور کیا؟"

اس کے رخسار گلابی ہو گئے "خیر، میں سمجھتی تھی کہ ——— وہ مجھ پر ہنستے ہوں گے۔"

"ہنستے ہوں گے!" اس نے تعجب سے پوچھا۔ "کیوں؟"

"کیونکہ ——— کیا مجھ جیسی کمسن لڑکی کے لئے بیاہی ہونا مضحکہ خیز نہیں ہے؟ بعض لوگوں کو ضرور مجھ پر ہنسی آتی ہوگی۔ میں بڑی تو کافی ہوں۔ بیس سال کی ہوں۔ مگر لمبی تڑنگی نہ ہونے کی وجہ سے معلوم نہیں ہوتی۔" اور اس نے اپنے دستِ نازک کو دلفریب تبسم کے ساتھ ایک خاص انداز میں جنبش دی "معلوم نہیں، میرے دل میں یہ خیال کہاں سے سما گیا ہے کہ ایک بیاہی ہوئی عورت موٹی تازی اور اہم شخصیت کی مالک ہوتی ہے۔" فین کے قہقہے کی آواز سن کر اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ "ہاں اب میرے خیالات بہت کچھ بدل گئے ہیں لیکن جب، تو ———"

وہ کہتے کہتے رک گئی۔ کیونکہ اسے فین کی تصویر کا خیال آگیا۔ اور وہ کچھ دیر اُسے اچھی طرح دیکھتی رہی۔ اس کے اس قدر غور سے مطالعہ کرنے پر فین کو حیرت ہوئی اور وہ دل میں کہنے لگا کہ دیکھئے یہ معصوم صورت خاتون اس پر کیا تنقید کرتی ہے۔ کافی دیر معائنہ کرنے کے بعد وہ اس سے مخاطب ہوئی "ان نقوش کے پسِ پردہ کیا سچا تخیل کارفرما ہے! یہ بیچارہ درخت اپنی تباہی کی منہ بولتی تصویر ہے۔ مستقبل سے لاعلم ہمیشہ آسمان کی طرف منہ اٹھائے، اور یہ سمجھ کر اس پر کبھی کوئی مصیبت نہیں آئے گی۔ وہ خوش خوش پروان چڑھتا رہا، یہانتک کہ ایک دن آفتِ ناگہاں کی طرح اس پر بجلی گر پڑی اور اس کے دل کو چکنا چور کر کے اسے نذرِ اجل کر دیا۔ آپ نے اس تصویر میں رنگوں اور نقوش کو اس کمال سے ممزوج کر دیا ہے کہ معلوم ہوتا ہے یہ درخت ناظر سے سوال کر رہا ہے "کیا اپنی بربادی کا میں بھی قصوروار ہوں؟" آپ اپنے مقصد میں بدرجۂ اتم کامیاب ہیں۔ آپ یہی چاہتے تھے نا کہ کسی مسرور و شاداں زندگی کی تباہی کو اپنے موئے قلم سے مصوّر کر دیں؟"

اس کے خیالات، باتوں کی لطافت اور الم ریزی نے فین کو غرقِ حیرت کر دیا تھا۔ "میں نہیں کہہ سکتا جو تاثرات اسے دیکھ کر آپ کے دل میں پیدا ہوئے ہیں وہ میرے ذہن میں بھی تھے یا نہیں۔" اس نے آہستگی سے جواب دیا۔ "لیکن مجھے خوشی اور فخر ہے کہ میری اس ناچیز تصویر میں آپ کو اس قدر شاعرانہ تخیل پنہاں معلوم ہوتا ہے۔"

"شاعرانہ! ———" اسے فوراً کوئی بات یاد آگئی اور اس نے غمناک لہجے میں جلدی

سے کہا "نہیں نہیں، مجھے شاعری نہیں آتی۔ ہاں ایک زمانے میں میں اکثر کیٹس اور بائرن کی نظمیں گنگنایا کرتی تھی، لیکن اب کبھی نہیں گنگناتی ——— میرے شوہر کو یہ بالکل ناپسند ہیں ——— معلوم نہیں کیوں"

"سچ"

"ہاں!" وہ کہنے لگی "انھیں صرف تحقیقی اور عالمانہ مضامین پسند ہیں اس لئے وہ بڑے موٹے موٹے رسالے پڑھتے ہیں۔ اُن کی رائے میں نثر کے ہوتے ہوئے نظم پڑھنی محض تضیع اوقات ہے۔ کیونکہ شاعری بجز یاوہ گوئی کے کچھ نہیں۔"

"نثر میں بعض اوقات اچھی چیزیں مل تو جاتی ہیں۔" فینّ تبصرہ کرتے ہوئے کچھ اور کہنا چاہتا تھا کہ اسی دم ان دونوں کے درمیان ایک سایہ آگیا اور انھوں نے دیکھا کہ مسٹر الینگھم تشریف فرما ہیں۔

"ہیرلڈ!" روز اس کی طرف لپکتی ہوئی بولی "میں نے سمجھا کہ تم بازار گئے ہوئے ہو"

"بازار ہو آیا" ہیرلڈ نے رکھائی سے جواب دیا "شاید تمھیں معلوم نہیں کہ کھانے کا وقت ہو گیا ہے"۔

پھر وہ مربیانہ انداز میں فینّ سے مخاطب ہوا

"آپ مصور ہیں؟"

"کچھ یونہی سا" جواں سال مصور نے انکسار سے کہا "مسز الینگھم یہاں سے گزر رہی تھیں کہ انھوں نے مجھے تصویر کشی میں مصروف دیکھا اور از راہِ ذرہ نوازی اس ناچیز تصویر کو پسند فرمایا۔"

"ہاں اچھی ہے" الینگھم تصویر کو دیکھے بغیر بول اٹھا۔ "روز! اب ہمیں چلنا چاہیئے۔ آپ تو ہمارے ہوٹل ہی میں ٹھیرے ہوئے ہیں نا، مسٹر ———؟"

"فینّ" مصور نے اپنا نام بتایا۔

"فینّ؟ اوہ! میں نے لندن میں شاید آپ کا نام سنا ہے۔ آپ نے تصویروں کی نمائش میں شرکت کی تھی نا؟"

"جی ہاں"

"خوب خوب۔ یاد آگیا۔ آپ سے مل کر بڑی مسرت ہوئی.......... آپ بھی ہمارے ساتھ چلیں گے؟"

"جی نہیں۔" فینّ نے جواب دیا۔ "ابھی اس تصویر میں کچھ کام اور باقی ہے"

وہ دونوں چلے گئے اور فینّ، مصور کی آنکھ سے دُور تک اُن کی چال کا مطالعہ کرتا رہا ——— روز کی رفتار میں حسن و شکوہ اور نسوانی نزاکت تھی، اور الینگھم کی چال میں تمرّد اور مردانہ کرختگی۔

"نہایت ناموزوں رشتہ ہے!" اُس نے آپ ہی آپ کہا "یہ بہت کم عمر ہے اور وہ ضرورت سے زیادہ خود بین"

اسی شام کو خلافِ توقع مسٹر الینگھم، فرانس فینّ کے پاس آئے۔ اور اُسے رات کو اپنے ساتھ قہوہ پینے کی دعوت دی۔ فینّ نے منظور کر لی اور وقت مقررہ پر چلا گیا۔ دروازے میں مسز الینگھم نے، جو سفید شیفون کے گاؤن میں ملبوس تھی، اپنے شوہر کے ساتھ قدرے حجاب سے اس کا استقبال کیا اور دونوں کو ایک جگہ بٹھا کر خود ذرا پرے دریچے کے پاس بیٹھ گئیں جس میں سے برآمدے کی دیواروں پر پھیلی ہوئی بید مجنوں کی بیلیں اور سفید بادلوں میں چودھویں رات کا تیرتا ہوا چاند ایک حسین منظر پیش کر رہا تھا۔

قہوے کے دور چلتے رہے اور اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ آخر البنگھم نے نورفوک میں اپنی جاگیر ڈنس کمب ہال کا ذکر چھیڑا" مجھے عرصے سے کسی ایسے مصور کی تلاش ہے جو ڈنس کمب ہال کی مختلف تصویریں بنا سکے" اس نے اس طرح کہا جیسے کوئی بڑا آدمی کسی معمولی شخص سے گفتگو کرتا ہے "اور میری رائے میں تم اس کام کے لئے مناسب ہو۔ اگر تم اسے دل لگا کر کرو تو میں یہ خدمت تمھارے سپرد کرنے پر ضرور غور کروں گا۔"

اس کے مربیانہ انداز سے جل کر، جس میں اُس نے اپنی اہانت بھی محسوس کی، فیبن بُری طرح انکار کرنے والا تھا کہ اس کی نظر روز پر جا پڑی جو عشق پیچاں اور شبِ ماہ کی آنکھ مچولی دیکھنے میں دُنیا و مافیہا سے بے خبر تھی۔ اس نے ذرا سوچ کر جواب دیا۔ "مجھے چند اور حضرات کی تصویریں بنانی ہیں۔ اُن سے فراغت پا کر ممکن ہے آپ کا کام کر سکوں۔"

"اچھا لیکن میری تصویریں زیادہ سے زیادہ اکتوبر میں تیار ہو جانی چاہییں ورنہ میں کسی اور مصوّر کی درخواست منظور کر لوں گا۔ ڈنس کمب ہال تصویر کشی کے لئے بہترین مقام ہے۔ کسی زمانے میں وہاں ایک خانقاہ تھی اور اب بھی کہیں کہیں تہ خانوں میں اس کے کھنڈر ملتے ہیں۔ اور جس مقام پر روح آتی ہے وہ تو ایک مصوّر کے لئے عجیب جگہ ہے۔"

"روح آتی ہے؟"

"ہاں۔ لوگ کہتے ہیں" البنگھم نے سگار جلاتے ہوئے کہا "میں نے خود کبھی کوئی رُوح وہاں نہیں دیکھی۔ لیکن میں نے سُنا ہے کہ جب ہمارے خاندان میں کسی کی موت ہونے والی ہو تو دریا کے کنارے کشتی میں کسی عورت کی روح نمودار ہوتی ہے۔ اور اپنی طرف آنے کا اشارہ کرتی ہے۔ سب بیہودہ خیالی ہے اور کچھ نہیں! مگر مجھے اس کا شوق ضرور ہے کہ ہمارے خاندان کی کوئی روح مرحوم کے استقبال کو آیا کرے۔"

"اور آپ کو بھی شوق ہے؟" فیبن نے روز کو البنگھم کی باتیں بغور سُنتے ہوئے دیکھ کر سوال کیا۔

وہ کانپ سی گئی۔ "مجھے کسی آسیب زدہ مقام پر جانے کا اتفاق نہیں ہوا۔ اس لئے میں کچھ نہیں کہہ سکتی" پھر اس نے مُسکرانے کی کوشش کی۔ "مجھے نہیں معلوم تھا کہ ڈنس کمب ہال سے ایک روح بھی متعلق ہے۔"

"خیر اب تو معلوم ہو گیا" اس کے شوہر نے گویا مذاق سے کہا۔ "لیکن یہ رُوح کبھی گھر میں نہیں آتی، اور وہ "رُوح کا مسکن" ہمارے گھر سے کوئی ایک میل کے فاصلے پر ہے ——— مسٹر فیبن تم مجھے سوچ کر جواب دینا کہ یہ کام کر سکو گے یا نہیں۔"

"بہت اچھا۔"

پھر گفتگو کا رُخ بدل گیا۔ اور جب وہ وہاں سے اُٹھا تو اس نے دیکھا کہ مسز البنگھم بہت تھکی ہوئی اور افسردہ معلوم ہوتی ہیں، اُسے بڑا رحم آیا کہ یہ نازک اندام لڑکی جو اس لائق ہے کہ ہر وقت اس کی دیکھ بھال اور خدمت کی جائے، باوجود شادی ہو جانے کے اس طرح غمگین ہے، گویا اس کا کوئی رفیق نہیں، وہ سوچنے لگا کہ یہ سنجوگ کتنا افسوسناک ہے! اس غریب کا شوہر حد درجہ تنگ دل اور جذبات سے عاری ہے اور بظاہر اسے کوئی دُکھ نہیں پہنچائیگا

لیکن ـــــ بس اس سے آگے اس کے خیالات اپنی کڑیاں نہ ملا سکے۔ اپنے کمرے میں داخل ہونے سے پہلے اس نے ایک بار قمر چاردہم، لانبے لانبے چیر کے درختوں اور شبنم آلود سبزے کو دیکھا اور "نزاکت اور اوچھے پن" کے متذکرہ روح فرسا امتزاج پر آہِ سرد بھر کر رہ گیا۔ اس کی آنکھیں بوجھ سے مُندی جا رہی تھیں، چنانچہ وہ بستر پر دراز ہوتے ہی نیند کی آغوش میں سب کچھ بھول گیا۔

اس صحبت کے بعد اکثر ان کی ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ آخر اگست میں انھوں نے "کنجِ بہاراں" کو خیرباد کہا۔ لوسیرن تک تینوں ساتھ آئے اور یہاں سے اُن کی راہیں مخالف سمتوں میں منقسم ہوگئیں۔ مسٹر اور مسز الینگھم ڈنس کمب ہال (نورفوک) جا رہے تھے اور فینن ابھی ٹائرول کی سیاحت کرنی چاہتا تھا۔ اسٹیشن پر دونوں میاں بیوی اس سے جدا ہوئے اور چلتے چلتے الینگھم نے اس طریقے سے جس میں درخواست سے زیادہ حکم دخیل تھا یاد دہانی کی کہ اکتوبر میں ضرور میرے پاس آؤ اور ڈنس کمب ہال کے مختلف مناظر کی تصویریں کھینچو۔

"رہی اُجرت"، مسٹر الینگھم نے بڑے آدمیوں کی طرح کہا "تو اس کی تمھیں کوئی فکر نہیں کرنی چاہیے تم جو طلب کروگے، میں منظور کرلوں گا۔"

فینن کو اس کا طرزِ تکلم ناگوار گزرا، مگر وہ چپکا ہوگیا۔ مسز الینگھم سے مصافحہ کرکے اس نے اُسے الوداعی تحفے کے طور پر نیلوفر اور دیگر خوبصورت شگوفوں کے خوشے پیش کیے۔ اور جب تک گاڑی نظروں سے اوجھل نہ ہوگئی۔ وہ اسی سمت دیکھتا رہا۔

"صرف اس کی خاطر میں وہاں جاؤں گا" اس نے اپنے دل میں کہا۔ "ورنہ ڈنس کمب ہال اور اس کے متکبر مالک کو چولھے میں ڈالتا۔"

ستمبر اپنے حسن و رعنائی کے ساتھ تمام ہوا اور اکتوبر کے آغاز میں اس نے فیصلہ کرلیا کہ نورفوک تصویریں بنانے کے لئے ضرور جاؤں گا۔ چنانچہ ایک اُداس شام کو جب کہ فضا پت جھڑ کی بُو سے لبریز تھی اور خزاں کی افسردگی نے اِردگرد کے مناظر کو غمگین سا بنا رکھا تھا ـــ جیسے کسی المناک خیال سے چنچل بشرے پر مردنی چھا جاتی ہے ـــ وہ ڈنس کمب ہال کے شاندار ارابِ عظیم میں داخل ہوا جہاں سے شاہِ بلوط کا سلسلہ دار راستہ جاگیردار کی پُرشکوہ عمارت کو جاتا تھا۔ اس کو لانے کے لئے گاڑی اسٹیشن بھیج دی گئی تھی اور جب وہ دروازے کے پاس پہنچ کر اس میں سے اُترا تو سیاہ وردی میں ایک بارعب ملازم نے اس کا استقبال کیا اور بتایا کہ مسٹر الینگھم ابھی ابھی ایک ضروری کام سے کہیں چلے گئے ہیں۔ لیکن ان کی بیگم ملاقات کے کمرے میں چائے پر آپ کا انتظار کر رہی ہیں۔

چنانچہ وہ ملاقات کے کمرے میں داخل ہوا۔ لیکن اس کی وسعت اور عہدِ عتیق کی شان و شوکت نے اسے ایسا مسحور کرلیا کہ وہ چند لمحات تک اپنی کم عمر میزبان کو نہ دیکھ سکا۔ آخر وہی آگے بڑھی۔ اور جب فینن نے اسے دیکھا تو اس کے دل و دماغ کو ایسا صدمہ پہنچا کہ اس کی زبان گنگ ہوگئی۔ صرف دو ماہ کے عرصے میں اس کی حالت اتنی قابلِ رحم

ہوگئی تھی کہ دیکھا نہ جاتا تھا۔ قدرے ٹھہر کر اس نے چند ناقابل فہم الفاظ کہے، پھر اس کے چھوٹے سے سرد ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے کر مصافحہ کیا اور اس کو بہت نظروں سے تکنے لگا۔ وہ بھی اس کی نگاہوں سے اس کے تاثرات کو سمجھ گئی۔ اور اس کی آنکھوں سے ایسا معلوم ہونے لگا کہ اپنا ایک ہمدرد پاکر اُسے تسکین ہوگئی ہے۔

"آپ سمجھ رہے ہیں" اس کے لبوں پر ایک مرجھائی ہوئی مسکراہٹ نمودار ہوئی "کہ میں کچھ بیمار ہوں؟ ہاں ـــــ ہر شخص کا یہی خیال ہے۔ خود میں بھی یہی سمجھتی ہوں کہ میری صحت بگڑ چکی ہے۔ کبھی کبھی میں سوچتی ہوں کہ یہ جگہ میرے موافق نہیں ہے" اسے ایک ہلکی سی کپکپی محسوس ہوئی "دیکھئے کتنی وسیع جگہ ہے یہ، اور میں اس کے مقابلے میں کتنی چھوٹی ہوں!" وہ ہنسنے لگی "ایک چھوٹی سی عورت کو یقیناً کسی چھوٹے سے مکان میں رہنا چاہیئے۔ اُسے وہیں آرام مل سکتا ہے۔ خیر! مجھے ایک اچھا طبیب میسر ہے! بہت ہمدرد اور ہوشیار۔ اس کی رائے ہے کہ مجھ میں خون کی کمی ہے اور دل کمزور ہے، بس۔ آیئے چائے پیجئے، وہ سامنے آگ روشن ہے"

وہ اُسے آتشدان کے قریب لے گئی اور چائے بنانے لگی۔ فین اس کے مقابل ایک نیچی کرسی پر بیٹھا تھا اور اس کی نظریں اس سکوت کامل میں اس کا جائزہ لے رہی تھیں۔ پہلے اگر وہ بچہ معلوم ہوئی تھی تو اس وقت اس سے بھی کمسن۔ اسے اس قدر نحیف و نزار اور زرد رو دیکھ کر یہ خیال ہوتا تھا کہ ہوا کا ہلکا سا جھونکا اس کے چراغ زندگی کو ہمیشہ کے لئے گل کر دے گا۔ اس کے بھولے بھولے سپید ہاتھ اتنے نازک تھے کہ اُن سے چائے دانی بمشکل اُٹھ رہی تھی، پھر بھی وہ میزبانی کے فرائض ادا کرنے میں مشغول تھی۔ یکبارگی اس کے رخساروں پر ایک ہلکا سا رنگ آیا اور اُس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

"یہ کمرہ کس قدر بڑا ہے!" اس نے فین کی طرف پیالی بڑھاتے ہوئے کہا "اس میں تو سینکڑوں آدمی سما جائیں"۔

"ہاں! بڑا عظیم الشان ہے" فین نے چاروں طرف نظر دوڑاتے ہوئے جواب دیا "رنگ ساز نے چھت پر تصویریں بنا کر کمال کر دیا ہے"۔

"بے شک۔ کیوپڈ اور دیویاں کتنی خوبصورت ہیں۔ لیکن روز روشن میں یہ چھت اور بھی اچھی معلوم ہوتی ہے۔ ہم یہاں گیس نہیں جلاتے، اس لئے یہ جگہ تاریک رہتی ہے، یوں بھی اسے روشن کرنے کے لئے ان فانوسوں میں کئی کئی سو موم بتیاں جلانے کی ضرورت ہے"۔

"کہیں کفایت کے خیال سے تو اندھیرا نہیں رکھا جاتا؟" فین نے ناداناً کہا۔

"نہیں۔ اسے روشن کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی، کیونکہ ہم لوگوں کو مدعو نہیں کرتے اور اگر کریں بھی تو آئے کون؟ ہمارے آس پاس زیادہ آدمی نہیں رہتے"۔

"تو بستی یہاں سے کتنی دور ہے؟" اس نے سوال کیا۔

"کافی فاصلے پر ہے۔ دُور دور تک کوئی ہمارا جاننے والا نہیں ہے"۔ روز نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔ مگر اس کی ہنسی میں تلخی پنہاں تھی۔

"اس حالت میں تو وقت بڑا بے کیف گزرتا ہوگا" فین نے اُس کے متغیر چہرے کا مطالعہ کرتے ہوئے کہا۔ "آپ کو کچھ دوست احباب بنانے چاہییں تاکہ اُن کے ساتھ ذرا ہنس بول کر وقت گزرے۔"

"آپ کی رائے مناسب ہے۔ مگر مسٹر ایلنگھم اس قسم کی باتوں پر کبھی غور نہیں کرتے"، روز نے فوراً کہا۔ "ان کو لوگوں کا جمع ہونا پسند نہیں ہے۔"

چند لمحات گزر گئے۔ فین نے ازراہِ ہمدردی پوچھا "آپ کو تکلیف کیا ہے؟"

وہ اپنے شانوں کو جنبش دیتے ہوئے بولی "ایک روگ ہو تو بتاؤں! ——— غشی، نقاہت، اختلاج ——— ذہنی انتشار۔ یہ لیجئے ہیرلڈ آ گئے۔"

اپنے شوہر کے داخل ہوتے ہی اس نے گفتگو ختم کردی، جیسے کوئی پھول دستِ گلچیں کے لگتے ہی مرجھا جائے۔ ایلنگھم کا وہی حال تھا، وہی کس بل اور ویسا ہی شاندار لباس۔ فین کو دیکھ کر اس نے وہی انداز اختیار کیا جو ایک دولت مند میزبان اور حوصلہ افزائی کرنے والے سرپرست کا ہوتا ہے۔ فین کے جذبات کو اس سے ٹھیس لگی لیکن مسز ایلنگھم کی خاطر اس نے اسے بھی برداشت کیا۔

اسے مہمان داری کے سلسلے میں کوئی شکایت نہیں ہوسکتی تھی کیونکہ قیام کے لئے اُسے آرام دہ اور پرتکلف کمرے دیئے گئے تھے اور ناشتے اور کھانے کے لئے بہتر سے بہتر خوراک کا انتظام تھا۔ مزید برآں مسٹر ایلنگھم کی اجازت تھی کہ اس کا اسپ سواری کو دل چاہے تو اس کا جو گھوڑا اسے پسند ہو لے لے۔ تصویرکشی کے بارے میں اس سے یہ طے ہوا کہ وہ ڈنس کمب ہال کی دو درجن تصاویر مختلف زاویوں سے بنائے اور جب اُس نے کام کو شروع کیا تو ہمہ تن اسی میں منہمک ہوگیا۔

ڈنس کمب ہال کی جاگیر میں بلاشبہ تصویرکشی کے لئے بے مثل اور وافر مواد تھا۔ اور اس کی طرزِ تعمیر اور ماحول پر اگرچہ اُداسی چھائی ہوئی تھی۔ مگر حد درجہ کشش بھی تھی۔ فرصت کے اوقات میں اس کا دل چاہتا کہ مسز ایلنگھم سے باتیں کرے لیکن اس کو اکثر اس سے محروم رہنا پڑتا۔ کیونکہ وہ کسی نہ کسی عارضے میں مبتلا ہوتی، اور اگرچہ وہ اپنی ہمت سے رات کے کھانے میں شرکت کرتی لیکن بارہا یہ بھی ممکن نہ ہوتا۔ ایک دفعہ اس کے شوہر نے اس کی عدم شرکت پر معذرت کی "میری بیوی کم عمر ہے اس لئے ذرا ذرا سی تکلیف کو بہت زیادہ محسوس کرتی ہے۔ ڈاکٹر نے مجھے بتایا ہے کہ اس میں صرف خون کی کمی ہے، اور ذرا خزاں کا موسم بھی اس پر اثر انداز ہے، ورنہ کوئی تشویش کی بات نہیں۔"

"مگر میں تو سمجھتا ہوں کہ انھیں کوئی بہت بڑی تکلیف ہے۔" فین نے فوراً اپنی رائے ظاہر کردی۔

"اچھا!" مسٹر ایلنگھم مسکرائے "شاید آپ عورتوں کی فطرت سے واقف ہیں۔ وہ جیسا چاہیں بن سکتی ہیں! مسز ایلنگھم کو کوئی مہلک مرض نہیں، وہ اگر بیماری کو اہمیت نہ دیں تو کل کی ہوتی آج ہی اچھی ہوجائیں۔"

فین نے اپنے غصے کو دبانے کے لئے جلدی سے شراب کا جام چڑھایا، کیونکہ ایلنگھم کے یہ سنگ دلانہ فقرے اس سے برداشت نہیں ہوسکے۔ پھر یہ سوچ کر کہ میرا اس معاملے میں کچھ بولنا مناسب نہیں ہے۔

وہ غموں کے سے گھونٹ پی کر رہ گیا

"آپ نے اس مقام کی بھی تصویر بنائی جہاں رُوح آیا کرتی ہے؟" ایلنگھم نے باتوں باتوں میں سوال کیا۔

"نہیں، ابھی مجھے اس کے دیکھنے کی مہلت نہیں ملی۔"

"ہاں، ابھی تو آپ اس گھر ہی کی تصویروں میں مصروف رہے۔" ایلنگھم نے گویا فین کی مصروفیت پر صاد کرتے ہوئے کہا "لیکن میری رائے ہے کہ آپ اُس مقام سے پت جھڑ کے ختم ہونے سے پہلے ہی فارغ ہولیں، آپ کے مطالعہ کے لئے وہ لاجواب جگہ ہے۔"

"بہتر، اُسے کل دیکھ لوں گا۔" فین نے جواب دیا۔

دوسرے روز وہ وہاں جانے کے لئے علی الصباح بیدار ہوا اور ایک مالی کے بتائے ہوئے راستے پر چل پڑا۔ جب وہ منزلِ مقصود پر پہنچا تو دریا کی چمکتی ہوئی سطح دیکھ کر اس پر وجد سا طاری ہو گیا ——— ساری گرد و نواح سحر ناک حسن و جمال سے مملو تھی اور یہاں کی ہیبت ناک تنہائی اور مسلسل سکوت دیکھ کر اس نے دل میں سوچا کہ کوئی تعجب نہیں اگر لوگ اس ماحول سے متاثر ہو کر یہ اُڑا دیں کہ یہاں کوئی رُوح آتی ہے۔ سال اور شیشم کے تناور درخت چادرِ آب پر دُور تک سایہ کرتے چلے گئے تھے، فرش پر سبز اور کشمشی رنگ کا نشیب و فراز تھا۔ اور کہیں کہیں شاہ بلوط کے پیڑوں اور گلِ اشرفی کے پودوں سے جنتِ نظر تعمیر ہو رہی تھی۔ فین کے دل پر اس نظارے کا براہِ راست اثر ہوا اور اس نے فوراً پنسل سے ایک اسکیچ بنا لیا۔ تاکہ بعد میں اُسے بڑا کر کے لندن کی نمائش میں بھیجے۔ پھر گزشتہ دن کا کام ختم کرنے کے لئے وہ جلدی سے گھر لوٹا تو خلافِ توقع اس کی مسز ایلنگھم سے ملاقات ہو گئی۔ جو شہ نشین میں چہل قدمی کر رہی تھیں۔

"کہیئے آپ اُس جگہ ہو آئے جہاں رُوح آیا کرتی ہے؟" اُس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

ایک لمحہ کے لئے وہ کچھ نہ بول سکا۔ رُوزی کے بھولے مکھڑے کی غمناکی، نازک آنکھوں کی افسردگی، تنِ لاغر کی حسرت ناک جنبش، سب نے مل کر اس کے دل پر ناقابلِ بیان اثر کیا۔ اس کی نظروں میں وہ ایک بچے سے زیادہ نہیں تھی جو تھک کر چُور ہو گیا ہو اور چاہتا ہو کہ کوئی اسے اپنی پُر محبت آغوش میں لے لے اور آرام سے پنگورے میں سُلا دے۔ اُس کی آنکھوں میں ترحم کا سیلاب اُٹھ آیا۔ مگر اُس نے بدقت تمام المناک فضا کو دُور کرنے کے لئے مذاقاً جواب دیا۔ "جی ہاں، میں وہ جگہ دیکھ آیا لیکن کوئی رُوح نظر نہیں آئی مسز ایلنگھم! کہیں آپ تو رُوح نہیں ہیں؟ اس وقت تو آپ کچھ ایسی ہی معلوم ہوتی ہیں۔"

"اچھا!" اس کے چہرے پر زردی کھنڈ گئی "مجھے علالت سے نفرت ہے ——— کیونکہ میرے شوہر بیماری کو پسند نہیں کرتے۔ کاش میں جلدی صحت یاب ہو جاتی۔"

"آج آپ کی طبیعت کچھ زیادہ خراب ہے؟" فین نے ایسے لہجے میں پوچھا، جس سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ اس کا دل اس کے لئے بے چین ہے۔ اس نے

بھی اُسے ایسی نظروں سے دیکھا جن میں شکر گزاری جھلک رہی تھی۔

"نہیں تو" روزؔ نے جواب دیا۔ "ڈاکٹر کی رائے میں آج نقاہت ذرا زیادہ محسوس ہو رہی ہے۔ لیکن ہیرلڈ کا خیال یہ ہے کہ عورتیں بنتی زیادہ ہیں اور وہ سمجھتے ہیں کہ میں خود تندرست ہونے کی کوشش نہیں کرتی ہوں۔ آپ کتنے اچھے ہیں کہ میرا خیال رکھتے ہیں ——"

"اچھے ہیں؟" اس نے گھبرا کر دہرایا، پھر اِدھر اُدھر دیکھ کر کہ کوئی ہے تو نہیں وہ اس کے قریب آگیا۔ "مسز الینگھم! میری گستاخی معاف کیجیے، میں یہ سوال کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ —— کیا آپ واقعی خوش و خرم ہیں؟"

روزؔ نے سہم کر اُسے سرتاپا دیکھا، پھر اس کی آنکھوں میں ہمدردی اور رفاقت پاکر خود اس کی آنکھوں میں یکایک آنسو بھر آئے۔

"نہیں میں خوش نہیں ہوں" وہ لڑکھڑائی "لیکن مجھے ایسا نہیں کہنا چاہیے۔ کیونکہ یہ سراسر میرا قصور ہے۔ مجھے خوش رہنا چاہیے —— مجھے ہر چیز میسر ہے۔"

"سوائے —— محبت کے!" فینؔ نے سرگوشی کے لہجے میں کہا اور اس کے دل میں یہ جذبہ بے اختیار پیدا ہو گیا کہ وہ اس نحیف و زار کمسن فرشتے کو اپنی آغوش میں لے لے اور بتائے کہ سچی محبت اور ہمدردی کسے کہتے ہیں۔ مگر اس کا ضمیر اس کے جذبات سے کشمکش کرنے لگا۔

اس نے اسے اس انداز سے دیکھا گویا وہ ملامت کر رہی ہے "آپ غلط سمجھے" اس نے غمگین لہجے میں آہستہ سے کہا "ہیرلڈ کو مجھ سے بڑی محبت ہے۔"

فینؔ خاموش ہو گیا۔ قدرے رُک کر روزؔ نے اسی لہجے میں کہنا شروع کیا "ان کا کوئی قصور نہیں ہے بلکہ میں ہی اس کی ذمہ دار ہوں کہ جتنا مجھے مسرور ہونا چاہیے اتنی نہیں رہتی۔ شاید میری فطرت تشائم ہے مجھے شادی نہیں کرنی چاہیے تھی۔ کیونکہ میں اس لائق نہیں تھی۔ عمر کی وجہ سے نہیں، بلکہ اس لئے کہ تعلیم کی تکمیل اور احساسات میں بالغ نظری پیدا نہیں ہوئی۔ دیکھئے نا، چونکہ میں بڑی عمر کی نہیں ہوں۔ اس لئے مجھ سے ہمیشہ بچوں کا سا سلوک کیا گیا۔ شادی کے وقت تک میری ماں مجھے مُنّی کہا کرتی تھیں۔ آپ کو یاد ہے "گنج بہاراں" میں میں نے آپ سے کیا کہا تھا؟ یہ کہ —— میں سمجھتی تھی کہ شادی شدہ عورت، بڑی، موٹی اور اہم شخصیت کی مالک ہوتی ہے۔ جب ہی تو پڑوس کی بیاہی ہوئی عورتیں مجھے دیکھ کر ہنستی ہیں۔"

"وہ بڑی بدتمیز ہیں" فینؔ نے غصے سے کہا۔

"نہیں، نہیں" وہ ہنسی "کبھی کبھی وہ آجاتی ہیں تو ان کا سوال ہوتا ہے "آپ اتنی بڑی جاگیر کا انتظام کر لیتی ہیں؟ نوکر آپ سے سرکشی تو نہیں کرتے؟ آپ کی صحت اچھی ہے؟ اُن میں سے ایک عورت کو مجھ پر بڑا ترس آتا ہے۔ اور وہ کہتی ہے کہ اتنی بڑی جاگیر کا انتظام کرنے کے لئے تم بہت کم عمر ہو، اور یہ حقیقت ہے! ڈنس کمب ہال بہت بڑی جاگیر ہے —— ہے نا؟"

وہ دونوں ٹہلتے ٹہلتے شہ نشین کے موڑ پر پہنچ گئے۔ سامنے کی دیوار پر سفید گلاب کی بیل منڈھی ہوئی تھی اور کھلے ہوئے پھولوں کے گرد کالے کالے بھونرے چکر کاٹ رہے تھے۔ فینؔ اس کے سوال پر چونک پڑا "ہاں! بہت بڑی جگہ ہے۔ لیکن یہاں اُداسی چھائی رہتی ہے۔ گویا یہ نالۂ الم ہے۔ نغمۂ مسرت نہیں۔"

روز نے اُس کو نگاہ بھر کر دیکھا اور خاموش ہو رہی۔ پھر ذرا وقفے کے بعد وہ کٹہرے پر جھکی اور قریب سے ایک گلاب توڑ کر آپ کو پیش کیا۔ مگر وہ اسے ابھی پوری طرح پکڑنے نہ پایا تھا کہ اُس کی پنکھڑیاں بارش کے پہلے چھینٹے کی مانند اس کے قدموں میں گر پڑیں۔

"مجھے اس کا اندیشہ تھا" روز نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "خزاں نے اس کا خونِ حیات خشک کر دیا ہے۔ اچھا اب مجھے آپ کا زیادہ وقت نہیں لینا چاہیئے۔ میں آپ کے کام میں مخل تو نہیں ہوتی؟"

"نہیں" اُس نے معاً جواب دیا اور پہلے اُسے دیکھا۔ پھر گلاب کی گری ہوئی پنکھڑیوں پر حسرت سے نگاہ ڈالی۔

"ارے" روز نے شگفتہ لہجے میں کہا "معلوم ہوتا ہے آپ کو اس پھول کے ضائع ہو جانے کا بڑا رنج ہے"

"بے شک" اس نے اعتراف کر لیا "مجھ سے کوئی حسین شے یوں برباد ہوتے ہوئے نہیں دیکھی جاتی"

"لیکن بے شمار حسین چیزیں یونہی برباد ہو جاتی ہیں" روز متاسف آواز میں بولی "اور ہر شخص کو اتنی سہار پیدا کرنی چاہیئے۔ آپ کو اپنی وہ تصویر یاد ہے جس میں آپ نے ایک درخت کو بجلی سے تباہ ہوتے ہوئے دکھایا تھا؟ اس میں کتنی تصور زائی تھی! میں سمجھی گویا کسی پاک زندگی کی بربادی کو آپ نے مصور کر دیا ہے۔ یہ نرم و نازک گلاب جو ہاتھ لگانے سے مرجھا جاتے ہیں میرے نزدیک ذی حیات ہیں، آہ، ان کی قسمت میں صرف یہ لکھا ہے کہ کسی کی بے رحمی کا شکار ہو کر خاک میں مل جائیں اور کسی کو ان کی پرواہ بھی نہ ہو۔ میرا تو ایمان ہے کہ ہر پھول کا دل رنج و غم سے چُور چُور ہے"

وہ مسکراتی ہوئی اُس کے پاس سے رخصت ہوئی۔ اور گھر میں داخل ہو گئی۔ اس کی نظروں سے اوجھل ہوتے ہی نین کے دل میں ایک ہُوک سی اُٹھی مگر وہ بجز آہِ سرد بھرنے کے کچھ نہ کر سکا۔ پھر اس نے آہستہ سے گری ہوئی پنکھڑیوں کو جمع کیا، اور لبوں سے لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔

دوسرے روز نومبر کی پہلی تاریخ تھی اور خوشگوار موسم کا آغاز، چنانچہ نین اس موقعہ سے فائدہ اٹھانے کے لئے صبح ہی صبح نکل گیا۔ رات گئے جب وہ واپس ہوا تو اس نے سنا کہ آج مسز ایلنگھم پر غشی کے بار بار دورے پڑے ہیں اور اب بھی ملازم ڈاکٹر کو بلانے گیا ہے۔ اُسے سخت تشویش ہوئی اور وہ کھانے کے کمرے میں پریشان و مضطرب داخل ہوا، لیکن اس نے دیکھا کہ اس کا میزبان آرام سے بیٹھا ہے۔ اور اپنی بیوی کے متعلق اسے کسی قسم کا فکر نہیں۔ وہ بے اختیار اس کی کیفیت معلوم کرنا چاہتا تھا کہ بروقت اس کے دل میں آئی "جب یہ اس کی علالت کی طرف سے بے فکر ہے تو میرا کسی قسم کی بے چینی اور ہمدردی کا اظہار مناسب نہیں ہے۔ آخر میں کون ہوں؟ میری حیثیت ایک مہمان بلکہ اُجرت پر کام کرنے والے مصور ہی کی تو ہے"

"روز کو نقاہت زیادہ ہے" ایلنگھم نے شیمپین مزے لے لے کر پیتے ہوئے کہا "اور اس صورت میں غشی کے دورے خطرناک نہیں ہوتے بلکہ ان سے

مریض کو آرام ملتا ہو۔ اُسے چاہئے کہ وہ تندرست ہونے کی کوشش کرے۔ میرے خیال میں اُسے آب وہوا کی تبدیلی کے لئے ساحلِ سمندر پر جانے کی ضرورت ہے۔ اور اگرچہ مجھے اس سے سخت تکلیف ہوگی۔ مگر خیر میں اس کے ساتھ جاؤں گا۔"

اس کی رعونت اور بے پروائی سے فینؔ کا غصہ تیز تر ہوا جا رہا تھا۔ جس طرح بھی ہو سکا اس نے چند نوالے زہر مار کئے۔ مگر اس کا دل چاہتا تھا کہ اُس کو پاؤں سے مسل دے اور اس پر سے روندتا ہوا گزر جائے۔ کھانا ختم ہوتے ہی وہ خطوط لکھنے کا عذر کرکے وہاں سے رخصت ہوا، اور اپنے بھڑکے ہوئے جذبات کو سکون آشنا کرنے کے لئے رات کی خنک فضا میں نکل آیا۔ اس کی طبیعت روزؔ النگھم کی طرف سے بڑی فکر مند تھی۔ لیکن ساتھ ہی اس کو النگھم پر بے حد غصہ آرہا تھا۔ ہر طرف چاندنی پھیلی ہوئی تھی اور وہ غصے اور نفرت کی آگ میں بُھنا ہوا، یہ جانے بغیر آگے ہی بڑھتا جا رہا تھا کہ وہ کہاں سے کہاں نکل گیا ہے۔

"مجھ سے یہ برداشت نہیں ہو سکتا"، آخر اس کے جی میں آیا "میں کل ہی یہاں سے چلا جاؤں گا۔ موعودہ کام میں گھر سے بھی کرکے بھیج سکتا ہوں ــــ مجھے کافی مواد مل گیا ہے۔ اگر کہیں میں یہاں ٹھیر گیا تو ضرور اس فرعون کا قصہ پاک کر دوں گا یا ــــ یا بڑی بے عزتی سے نکالا جاؤں گا۔"

دفعتاً اسے غیر معمولی ٹھنڈ محسوس ہوئی اور اس کے تمام جسم میں ایک کپکپی سی دوڑ گئی۔ وہ رُکا اور مُڑ کر دیکھا ــــــــ اس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب اُسے معلوم ہوا کہ اُس کے عین مقابل وہی مقام ہو جس کے متعلق مشہور ہو کہ یہاں کوئی روح آتی ہے۔ دریا مہتابی کرنوں میں، صیقل کئے ہوئے آہن کی طرح چمک رہا تھا اور سارے ماحول پر خوف اور دہشت چھائی ہوئی تھی۔ پھر گویا کسی نے اس کے دل پر اپنا سرد ہاتھ رکھ دیا ہو، اس کا غصہ ایک غم ناک آہ میں تبدیل ہو گیا۔ اس کی پھٹی پھٹی آنکھیں روح کے بتائے ہوئے مقام پر لگی ہوئی تھیں اور اس کا ذہن ہر قسم کے خیال سے معرا تھا۔ جنبش کی اس میں سکت نہ تھی، اور وہ وہاں اس طرح کھڑا تھا جیسے زمین نے اس کے قدم پکڑ لئے ہیں۔ ایکاایکی اس نے دیکھا کہ دریا کی چمک دار وسعت پر ایک زرد سا سایہ نمودار ہوا جس نے آہستہ آہستہ ایک کشتی کی صورت اختیار کرلی۔ وہ اسے بغور دیکھ رہا تھا کہ کسی مخفی ڈر نے اس کے رونگٹے کھڑے کر دئے۔ سفینے کو حرکت ہوئی اور وہ آہستہ خرامی سے درختوں کے سایوں میں سے گزر کر چاند کی صاف وشفاف روشنی میں آگیا۔ پھر ایسا نظر آیا کہ اس میں کسی عورت کی رُوح سوار ہے جو سپید لباس میں ملفوف اور سرو قد کھڑی ہوئی ڈنس کمب ہال کی طرف اشارہ کرکے کسی کو اپنے پاس بُلا رہی ہے۔ اس عرصے میں سفینہ دریا کے بیچوں بیچ پہنچ گیا۔ جہاں چاندنی سب سے زیادہ وسیع اور چمک دار تھی۔ چند لمحات تک وہ روح کسی کا انتظار کرتی رہی۔ پھر بار بار اس نے ہاتھ سے بُلانے کا اشارہ کیا۔ جس کی جنبش سے کبھی التجا، اور کبھی حکم مترشح ہوتا تھا، اور آخر کار کہر اور دھوئیں کے ہار کی طرح وہ دیکھتے ہی دیکھتے نظروں سے روپوش ہو گئی۔

ہوش آنا تھا کہ فلین کے منہ سے ایک دلدوز چیخ نکل گئی جس کی گونج سن کر چند اُلو سیٹیاں بجاتے ہوئے تاریک بن میں اُڑے، اور آن واحد میں اُسے وہ روایت یاد آگئی ——— " ڈنس کمب ہال کی روح صرف اُسی وقت نمودار ہوتی ہے۔ جب خاندان کا کوئی فرد موت سے ہمکنار ہو۔"

" او خدا! " اس کے منہ سے بے اختیار نکلا " کیا یہ سچ ہے ؟ " اور بغیر کچھ اور سوچے وہ اپنی انتہائی رفتار سے ڈنس کمب ہال کی جانب بھاگا، گویا وہ اپنی زندگی کی شرط بد کر دوڑ رہا ہے۔ وہ بری طرح ہانپ رہا تھا کہ ——— دروازے میں کسی شخص سے، جو اندر سے آ رہا تھا۔ اس کی ٹکر ہوئی۔

" مسٹر الینگھم! ——— " اُس نے بیتابی سے پوچھا۔

" میرا نام مسٹر الینگھم نہیں ہے " باہر آنے والے شخص نے جواب دیا " میں تو ڈاکٹر ڈین ہوں "

" ڈاکٹر! ——— " وہ ایک ستون کا سہارا لے کر بے حال کھڑا ہو گیا " تو مسٹر الینگھم کس طرح ——— ؟ "

" اُن کی روح پرواز کر چکی ہے ——— "

ڈاکٹر نے زیرِ لب کہا۔

پانچ نئے ناولٹ

نیلم

تصنیف صادق الخیری ایم۔ اے

یہ اُردو کے نازک خیال افسانہ نگار اور "دھنک" کے نامور مصنف کا تازہ ترین رومان ہے جس میں اس رنگین بیان انشا پرداز نے ایک شاعر مصوّر، اور ایک خانہ بدوش مغنیہ کا محیر کن فسانہ عشق سُنایا ہے۔

حسن و وفا کی اس خونچکاں داستان کا مطالعہ آپ کو رہگذارِ حسن و رومان میں گم کر دے گا۔ قیمت عہ

مینا

تصنیف ظفر قریشی بی۔ اے

"مینا" زندگی کے کرب و بلا میں پھنسی ہوئی ایک بےچین و مضطرب روح کی بے باک داستان ہے۔ ایک ایسی طوفانی کہانی جو انجام پر پہنچ کر ایک نرم ندی کا سا گیت بن جاتی ہے۔ کنوار پتے کی لغزش، سماج کی آن اور محبت و ممتا کی بے پناہ کشمکش ایک ایسا سانحہ حیات ہے جو ہر فانی انسان کو پیش آ سکتا ہے۔ "مینا" اس سانحے کی دلگداز تصویر ہے۔ قیمت عہ

زہراب

ترجمہ محمود احمد خاں ایم۔ اے

مصنف کہتا ہے "اس شکستہ پر الکسو نے ہر طرف سے ناکام و نا اُمید ہو کر اپنی حسین و جمیل بیوی کو ——— جو سیفو کی شعریت اور یونانی اصنام کا حسنِ مجسم تھی ——— مجبور کیا کہ وہ اپنا گوہر عفت قربان کر دے! .... اور جن حالات میں گھر کر وہ یہ کر گزری ان سب کے پیش نظر وہ بے گناہ بلکہ عفیف و پاکیزہ رہی"

اس اچھوتے ناولٹ کو پڑھ کر خود فیصلہ کیجئے کہ کیا آپ مصنف سے متفق ہیں؟ قیمت عہ

لغزشیں

ترجمہ فضل حق قریشی

حسن و شباب کے کٹھن مراحل اُس بھولی بھالی مگر رہزنِ تمکین و ہوش نے کس طرح گزارے؟ یہ آپ ایف ڈبلیو بین کے اس انوکھے ناولٹ میں ملاحظہ فرمائیے۔ قیمت عہ

نوشاب

ترجمہ احمد نعمان

شام کے شہرۂ آفاق مصنف خلیل جبران کا شہ پارہ! "نوشاب" رعنائی خیال اور پاکیزگی بیان کے لحاظ سے اس وحید العصر مفکر کا شاہکار ہے۔ قیمت عہ

خاتون کتاب گھر، دہلی

سفینے

حصۂ دوم

کافر

ناہتی پو ابھی سال بھر کا تھا کہ اس کی ماں کا انتقال ہوگیا۔ اس لئے اس کی پرورش اور دیکھ بھال خود اس کے باپ کیرا ہمام کے سپرد تھی جو سُوت کی انٹیاں اور بان کے رسّے بٹ بٹ کر گزارہ کیا کرتا تھا۔ اُسے لوریاں سُننی کبھی نصیب نہ ہوئیں البتہ درخت کے گھنے سائے میں لیٹے لیٹے وہ اپنے باپ کو سوت کاتتے وقت گنگناتے ہوئے اکثر سُنتا تھا، لیکن یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ تکلے میں سے سوت کیوں نکلے چلا آتا ہے؟ یہ کبھی ختم کیوں نہیں ہوتا؟

اور جب وہ گھٹنیوں چلنے کے قابل ہوگیا تو اس کے فہم وادراک کی تعمیر ہونے لگی۔ اس نے سوچا، یہ دُنیا تو بہت بڑی ہے کیوں نہ خوب چل پھر کر اس کے کونے کونے سے واقف ہو جاؤں؟ چنانچہ جب تک اس کے گھٹنے تھک نہیں جاتے وہ اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر گھٹنیوں چلتا رہتا اور اس انداز سے چلتا گویا وہ کوئی بہت بڑا ماہرِ کائنات ہے جو دنیا کے نئے نئے ممالک معلوم کرنے میں ہمہ تن مشغول ہے۔

کیرا ہمام بھی اُسے بھاگے بھاگے پھرنے سے نہیں روکتا تھا۔ وہ بس یہ چاہتا تھا کہ یہ میرے اوزاروں کو نہ چھیڑے اور میرے کام میں ہارج نہ ہو۔

صبح اور شام کا کھانا باپ بیٹے ایک ہی پیالے میں کھاتے اور شب کو دونوں ایک ہی چٹائی پر سو جاتے تھے۔ رات گئے جب کیرا ہمام شفقتِ پدری کے جوش میں اس کو اپنے پہلو سے چمٹا کر بھینچتا تو ناہتی پو کو بہت لطف آتا اور وہ سمجھتا کہ اُسے دُنیا جہان کی دولت مل گئی ہے۔ اب اُسے کچھ اور نہیں چاہئے۔ پھر جب وہ اور بڑا ہوگیا تو اس نے محسوس کیا کہ دنیا تو بڑی حسین وجمیل ہے۔ دھوپ! چھاؤں! سبزہ! آبِ رواں! بھاگتے ہوئے بادل!!! اور پھر ہوا بھی تو ہے جو کبھی چلنے لگتی ہے، کبھی رُک جاتی ہے۔ مگر دکھائی نہیں دیتی۔ خاص کر متحرک چیزیں آنکھوں کو، نرم آوازیں کانوں کو، اور میٹھی چیزیں زبان کو بہت اچھی معلوم ہوتی ہیں۔ چمکیلے دن لمبے اور ٹھنڈی راتیں مختصر ہوتی ہیں۔ مٹی میں پانی ملاؤ تو کھلونے بن جاتے ہیں۔ سوکھے ہوئے پتے ندی میں پھینک دو تو وہ اس طرح بہنے لگتے ہیں جیسے ننھی ننھی کشتیاں۔ سنگریزوں کو تالاب میں ڈالو تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہنس کے جوڑوں نے ابھی ابھی غوطہ لگایا ہے۔ پڑوس کے اور بچے بھی اس کے ساتھ ان کھیلوں میں شریک ہو جاتے تو اسے خوب مزا آتا، بھلا اس سے زیادہ اُسے کس چیز کی ضرورت تھی؟

کئی سال تک اُسے زندگی بالکل سیدھی سادی معلوم ہوئی اور اس کے دل میں کسی چیز کے متعلق کوئی سوال پیدا نہیں ہوا۔ لیکن جوں جوں زمانہ گزرتا رہا اُسے نئی نئی باتوں سے دوچار ہونا پڑا جس کا

نتیجہ یہ نکلا کہ خارجی اور داخلی اثرات نے مل کر اس کا اپنا ذہن مرتب کر دیا اور اس ذہن کی مدد سے وہ زندگی کا مفہوم سمجھنے لگا جو اس کے لئے اب روز بروز دلچسپ سے دلچسپ تر ہوتی جا رہی تھی۔

گاؤں کے بیچوں بیچ ایک مندر تھا جس کی حفاظت ایک بوڑھے پجاری کے سپرد تھی۔ گاؤں والے یہاں روزانہ اچھی خاصی تعداد میں پوجا کرنے آتے تھے۔ اور کبھی کبھار کیرا یام بھی ناہتی پو کو ساتھ لے کر وہاں چلا جاتا تھا۔ وہ اس موقع پر سفید براق اور بہت لانبا لباس پہنتا اور پوجا کے وقت کچھ ایسی دردناک آوازیں نکالتا کہ ناہتی پو کو رونا آ جاتا تھا۔ وہ مندر میں لوگوں کو ایک ہی طرح سر ہلاتے، کمر جھکاتے اور ہاتھ پھیلاتے دیکھ کر دل میں کہتا کہ مندر میں تو عجب تماشا ہوتا ہے۔ چاہے یوں یہ لوگ خاموش رہیں مگر یہاں ان کی زبانیں کیسی قینچی کی طرح چلتی ہیں! خصوصاً یہ بات تو اُسے بہت ہی مضحکہ خیز معلوم ہوتی کہ پوجا میں سب کے منہ سے ایک ہی جیسے لفظ نکلتے ہیں۔

ایک دن باپ بیٹے مندر سے واپس آ رہے تھے کہ ناہتی پو نے کہا "بابا! تم مندر میں کیا باتیں کر رہے تھے؟"

باپ نے جواب دیا "بیٹا! وہاں باتیں تھوڑی کرتے ہیں! وہاں تو پوجا کی جاتی ہے!"

"پوجا؟ پوجا کیوں کی جاتی ہے؟"

"پوجا اس لئے کرتے ہیں کہ ہمیں کسی چیز کی حاجت نہ رہے۔ جو پوجا نہیں کرتا اس کے بُرے دن آ جاتے ہیں۔"

"لیکن بابا! میرے پاس تو بغیر پوجا کئے ضرورت کی تمام چیزیں موجود ہیں۔ مجھے تو اور کچھ نہیں چاہئے۔"

"کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ انسان کے قبضے سے اس کی ساری چیزیں نکل جاتی ہیں"۔ باپ نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا "ہمیں چاہئے کہ پوجا سے کبھی غافل نہ ہوں، کیا خبر ہم پر کب مصیبت کا پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ بڑے ہو کر تمھاری بھی کچھ نہ کچھ ضروریات ہونگی، لہٰذا تم بھی پوجا کیا کرو گے؟"

ناہتی پو نے سُنی اَن سُنی ایک کر دی۔ فی الحال اُسے کسی شے کی ضرورت نہیں۔ پھر وہ کیوں خواہ مخواہ کی فکر کرے۔ پھر دفعتاً باپ کا ساتھ چھوڑ کر وہ ایک پگڈنڈی پر گھوڑا گھوڑا کھیلتا ہوا بھاگ گیا۔ اس کے چاروں طرف زندگی لہرا رہی تھی۔ دھوپ اور ہوا سے متاثر ہو کر اس نے اپنے ہاتھ پھیلا دیئے اور کبھی مٹھیاں کھولنے اور کبھی بند کرنے لگا۔ لیکن یہ کیا؟ اس کی مٹھیاں ہمیشہ خالی کیوں رہتی ہیں؟ یہ ساری دُنیا تو اتنی کچھ چیزوں سے بھری پڑی ہے مگر اس کے ہاتھ کچھ نہیں آتا؟ — آج پہلی بار اُسے اپنی محرومی کا احساس ہوا۔

"میں کیوں پوجا کروں؟" ناہتی پو نے اپنے سوال کا خود ہی جواب دے دیا۔ "مجھے کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ہے؟"

یکایک وہ ٹھہر گیا۔ سامنے کی سڑک پر کسی امیر کا بچّہ اپنے نوکر کے ساتھ ایک خوبصورت سی رنگ برنگی بیل گاڑی گھسیٹتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ اس گاڑی میں دو سفید بیل جُتے ہوئے تھے جن کے سینگوں پر سونے کا پانی پھرا ہوا تھا اور گاڑی بان کی پگڑی بھی

چمکیلی اور سنہری تھی۔ ناہتی پو کو یہ کھلونا بہت پسند آیا اور اس کے لئے اس کی طبیعت مچل گئی۔ چنانچہ اس نے لپک کر راستہ روک لیا اور کہنے لگا" یہ گاڑی مجھے دے دو مجھے اس کی ضرورت ہے۔ میں تم سے بڑا ہوں۔ اس لئے میری ضرورت پہلے پوری ہونی چاہئے"۔
مگر جب نوکر نے اُسے گھُور کر دیکھا تو ناہتی پو بڑا سٹ پٹایا۔ اپنے سے بڑے کے آگے وہ بے بس تھا، چنانچہ چپ چاپ پرے ہٹ گیا اور وہ رنگ برنگی سنہری بیل گاڑی ٹلک ٹلک کرتی اس کی نظروں سے اُوجھل ہو گئی۔ اُسے بڑا رنج ہوا۔ یہ کھلونا تو بہت عمدہ ہے، اب وہ اسے کس طرح حاصل کرے؟ دنیا بھر میں بس اُسے صرف اسی ایک چیز کی ضرورت تھی اور وہ اس کے لئے بُری طرح بے چین تھا...... معاً اسے اپنے باپ کی نصیحت یاد آئی کہ ضروریات کو پورا کرنے کے لئے پوجا کی جاتی ہے۔ چنانچہ وہ مندر واپس چلا گیا۔ لوگ پوجا پاٹ کر کے جا چکے۔ اس نے سوچا یہ تو اور بھی اچھا ہے۔ کیونکہ دیوتا اب خالی ہوں گے اور ایک اکیلے آدمی کی خواہش پوری کرنے میں ان کو بہت آسانی ہوگی ورنہ بہت سے لوگ ایک ہی وقت میں حاجت روائی کی دُعا کریں تو آخر کس کس کی طرف وہ متوجہ ہو سکتے ہیں؟
وہ ننگے پاؤں اندر چلا گیا۔ سامنے ذرا اُونچی جگہ پر دیوتا کا سیاہ بُت رکھا ہوا تھا جس کے ماتھے کے عین وسط میں ایک بڑی سی آنکھ بنی ہوئی تھی۔ اس کی ٹکٹکی بندھ گئی۔ یہی وہ "چشمۂ فردوس" ہے جو اپنے بندوں کو ہر وقت دیکھتا رہتا ہے۔ اس نے اس کے آگے ہاتھ جوڑے اور سجدے میں گر کر اپنی عمر میں پہلی دفعہ پُوجا کرنی چاہی کہ ـــــ اس نے دیکھا کہ ایک جوان العمر عورت دیوتا کے قدموں میں پڑی ہوئی آہ وزاری کر رہی ہے۔ وہ اسے پہچان گیا۔ یہ اس کے گاؤں کی ایک غریب پنہاری تھی جس کا شوہر شادی کے چند ہی روز بعد اس سے ہمیشہ کے لئے جُدا ہو گیا تھا۔ اگرچہ وہ آہ و بکا اور سسکیوں کی وجہ سے بے حال ہوئی جا رہی تھی مگر اس کے الفاظ صاف سُنائی دے رہے تھے، کیونکہ وہ اپنی دُعا بار بار دہرا رہی تھی" اے دیوتا! مجھے بیٹا عنایت کر! صرف ایک بیٹا!"
ناہتی پو کو بڑی شرم آئی کہ اتنی بڑی ضرورت کے سامنے وہ اپنی معمولی سی ضرورت بیان کرنے آیا ہے۔" اگر دیوتا مجھ پر مہربان ہو گئے تو پھر اس بیچاری کا کیا ہوگا؟ دیوتا آخر ایک ہی تو ہے، ایک وقت میں دو آدمیوں کی تمنائیں کیسے پوری کر سکتا ہے!" وہ فوراً اُٹھ کھڑا ہوا اور یہ سوچ کر کہ جب اس غریب پنہاری کی آرزو پوری ہو جائے گی تو اس کے بعد آ کر میں اپنی ضرورت کا اظہار کروں گا، وہ پوجا کئے بغیر مندر سے باہر چلا گیا۔
اس واقعہ کے بعد وہ جب بھی مندر جاتا اُسے لوگ ہمیشہ دُعا مانگتے ملتے۔ اور جب وہ ان کی دُعاؤں کو بغور سُنتا تو اسے معلوم ہوتا کہ ان لوگوں کی ضرورتیں تو بہت بڑی ہیں۔ جن کے مقابلے میں اس کی ضرورت کی کوئی حقیقت نہیں۔ لیکن اُسے اس بات پر بڑا تعجب تھا کہ ان لوگوں کی ضروریات بے شمار ہیں، اور باوجود اس کے کہ ان کی دُعائیں قبول نہیں ہوتیں وہ برابر دُعا مانگنے چلے جاتے ہیں۔ پھر اس نے اپنی بساط کے مطابق اس کی وجہ خود ہی تراش لی" لوگ

بھی تو اتنے ہیں! خُدا ایک وقت میں سب کی کیسے سُن
سکتا ہے؟ اگر دُعائیں کم ہو جائیں تو وہ باری باری سب
کی سُن لے۔ مگر ایسا کبھی نہیں ہوگا اسی لئے بہت کم
دُعائیں قبول ہوتی ہیں"۔

اس کا خیال تھا کہ جب دوسروں کی بڑی بڑی ضرورتیں پوری ہو جائیں گی تو اس کا نمبر بھی آجائیگا، مگر سالہا سال گزرنے پر بھی اس کی باری نہیں آئی۔ کیونکہ جب بھی وہ دُعا مانگنے کا ارادہ کرتا تو اسے معلوم ہوتا کہ کوئی اور شخص اُس سے زیادہ بڑی ضرورت لیکر دیوتا کے حضور میں آیا ہے۔ اس بات سے وہ بڑا متاثر ہوا اور اس نے سوچا کہ جب کوئی ضرورت پوری نہ ہونے سے مجھے کوئی خاص نقصان نہیں ہوتا تو پوجا کرکے میں دیوتا کو کیوں تکلیف دوں! بس اس طرح وہ اپنی بڑی سے بڑی ضرورت پر بھی توجہہ کرتا رہا، اور اگر کبھی اُسے کوئی بہت ہی بڑی ضرورت درپیش ہوتی تو وہ دیکھتا کہ دوسروں کی ضروریات اس سے بھی بڑی ہیں۔ چنانچہ وہ دُعا مانگنے سے رُک جاتا اور اس وقت کا انتظار کرنے لگتا جب دوسروں کی آرزوئیں پوری ہوں اور اس کی باری آئے۔ لیکن اس انتظار اور توقف سے اُسے کوئی بےچینی نہیں ہوتی۔ بلکہ صبر و قناعت کی بدولت وہ اپنی محرومی کی پروا تک نہ کرتا تھا۔

چند دن بعد ایک عجیب بات اس کے ذہن میں آئی اور وہ آپ ہی آپ کہنے لگا کہ میرے پاس کتنی ساری چیزیں جمع ہو گئی ہیں۔ اچھے اچھے کھلونے، عمدہ عمدہ مٹھائی، خوبصورت کپڑے اور ہم عمروں میں تفوق لیکن کیوں؟ میں نے تو کبھی پوجا نہیں کی، میں نے ان کے لئے کبھی دُعا نہیں مانگی! میں دیوتا کے آگے کبھی نہیں گڑگڑایا!! اور وہ لوگ جو برابر پوجا کرتے رہتے ہیں، جن کا اکثر وقت دعائیں مانگنے میں گزرتا ہے، ان کی ضروریات کبھی پوری نہیں ہوتیں! وہ ہمیشہ محروم و نامراد رہتے ہیں۔ یہ تو بڑی دلچسپ بات ہے! اُسے ہنسی آگئی اور معاً اُسے خیال آیا "کیا خُدا بھی کبھی ہنستا ہے؟ کیا اُسے یہ دیکھ کر ہنسی نہیں آجاتی کہ جو لوگ دُعائیں نہیں مانگتے انھیں نعمتیں ملتی ہیں اور جو پوجا کرتے کرتے مرے جاتے ہیں اُن کی ضروریات ہمیشہ رُکی رہتی ہیں؟" یہ سوال اُسے ایسا ستانے لگا کہ وہ فوراً مندر کے پجاری کے پاس پہنچا اور پُوچھنے لگا "اے پجاری! مجھے یہ بتا دے کہ کیا کبھی خدا بھی اپنے بندوں سے مذاق کرتا ہے؟"

پجاری کو غصہ آگیا اور اُس نے ڈانٹ کر کہا "او نابکار! تجھے ایسے کفر کے کلمے بکتے شرم نہیں آتی؟ نکل یہاں سے!" اس کا غصہ بڑھتا ہی چلا جا رہا تھا کہ ایک تو یہ کبھی پوجا نہیں کرتا اور اس پر طرّہ یہ کہ مندر میں کفر و الحاد کی باتیں کرتا ہے! (اُسے یہ بھی احساس تھا کہ اس نے آج تک مجھے دیوتا کے نام پر کوئی نذرانہ نہیں دیا) ناہتی پو واپس چلا آیا مگر اس کے دل پر یہ بات اچھی طرح نقش ہو گئی کہ خُدا کبھی کبھی مذاق ضرور کیا کرتا ہے۔

(۲)

ایک دن ناہتی پو نے دیکھا کہ ایک پڑوسی کی بھینس پیٹھ کے زخموں کی تکلیف سے بُری طرح کراہ رہی ہے۔ اُسے بڑا رنج ہوا اور اس نے کیرآہام سے دریافت کیا "اے بابا! کیا بھینسوں کی دُعائیں قبول

ہو جاتی ہیں؟"

"تم تو بڑے احمق رہے" باپ نے جھلّا کر کہا۔ "جانور پوجا نہیں کیا کرتے کیونکہ ان کی روحیں نہیں ہوتیں۔ انسان اور حیوان میں یہی تو فرق ہے کہ جانور مر جاتے ہیں مگر انسان کا صرف جسم مُردہ ہوتا ہے اور روح ہمیشہ زندہ رہتی ہے۔ اس لئے ہم لوگ پوجا کیا کرتے ہیں۔"

ناہتی پو کی سمجھ میں زندگی اور روح کا فلسفہ نہیں آیا، البتہ وہ یہ سوال کرنے سے نہیں چُوکا۔ "اے بابا! اگر انسان یعنی اس کی رُوح ہمیشہ زندہ رہتی ہے تو وہ موت سے کیوں ڈرتا ہے؟ لوگ مندر میں جا کر روز دُعائیں کیوں مانگتے ہیں کہ ہمیں لمبی عمر عطا کر!"

"اس لئے کہ زندگی قابلِ قدر ہے" کیراہام رسّے کو ایک اور بل دیتا ہوا بولا "کوئی نہیں جانتا کہ مرنے کے بعد کیا ہوگا!"

"لیکن جو ہونا ہے وہ تو ہو کر رہے گا، پھر جینے سے کیا فائدہ؟"

"کیوں نہیں؟ اگر ہم پوجا پاٹ سے دیوتا کو خوش رکھیں تو ہمیں دنیا کی نعمتیں بھی ملیں اور ہماری عاقبت بھی سُدھر جائے۔"

"تو بابا دیوتا پوجا پاٹ سے خوش ہوتے ہیں؟"

"اور کیا! اگر دیوتا پوجا سے خوش نہ ہوتے تو لوگ کیوں خواہ مخواہ اس میں اپنا وقت ضائع کرتے؟"

"پیارے بابا!" ناہتی پو نے نہایت سادگی سے کہا "میں نے کبھی تمہاری پوجا نہیں کی، پھر تم مجھ سے خوش ہو اور مجھے اچھے سے اچھا کھلاتے ہو۔ اس لئے کیا تم دیوتا سے بدرجہا بہتر نہیں ہو؟"

کیراہام سوچ میں پڑ گیا۔ مذہبی معاملات پر بحث کرنے کی اس میں اہلیت نہیں تھی، اس لئے سچی بات بے ساختہ اس کی زبان پر آ گئی "میں تمھیں اس لئے رزق دیتا ہوں کہ بڑھاپے میں مجھے تم سے مدد ملے۔ اسی طرح جب تم بوڑھے ہو جاؤ گے تو تمہارا بیٹا تمہارے لئے کھانے پینے کا سامان مہیا کرے گا۔"

ان الفاظ کو سن کر ناہتی پو کا دل عبودیت سے لبریز ہو گیا۔ آسمان کے ایک گوشے میں شفق پھول رہی تھی۔ وہ دبے پاؤں باہر نکل آیا اور آسمان کی سُرخی کو پُرشوق نظروں سے دیکھتے ہوئے بے قابو ہو کر چیخا۔ "اے چشمِ فردوس! میرا بھی ایک لڑکا ہو گا۔ میرے بڑھاپے کا سہارا۔" اس سے پہلے کبھی اُسے یہ خیال نہیں آیا تھا، حالانکہ وہ مندر میں اکثر لوگوں کو اولاد کی دعائیں مانگتے سُنا کرتا تھا۔ اس ضمن میں اُسے ایک مفلس عورت یاد آئی جس کی شادی کو دس سال ہو گئے تھے۔ اس عرصے میں شوہر کی مرضی کے خلاف، اس کے ہاں نو لڑکیاں پیدا ہوئیں، لڑکا ایک بھی نہیں ہوا۔ وہ بیچاری ہر بار لڑکے کے لئے دعائیں مانگتی مگر ہر دفعہ لڑکی ہی پیدا ہوتی تھی۔ اور آخری بار تو دو جڑواں لڑکیاں ہوئیں۔ "نہیں! میں لڑکے کے لئے دُعا ہرگز نہیں مانگوں گا۔ کیا خبر دیوتا میرے ساتھ بھی یہی سلوک کریں!؟...... سچ ہے دیوتا کے کام نرالے ہیں! جانے ان پوجا اور دُعاؤں کی کیا حقیقت ہے؟" اور جتنا وہ ان کی ضرورت پر غور کرتا اتنی ہی اُسے مایوسی ہوتی۔

ناہتی پو کو اُن لوگوں پر بہت ترس آتا تھا جن کی دُعائیں قبول نہیں ہوتی تھیں۔ اور وہ سمجھتا تھا

کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ "ہم لوگوں کی تعداد زیادہ ہے اور ہماری دُعاؤں کی کوئی حد نہیں۔ اسی لئے دیوتا سب کی نہیں سُن سکتا۔ ہاں اگر وہ اپنے چند مددگار مقرر کرلے تو بہتر خُدائی کر سکتا ہے۔"

ناہتی پو نے بڑے ہو کر اپنے باپ کا پیشہ اختیار کیا اور چونکہ کیرا ہام بہت بوڑھا ہو گیا تھا اس لئے اس کی توقعات کے مطابق وہ اس کے کھانے پینے اور کپڑے لتے کا تمام سامان مہیا کرنے لگا۔ اس عرصے میں گاؤں کے بچے بچے کو معلوم ہو گیا تھا کہ ناہتی پو کافر ہے۔ وہ دیوتا کی کبھی پوجا نہیں کرتا۔ چنانچہ لوگ اس سے کترا کر چلتے اور برملا اُسے "دہریا" اور "ملحد" کہتے تھے۔ اور ان لوگوں میں پیش پیش مندر کا پجاری تھا جس نے اپنی سی تمام کوششیں کرلیں، مرنے کے بعد جنت کا لالچ اور دوزخ کی مصیبتوں کا ڈراوا تک دیا مگر ناہتی پو نے دوسرے نیک بندوں کی طرح اسے کبھی نذر نیاز نہیں دی۔ ایک دن اس کا گزر ناہتی پو کے گھر کے سامنے سے ہوا۔ وہ اس وقت ایک موٹا رسا بٹ رہا تھا۔ پجاری سے نہ رہا گیا جلے دل کے پھپھولے پھوڑتا ہوا بولا۔ "اچھا اپنے گلے میں پھندا ڈالنے کے لئے رسا بٹ رہے ہو"؟

ناہتی پو کو مطلق ناگوار نہیں گزرا اس نے اطمینان سے جواب دیا "ہاں یہ بھی مرنے کا ایک طریقہ ہے اور میری رائے میں دُعائیں مانگنے سے یہ طریقہ زیادہ کارگر ہے۔ میرے خالو ایک موذی مرض میں مبتلا تھے۔ انھوں نے پانچ برس تک لگاتار دُعا مانگی کہ دیوتا انھیں اس تکلیف سے نجات دے کر اپنے پاس بُلالے مگر کامیاب نہیں ہوئے۔ آخر انھیں خودکشی کرنی پڑی۔ لیکن اگر مجھے مرنا ہوا تو میں دُعا مانگنے کی بجائے خود ہی رسی کا پھندا اپنی گردن میں ڈال لوں گا"۔

"تم بڑے ناہنجار ہو" پجاری نے چلتے چلتے کہا "تم جیسے ملحد کے کون مُنہ لگے! دیوتا تمھیں ان بداعمالیوں کی ضرور سزا دیں گے" اور اب یہ پجاری کی عادت سی ہو گئی کہ جو کوئی مندر میں پوجا کے لئے آتا وہ اُسے ناہتی پو سے دُور رہنے کی تلقین کرتا۔ مبادا اس کا بھی ایمان خراب ہو جائے۔

اب ایک دلچسپ بات سُنئے۔ باوجود اس کے کہ ناہتی پو کی عمر کافی ہو گئی تھی، وہ اب تک کنوارا تھا۔ کیونکہ اسکے باپ میں ضعیفی کے ساتھ ساتھ حسد اور رقابت بھی سرایت کر گئی تھی۔ چنانچہ جب بھی وہ شادی کا ارادہ کرتا، کیرا ہام فوراً اسے یہ کہہ کر منع کر دیتا کہ "میں نہیں چاہتا کہ میرے گھر میں کوئی اجنبی عورت آئے، ورنہ مجھے اپنے بڑھاپے کا احساس ہو گا"۔ اور ناہتی پو ایک فرمانبردار بیٹے کی طرح باپ کی خاطر اپنے ارادے سے باز رہتا۔

آخر کار وہ دن آ گیا جب کیرا ہام کے سرھانے موت منڈلانے لگی اور وہ چٹائی پر پڑا ہوا کرب و بےچینی سے کروٹیں بدلنے لگا۔ اس کی تکلیف برداشت سے باہر تھی، اس لئے وہ اپنے بنڈے کو جگہ جگہ سے بھینچتا اور دردناک آواز میں دیوتا سے رحم کی دُعا مانگتا تھا۔ ناہتی پو نے سب کام کاج چھوڑ دیا اور صبح سے شام تک اپنے باپ کی خدمت گزاری کرتا رہتا مگر اس کی حالت روز بروز خراب ہوتی گئی۔ تیسرے روز اس نے اپنے بیٹے سے خطاب کیا "آہ! دیکھ تجھ جیسے لامذہب بیٹے کی وجہ سے مجھ پر کیسی مصیبت لوٹی ہے۔ اے ناہتی پو!

یہ بیماری نہیں دیوتا کا عذاب ہے۔ تو اب بھی اپنی بے دینی پر نادم ہو اور میری صحت اور زندگی کے لئے صدق دل سے پوجا کر۔ دیکھ ایسا نہ ہو کہ میں مرجاؤں!"

ناہتی پو نے مودبانہ اس کے دونوں پاؤں سینے سے لگا لئے اور ان پر آنکھیں ملتے ہوئے بولا "بابا جب تک جسم میں جان باقی رہے زندگی بے شک قابلِ قدر ہے لیکن جب یہ ختم ہونے لگے تو یہ قابلِ قدر نہیں رہتی۔ اسی لئے ہماری متاع حیات چھین لی جاتی ہے تاکہ ہم آرام کریں۔ آپ موت سے بالکل نہ ڈریئے اور راضی بہ رضا ہوکر پیک اجل کو لبیک کہئے کہ اب یہی آپ کے لئے مناسب و افضل ہے"۔

اور جب ناہتی پو کہہ چکا تو کیرا ہمام نے اُسے خشمگیں نگاہوں سے گھورا اور انتہائی غیظ و غضب میں ہنکارا "اے فردوس کے رہنے والے، میرے اس ملعون بیٹے کو اچھی طرح دیکھ لے کہ آخری وقت میں بھی یہ میری صحت اور زندگی کے لئے دُعا نہیں کرتا۔ یہ لعنت تُو نے ہی مجھے دی ہے اس لئے تجھ ہی سے التجا کرتا ہوں کہ اگلی جُون میں تو مجھے اس کا بیٹا بنا تاکہ جب اسے تیرے رحم و کرم کی ضرورت ہو تو میں اس سے گِن گِن کے بدلے لوں"! اور یہ کہتے کہتے کیرا ہمام نے اس کی طرف سے کروٹ لے لی اور تھوڑی دیر بعد اس کا انتقال ہوگیا۔

ناہتی پو اب آزاد تھا۔ چنانچہ چند روز بعد اس نے ایک خوبصورت دوشیزہ سے شادی کرلی جس کا نام ماظورہ تھا۔ سال بھر تک وہ دونوں نہایت ہنسی خوشی زندگی گزارتے رہے۔ لیکن جب برس بھر بعد اُس کے ہاں لڑکا پیدا ہوا تو ماظورہ سخت بیمار پڑگئی اور اُس نے تکلیف سے بلبلا کر کہا "دیکھو، میری ہی وجہ سے تم اس لڑکے کے باپ بنے ہو جو بڑا ہو کر تمھارا قوتِ بازو اور عصاء پیری ہوگا۔ لیکن زندگی کے پس پردہ مجھے موت جھانکتی نظر آتی ہے۔ کیونکہ میں سخت اذیت میں مبتلا ہوں۔ اس لئے اے ناہتی پو! تم پوجا پاٹ کرکے میری زندگی کے لئے دُعا مانگو، کہیں ایسا نہ ہو کہ میں مرجاؤں!"

ناہتی پو اس کے پہلو میں بیٹھا ہوا تھا۔ یہ حالت دیکھ کر اُس کی آنکھیں پُرنم ہوگئیں اور وہ بہ انداز پرستش اپنے ہاتھ میں ماظورہ کے ہاتھ لے کر غمگین آواز میں بولا "اے میری محبوب بیوی! بیشک زندگی اچھی ہے اور چونکہ تم ایک اور زندگی کا باعث ہوئی ہو اس لئے دیوتا تم سے خوش ہوں گے۔ اگر ابھی تمھاری عمر باقی ہے تو تم ضرور جیو گی لیکن اگر اُس کی مرضی ہے کہ تم زیادہ دن زندہ نہ رہو تو وہ تمھاری تکلیف کا خاتمہ کرکے تمھیں دائمی آرام دے دے گا۔ یہ لو، اپنے بچے کو آغوش میں لے لو اور مشیتِ الٰہی کا تماشا دیکھو"!

ماظورہ بہت دیر تک چُپ چاپ اس کی صورت تکتی رہی۔ اس کے منہ سے کوئی لفظ نہیں نکلا۔ بس جب اس کی دلی کیفیات انتہا کو پہنچیں تو اس نے دیوار کی طرف منہ پھیر لیا اور شام تک جان بحق ہوگئی۔

ناہتی پو کو اپنے بچے سے بڑی محبت تھی۔ وہ اس پر جان چھڑکتا تھا اور اس کی دم بھر کی جدائی بھی اسے کسی حالت میں گوارا نہ تھی۔ بچہ اس کی آغوش میں بڑی اللہ آمین سے پروان چڑھ رہا تھا۔ اور اس کی نت نئی شوخیوں سے گویا ہر روز ناہتی پو کی پژمردہ زندگی میں بہارِ تازہ آتی تھی۔ وہ اس کے لئے نئے نئے کھلونے

خرید کر لاتا اور جب وہ ان کو ہاتھوں میں اُٹھائے بھاگا بھاگا پھرتا تو زمین پر اس کے ننھے ننھے پاؤں کے خوبصورت نشانات دیکھ کر ناہتی پو کو بڑی خوشی ہوتی۔ ایک دن ایسا ہوا کہ اس کی پیٹھ مُڑی دیکھ کر بچّہ کھیلنے کے لیے دھوپ میں باہر نکل گیا لیکن اُسے لُو لگ گئی اور وہ بخار میں ہلبلاتا ہوا فوراً ہی گھر میں چلا آیا۔ "بابا میرے بدن میں سانپ گھُس گیا ہے جو مجھے جگہ جگہ ڈس رہا ہے۔ اے بابا! اسے جلدی نکالو ورنہ میں مر جاؤں گا۔"

ناہتی پو کا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ اس نے اس کی تکلیف کم کرنے کے لئے سارے جتن کر ڈالے مگر اُسے مطلق افاقہ نہ ہوا۔ اس کی علالت سے اس کے ہوش و حواس گُم تھے لیکن اس ذہنی خلفشار میں اُسے کسی قدر سکون و اطمینان بھی میسّر تھا کہ میں بڑا خوش نصیب ہوں کہ یہ مجھ سے دُعا مانگنے کے لئے نہیں کہتا، اگر یہ مجھ سے کہے تو میں انکار کی کیسے جراُت کر سکتا ہوں؟

سرِ شام بچّے کو موت کی نیند آگئی اور ناہتی پو دنیا میں یکہ و تنہا رہ گیا۔ اس کی آنکھوں میں دنیا اندھیر ہو گئی اور بارہا اس کے دل میں ایک ہوک سی اٹھی کہ وہ اس دنیائے ناپائیدار سے رُخصت ہو کر اپنے بچّے سے جا ملے مگر اس نے اپنی اس خواہش کی تکمیل کے لئے دُعا کبھی نہیں مانگی۔ آہستہ آہستہ اس کا غم دُور ہوتا گیا اور اس نے اپنا کام کاج سنبھال لیا، اور اگرچہ وہ موٹے سے موٹا رسّہ بٹا کرتا مگر پجاری کی توقع کے مطابق اس نے کبھی اپنے گلے میں پھندا نہیں لگایا۔ بس اس کا توکل پر بھروسہ تھا اور یوں ہی اس کی زندگی کے دن بسر ہوتے رہے۔

آخر کار وہ بوڑھا ہو گیا اور جوں جوں اس کی موت قریب آنے لگی لوگوں کا اشتیاق بڑھتا گیا کہ دیکھیں اسکا انجام کیسا دردناک ہوتا ہے، کیونکہ انھیں یقین دلایا گیا تھا کہ کسی دن دیوتا اُسے اس کی بے دینی اور دہریے پن پر سخت ترین سزا دیں گے۔ لیکن بہت دن گزرنے پر بھی جب اس کا بال تک بیکا نہ ہوا تو انھیں بڑی مایوسی ہوئی۔ وہ آپس میں کہنے لگے کہ اس کی ضعیفی تو عام لوگوں کی طرح ہے، بڑھاپے میں سب ہی ایسے ہو جاتے ہیں۔ اس کا چہرہ بیشک شکست ہو گیا ہے مگر آخری وقت میں سب کی رونق اُڑ جاتی ہے۔ اس کو جسمانی تکلیف بھی ایسی زیادہ نہیں، پھر دیوتا نے اس کا کیا بگاڑ لیا؟

تمام عمر دیوتا کے آگے سرِ عبودیت خم نہ کرنے سے اس میں قناعت اور صبر کی عادت پڑ گئی تھی۔ کوئی اس سے پوچھتا بھی کہ "ناہتی پو! آخر تم پوجا کیوں نہیں کرتے؟" تو وہ جواب دیتا "پوجا تو اپنی ضروریات اور آرزوؤں کو پورا کروانے کے لئے کی جاتی ہے نا' تو میرے پاس دیوتا کا دیا سب کچھ ہے اور مجھے کسی چیز کی آرزو نہیں، پھر میں پوجا کر کے دیوتا کی پریشانی میں مزید اضافہ کیوں کروں؟ کیا وہ مجھ سے زیادہ نہیں جانتے کہ میرے لئے بہتری کس میں ہے؟ میں روز دیکھتا ہوں کہ لوگ بیشمار چیزوں کے لئے پوجا کرتے ہیں لیکن ان کی آرزو پوری نہیں ہوتی تو میں یہ کیسے یقین کر لوں کہ دیوتا مجھے اُن لوگوں پر ترجیح دیں گے؟ اور یہ ظاہر ہے کہ انھیں دنیا میں ہر شخص کی دعائیں قبول کرنے پر قدرت نہیں۔"

لوگ اسے سمجھاتے "ناہتی پو! اب آخری وقت ہیں تو یہ کفر کے کلمے نہ بکو۔ نہ معلوم کب تمہارا وقت آ پہنچے"؟ اور ناہتی پو جوش میں کہتا "مرنے کے بعد تو

قصہ ہی ختم ہو جائے گا۔ اس لئے آخری وقت میں کیوں توبہ و استغفار اور پوجا پاٹ کی زحمت اٹھائی جائے ؟"

"اس لئے کہ ان حرکتوں سے دوزخ میں گھر بنتا ہے۔"

"اگر دوزخ کا وجود ہے اور میں وہاں گیا تو اس وقت بے شک میں پوجا کرنے لگوں گا، ابھی سے کیوں یہ درد سری مول لوں ؟" اور اس کی ایسی ملحدانہ باتیں سن کر لوگوں کا عقیدہ اور پکا ہو گیا کہ وہ یقیناً جہنمی ہے اور اس کا انجام بہت بُرا ہو گا۔

ناہتی پو کو رہ رہ کر یاد آتا تھا کہ اوائل عمر میں بارہا اس کی خواہش ہوئی کہ وہ پوجا کرے مگر اس کے لب متحرک ہوتے ہوتے رہ گئے۔ اور دل نے کہا "ٹھیرو! ابھی تمھاری باری نہیں آئی، جب تمھارا نمبر آئے گا تو چشمِ فردوس از خود تمھیں اشارہ کر دے گی !"

بالآخر وہ دن آ گیا جس کے لوگ منتظر تھے۔ ناہتی پو بسترِ مرگ پر پڑا ہوا تھا۔ لوگ اس کے اِردگرد جمع ہو گئے۔ پجاری بھی اس کی پائنتیوں آ کر بیٹھ گیا اور سب لوگ باآواز بلند کہنے لگے۔ " ناہتی پو تمھارا وقت آن پہنچا، اپنی ہٹ سے باز آؤ اور پوجا کرو !"

ناہتی پو نے آہستہ سے سوال کیا "کیوں ؟"

"تاکہ جب تم موت کی نیند سے جاگو تو تم دوزخ میں نہ ہو۔"

ناہتی پو نے شکستہ سانسوں میں جواب دیا " اگر دیوتا کی یہی مرضی ہے کہ میں دوزخ میں جاؤں تو یہ پوجا کس کام آسکے گی۔ بھلا دیوتا کی مرضی کو کون بدل سکتا ہے ؟"

اُسی لمحہ ناہتی پو کو پیغامِ اجل پہنچا اور وہ اُس دُنیا میں چلا گیا جہاں رُوحیں بستی ہیں۔

(۳)

اُس دُنیا کی سرحد میں داخل ہو کر وہ بھونچکا سا رہ گیا۔ اس کے چاروں طرف دھند لکا چھایا ہوا تھا اور اس نے محسوس کیا کہ جس مقام پر میں کھڑا ہوں اس سے نہ آگے بڑھنے کا کوئی راستہ ہے اور نہ پیچھے ہٹنے کا۔ وہ وہیں کھڑے کھڑے سوچنے لگا کہ میں اب کہاں جاؤں، کدھر بڑھوں ؟ —— کہ یکایک اس نے ایک شخص کو کہتے سُنا "کیا تم اس جزیرے میں مسافر ہو ؟"

ناہتی پو نے اسے بغور دیکھا مگر مستفسر کی صورت دھندلکے کی وجہ سے نظر نہ آسکی۔ قدرے توقف کے بعد اس نے جواب دیا " ہاں لیکن مجھے نہیں معلوم کہ میری منزلِ مقصود کہاں ہے ؟ تم مجھے کوئی راہ دکھا دو۔ میں بخوشی اس پر گامزن ہو جاؤں گا۔"

وہ شخص بولا " آؤ، میں تمھاری رہنمائی کے لئے ہی بھیجا گیا ہوں۔"

چنانچہ ناہتی پو اس کے ساتھ ہو لیا مگر تھوڑی دُور چل کر تھک گیا اور اس نے پکار کر کہا " اے رفیق! اگر تم سچ مچ میری رہنمائی کے لئے بھیجے گئے ہو تو ذرا آہستہ چلو۔ شاید تمھیں نہیں معلوم کہ میں بہت بوڑھا ہوں اور دنیا کی یاترا سے میرا جسم پہلے ہی تھک کر چُور ہو چکا ہے۔"

رہنما نے جواب دیا "ضعیفی اور کمزوری تو دُنیا میں ختم ہو جاتی ہے۔ اس جزیرے میں کوئی بوڑھا نہیں رہتا۔ لہذا تم جوں جوں آگے بڑھو گے تمھاری جوانی عود کرتی آئے گی۔ میں جب اس جزیرے میں پہلے پہل آیا تو میں تم سے بھی زیادہ معمر تھا۔"

ناہتی پو بولا "بے شک یہ مقام تمھارے لئے ساز گار ہے کیونکہ تم شتر مرغ کی طرح سبک رفتار ہو اور ——"

رہنما نے اس کی بات کاٹ دی "تم تفصیل سے اپنا تعارف کرادو تاکہ میں تمھیں تمھاری منزل تک پہنچا دوں"۔

ناہتی پو نے جواب دیا "میں کیرآہمام کا بیٹا ہوں جو رسیاں بٹا کرتا تھا، اور میرا نام ناہتی پو ہے"۔

یہ سنتے ہی رہنما کے قدم جہاں تھے وہیں گڑ گئے اور اس نے مڑکر اسے سرتاپا دیکھا "آہ! تو ناہتی پو ہے، جس نے اپنے باپ کو موت سے بچانے کے لئے دعا تک نہ مانگی۔ الوداع، ناہتی پو! اب تو اپنا راستہ خود تلاش کر! اور ضرورت ہو تو "چشم فردوس" سے دعا مانگ کہ وہ تیری رہنمائی کرے۔ میں تیری کوئی مدد نہیں کروں گا کیونکہ —— میں تیرا باپ ہوں!!"

ناہتی پو سناٹے میں رہ گیا اور جب اس نے اپنے باپ کی صورت پہچاننے کی کوشش کی تو وہ آناً فاناً نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے محسوس کیا کہ اس دفعہ کوئی نقاب پوش ہستی اس کے قریب کھڑی ہوئی پوچھ رہی ہے "کیا تم اس جزیرے میں مسافر ہو؟"

ناہتی پو نے جواب دیا "ہاں، لیکن میں یہاں کے راستے سے ناواقف ہوں"۔

"میرے ساتھ آؤ، میں تمھاری رہنمائی کے لئے بھیجی گئی ہوں"۔

چنانچہ وہ اس کے ساتھ ہو لیا مگر دم بدم بڑھتی ہوئی تاریکی کی وجہ سے وہ زیادہ دور نہ چل سکا۔ چنانچہ اس نے دبی زبان سے کہا "اگر آپ میری رہنما ہیں تو براہِ مہربانی باتیں کرتی چلئے تاکہ آپ کی آواز کے اندازے سے میں آپ کے ساتھ ساتھ چل سکوں، ورنہ ممکن ہے میں راستے سے بھٹک جاؤں"۔

رہنما نے جواب دیا "تم مجھے اپنا نام بتادو، میں وقتاً فوقتاً تمھیں پکارتی رہوں گی"۔

اس نے آہستگی سے کہا "میں ناہتی پو ہوں، میرے باپ کا نام کیرآہمام تھا"۔

معاً رہنما اس کی طرف مڑی اور اس نے اپنی نقاب اُلٹ دی۔ "آہ! تم ناہتی پو ہو جس نے اپنی بیوی کو سخت کرب سے بچانے کے لئے دعا نہیں مانگی؟ بیشک تمھاری راہ تاریک ہے لیکن افسوس میں تمھاری رہنمائی نہیں کر سکتی۔ الوداع! اب تم تنہا سفر کرو، ضرورت ہو تو "چشم فردوس" سے دعا مانگنا، وہی تمھاری رہبری کر سکتی ہے"۔

ناہتی پو نے رنج و حیرت کی ملی جلی کیفیت میں دیکھا کہ ناظورہ اس کے سامنے سرنگوں ہے اور جب تک اس کی گفتگو ختم ہوئی وہ اندھیرے کی نقاب میں گم ہو گئی اور ناہتی پو پھر یکہ و تنہا رہ گیا۔ تاریکی بھی اس قدر بڑھ گئی تھی کہ ہاتھ کو ہاتھ نہیں سُجھائی دیتا تھا۔ وہ جس قدر بھی دیکھنے کی کوشش کرتا اُسے ایسا محسوس ہوتا کہ کائنات کی ساری سیاہی اس لمحے اس کے سامنے سمٹ آئی ہے۔ یکایک کسی ننھے سے ہاتھ نے اس کا ہاتھ چھوا اور ایک بچے کی آواز آئی "اے مسافر تم اس اندھیرے جزیرے میں مت گھبراؤ۔ میں تمھاری رہنمائی کرنے آیا ہوں۔ لو میرا ہاتھ پکڑ لو تاکہ میں تمھیں صحیح وسالم منزلِ مقصود تک پہنچا دوں"۔

لیکن ناہتی پو نے اس بچے کا سر اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا اور محبت بھرے غمناک لہجے میں بولا "بیٹا! میں نے تیری معصوم اور پیاری آواز پہچان لی ہے۔ اور مجھے وہ وقت یاد آ رہا ہے جب تو نے اسی طرح میرے ہاتھوں میں دم توڑا تھا۔ میرے بچے! میں تیرا بدنصیب باپ ہوں جس نے تجھ سے انتہائی محبت کے باوجود تجھے موت کے چنگل سے بچانے کے لئے دعا نہیں مانگی۔ جاؤ تم چین سے جنت میں آرام کرو۔ تم مجھے اس جزیرے سے اور کونسی زیادہ تاریک جگہ لے جاؤ گے؟ اچھا، رخصت میرے جگر گوشے! مجھے اگر ضرورت ہوگی تو میں "چشم فردوس" سے مدد کی التجا کروں گا"۔

اور جوں ہی اس کے الفاظ ختم ہوئے، تاریکی کا پردہ چاک ہو گیا اور تمام گرد و نواح آنکھوں کو چکا چوند کرنے والی بقعۂ نور بن گئی .... اور یہ کیا؟ اس نے اپنے سامنے "چشم فردوس" کو دیکھا جس کا حسن و عظمت انسانی فکر و ذہانت کے احاطے سے باہر ہے، اور جب "چشم فردوس" اس کی طرف متوجہ ہوئی تو اس کی ہستی وحدتِ نور میں ایسی غرق ہوئی گویا وہ ایک قطرہ ہے جو قلزم وسیع میں گم ہو گیا ہو اور جب اسے نورِ الٰہی کی اس بے پناہ قوت کا احساس ہوا تو وہ سجدے میں گر گیا۔"

ندا آئی "تو کون ہے؟"

اس نے بصد ادب جواب دیا "میں کیرا ہمام کا بیٹا ناہتی پو ہوں جو رتیاں بٹا کرتا تھا"۔

غیب سے آواز آئی "ناہتی پو! تو نے میری حمد و ثنا میں کتنا وقت صرف کیا؟"

اس نے عاجزی سے کہا "اے مالک! میں نے تیری کبھی پوجا نہیں کی"۔ اس کے منہ سے یہ الفاظ نکلتے ہی "چشم فردوس" نے اُسے گھور کر دیکھا، اور ناہتی پو کی روح بلّور کے ٹکڑے کی مانند شفاف نظر آنے لگی۔ جس کا ذرہ ذرہ آئینے کی طرح عیاں ہوتا ہے۔

پھر ندا آئی "ناہتی پو! تو نے پوجا کیوں نہیں کی؟"

اس نے بصد عجز و نیاز جواب دیا "مالک! میں انتظار کرتا رہا کہ مجھے کسی چیز کی ضرورت ہو تو میں تیری پوجا کروں"۔

چشم فردوس اس پر جمی رہی "تو کیا تجھے تمام عمر کوئی ضرورت پیش نہیں آئی؟"

"اے مالک!" اس نے ایک نیک بندے کی طرح جواب دیا "میں چاہتا تو ہر دم کوئی نہ کوئی ضرورت پیدا کر لیتا مگر یہ سلسلہ شروع ہو جائے تو ختم کیسے ہو سکتا ہے؟ انسان کی ضروریات ہر وقت بڑھتی ہی رہتی ہیں"۔

"چشم فردوس" نے چند لمحات اسے دیکھا اور اس منبع سے جو مصفّا جوئے نور بہہ رہی تھی اس میں سُرخی سی پیدا ہو گئی "ناہتی پو اپنی نظریں نیچی کر اور جہنم کو بھڑکتا ہوا دیکھ!!"

ناہتی پو جس جگہ کھڑا ہوا تھا وہاں سے زمین شق ہو گئی اور اس کے اور "تختِ انصاف" کے درمیان ایک عمیق اور تاریک خلیج نمودار ہوئی اور جونہی اس نے اُسے جھانک کر دیکھا وہ کانپ کر رہ گیا۔ اس کی چیخ گلے میں پھنس گئی اور اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنے چہرے کو چھپا لیا۔

آواز آئی "جہنم کو دیکھا؟"

ناہتی پو نے سنبھل کر کہا "ہاں مالک! میں نے دوزخیوں کی حالت کو دیکھا اور ان کی آہ و بکا سنی لیکن

یہ جگہ میرے لئے نہیں ہے۔ کیونکہ ان لوگوں کی بے شمار خواہشات اور آرزوئیں ایسی تھیں جو تشنۂ تکمیل رہ گئیں اور اگر پوری بھی ہو جاتیں تو ان کے حق میں اچھا نہ ہوتا۔ اسی لئے یہ لوگ عذاب لامتناہی میں مبتلا ہیں۔"

پھر آواز آئی "اچھا ناہتی پو! بتاؤ یہ لوگ کر کیا رہے ہیں؟"

ناہتی پو نے صاف صاف کہہ دیا "میرے خیال میں یہ لوگ پوجا کر رہے ہیں!"

پھر اس سیلِ نور میں سے آواز آئی "اچھا اب نظر اوپر اٹھاؤ اور جنت کو دیکھو!"

اور جب اس نے نگاہ اوپر کی تو فرطِ حیرت سے اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا اور اس کی زبان گنگ ہو گئی۔

غیب سے آواز آئی "جنت میں تم نے کیا دیکھا؟"

ناہتی پو نے گہرا سانس لے کر جواب دیا "مجھے وہاں اپنے معبود کی مسرت لہلہاتی نظر آئی"

"اور ——؟"

"وہ مجھ پر ہنس رہا تھا"

"کیوں؟"

"اس لئے کہ میں نے کبھی اسکی پرستش نہیں کی"

پھر اس محبوبِ ازل کی شیریں آواز فضائے قدس میں گونجی "اے ناہتی پو! تیری تو ساری زندگی عبادت تھی۔ جا تجھے خلد بریں میں داخل ہونے کی اجازت دی جاتی ہے"

جنگ کے شعلے

چینی منصف کے محل کے باہر، بید مجنوں کا تنہا درخت ژالہ باری سے لرز رہا تھا۔ چاروں طرف برف گر رہی تھی اور برف کے گالے، بلور کے ٹکڑوں کی طرح ہواؤں میں تیر رہے تھے۔ آفتاب کے رخسار پر جو دریا کے اس پار اپنی آخری شعاعیں سطح آب پر ڈال رہا تھا، کہر کی ایک ہلکی سی نقاب پڑی ہوئی تھی۔ بت کدوں کی نقرئی، طاؤسی اور چمپئی چھتیں، کنشت چین کی قرمزی برجیاں اور خاص کر خدائے جنگ "لاؤیہ" کی سربفلک پرستش گاہ دالوں اور گالوں سے ڈھکی ہوئی تھی۔ نہ صرف ملکی منچوریوں، بلکہ پردیسی چینیوں، تاتاریوں، تبتیوں، منگولیوں اور کہیں کہیں روسیوں اور جاپانیوں کے بڑے بڑے سمور دار کوٹوں پر بھی برف کے ننھے ننھے ذرات چھوٹے چھوٹے ہیروں کی طرح چمک رہے تھے۔

باہر سخت سردی تھی اور خشک ہواؤں کے جھونکے جسم کے پار ہوئے جاتے تھے، لیکن محل گرم تھا اور کمرے دہکتے ہوئے آتش دانوں کی بدولت نہایت آرام دہ۔ مشرق اور مغرب کی لعنتوں یعنی افیم اور شراب کی بو سے فضا لبریز تھی۔ مغرب کا نمونہ پتلا دبلا، طاقت ور، نیلی آنکھوں اور خوبصورت بالوں والا، دراز قد امریکی تھا۔ اور مشرق کا نمونہ حلیم الطبع خلیق اور بھاری جسم والا یہ چینی منصف جس کی ٹانگیں سنگ مرمر کی رنگین و منقش کرسی پر پھیلی ہوئی تھیں۔

یہ دونوں ———— سی بری کلارک اور ضو کو ———— بڑے دیرینہ دوست تھے۔ ان دونوں کا رشتۂ اتحاد بڑا مضبوط تھا کیونکہ اس کی بنیاد ایک افسوس ناک عیب پر قائم تھی جسے وہ دونوں ایک دوسرے کے لئے قابل معافی سمجھ کر چشم پوشی کرتے تھے۔ یہ عیب امریکی میں شراب نوشی اور چینی میں افیم خوری تھا۔ وہ دونوں اکٹھے اپنی اس شرمناک عادت کو پورا کیا کرتے تھے۔

ان دونوں کی تقدیریں بھی ایک دوسرے سے مماثل تھیں یعنی ملازمت کی نہایت عمدہ ابتدا اور ترقیوں کے بے شمار مواقع کا یقین، لیکن انجام کار، ناکامیاں اور مایوسیاں! ———— یہاں منچوریا کے اس چھوٹے سے قصبے لیانگ کیاؤ میں، وسیع میدان کے پیچھے........

کچھ سال ہوئے سی بری کلارک اپنے وطن سان فرانسسکو میں ایک نوعمر ذہین قانون داں اور ہوشیار سیاس تھا اور اس کا مقصد حیات ایوان حکومت کا ممتاز رکن بننا تھا۔ اس نے حصول مقصد کے لئے بہتیرے ہاتھ پاؤں مارے اور وہ تمام فضول حرکتیں کیں جو اس زمانے میں آگے بڑھنے کے لئے ہر نوجوان کو کرنی پڑتی ہیں۔ لیکن بیچارہ ناکام رہا۔ مجمعوں میں تقریریں کرنے، لوگوں سے ملنے ملانے،

بڑے آدمیوں کی خوشامد کرنے اور کھلانے پلانے کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہ نکلا البتہ اسے اس سلسلے میں شراب نوشی کی لت پڑ گئی اور حد سے زیادہ پینے کی وجہ سے اس کی حالت بد سے بدتر ہوتی گئی۔

اس کا ایک سرپرست تھا جسے اس سے بےحد ہمدردی تھی۔ ایک روز اس سرپرست نے اپنے دوست سے مشورہ کیا۔

"میں سی بری کی کچھ مدد کرنی چاہتا ہوں۔ اُسے کہیں معقول ملازمت مل جائے تو بہت اچھا ہو۔"

"ملازمت؟ ملازمت کہاں رکھی ہے؟"

"تمہارا ایسٹرن کمپنی پر بہت اثر ہے، ہے نا؟"

"اچھا ——؟"

"سی بری کو چین، جاپان یا کہیں اور بھجوا دو۔"

"—— لیانگ کیاؤ میں ایک جگہ ہے —— لیکن سی بری ایماندار تو ہے نا؟"

"بے حد!"

"اچھا —— لیکن لیانگ کیاؤ ایک چھوٹا سا قصبہ ہے اور وہاں یورپین خال خال ہیں۔ وہ گھبرا تو نہیں جائے گا؟"

"ارے نہیں۔ لیانگ کیاؤ اس کے لئے بہت مناسب جگہ ہے۔ شاید وہ وہاں سنبھل بھی جائے تم تو جانتے ہو کہ وہ کسی زمانے میں نہایت جفاکش تھا، اور اپنے مستقبل کو نہایت شاندار بنانا چاہتا تھا مگر ...."

"خیر۔ مایوسیوں اور ناکامیوں سے تو ہر شخص کو دوچار ہونا پڑتا ہے۔"

"بےچارہ بڑا عافیت پسند ہے۔ باوجود نہایت جوشیلے ہونے کے وہ دنیا میں صلح و آشتی کا قائل ہے۔ جنگ اور خون بہانے سے اُسے دلی نفرت ہے۔"

"تو یوں کہو کہ وہ رقیق القلب ہے"۔

"ہاں، لیکن صلح و امن کے لئے وہ لڑنے اور مارنے مرنے سے بھی دریغ کرنے والا نہیں۔"

"بس تو منچوریا اس کے لئے بہترین مقام ہے، کیونکہ تم میری بات یاد رکھو، دیر یا سویر، جاپانیوں اور چینیوں میں لڑائی ضرور ہوگی۔ تم اس سے کہہ دو کہ وہ ملازم ہو گیا ہے۔"

بس اس طرح سی بری کلارک نے باب طلائی، بازار اشک، اور جزیرۂ حیوان کو الوداع کہا اور کئی ہفتوں کے سفر کے بعد لیانگ کیاؤ پر پہلے پہل نظر ڈالی —— آس پاس کے مناظر غیر معمولی طور پر دلکش تھے۔ تمام منچوریا پر بارشِ حسن ہو رہی تھی اور وسیع و عمیق دریا رلونی نہایت شان سے اٹھلاتا ہوا بہہ رہا تھا۔ آسمان کی نیلی چھتری تا حدِ نظر سایۂ شہپر کی طرح پھیلی ہوئی تھی۔ دُور، شنگرفی، گیرواں، اور سبزی مائل پہاڑیاں، قوس قزح کے رنگوں کے ساتھ مل کر ایک نغمۂ شفق پیدا کر رہی تھیں، لیکن قصبہ بذاتِ خود نہایت کثیف اور گنجان تھا جہاں ایک درجن کے قریب مختلف لڑاکو اور کینہ پرور قومیں آباد تھیں۔ دیواروں پر جگہ جگہ مردار خور جانور قطار بنائے بیٹھے تھے اور بیسیوں قسم کی بدبوئیں فضا میں تیر رہی تھیں۔ اور خاک! موجوں کی طرح اُڑتی ہوئی، کہ تنفس میں بھی دقت ہو اور انسان شدت کی پیاس محسوس کرے ...... ایک بات یہاں بڑی اچھی تھی۔ یعنی پیاس بجھانے کے لئے بےشمار جگہیں اور طرح طرح کی شرابیں

---- اسکوچ وِسکی، جاپانی، روسی اور خود یہاں کی بنی ہوئی چاول کی برانڈی اور خاصی سستی اچنانچہ اپنی آمد کے اگلے ہی روز شام کو کلارک ایک میخانے سے دوسرے میخانے میں پیتا پھرا۔ یہاں تک کہ نشے میں چُور ہو کر اول فول بکنے لگا اور اسی بدمستی میں ایک تاتاری سے لڑائی بھی ہو گئی۔ تاتاری نے اسے ملنے کے لئے اپنا چمکدار خنجر نکالا ---- لیکن اسی دم ایک شخص اسے بچانے آگیا۔ یہ ایک چینی تھا جو باوجود نہایت بھاری بدن ہونے کے میزیں اور کرسیاں ہٹاتا ہوا اس کی طرف تیز رفتاری سے آیا اور تاتاری کو دھکا دے کر غضب ناک لہجے میں اس سے بولا " نگویونی یات، چن لنگان پوطان!"

کیسے عجیب و غریب الفاظ! کون انھیں سمجھے؟ معاً تاتاری کھڑا ہو گیا اور تین بار نہایت لجاجت سے اس کے سامنے دو زانو ہوا۔ پھر اس چینی نے صاف انگریزی میں متحیر امریکی سے گفتگو کی " مجھے اجازت دیجئے کہ میں آپ سے اپنا تعارف کرادوں۔ میں ضوپو ہوں ---- یہاں کا جین یعنی منصف۔"

سی بری نے اس کا شکریہ ادا کیا اور معذرت کے طور پر کہا " قصور میرا ہی ہے۔ میں نے حد سے زیادہ پی لی تھی۔"

" نہیں۔ عیوب بھی محاسن کی طرح فطری ہیں۔ کنفیوشس کا قول ہے۔" راہِ عظیم فاضل ترین ہے، لیکن لوگ اسے چھوڑ کر پگڈنڈیوں پر چلتے ہیں۔" کیونکہ اصل راہ سے ہٹ کر چلنے میں بڑا مزہ آتا ہے۔ آہ!" اس نے ٹھنڈا سانس بھر کر کہا: " میں بھی ایک پگڈنڈی پر چلتا ہوں، مجھ میں بھی ایک عیب ہے۔"

اس طرح ان دونوں کی ملاقات ہوئی۔ رات کا کھانا انھوں نے ساتھ کھایا اور دونوں ایک دوسرے کے رازوں اور کمزوریوں سے واقف ہو کر پکے دوست بن گئے۔ پھر رات گئے تک وہ اپنی تقدیروں کی کجروی کا مذاق اُڑاتے رہے۔

ضوپو بھی کلارک کی طرح اپنے حصولِ مقصد میں ناکامیاب رہا۔ وہ ایک ممتاز چینی خاندان کا فرد تھا، اس لئے اُسے تعلیم کے لئے پیکنگ بھیجدیا گیا۔ چنانچہ اس نے وہاں ---- " شہرِ ممنوع" کے ایوانِ رفیع الشان اور گہوارۂ علم میں ---- پڑھا اور وہ ڈگری حاصل کی جسے حُسن پسند چینیوں کی زبان میں "گُلِ لیاقت کی سند" کہا جاتا ہے۔ پھر دو سال بعد ہزارہا طلبا میں اوّل رہ کر اس نے "چن شیح" (مقنّنِ فاضل) کی ڈگری لی اور وطن کینٹن واپس ہوا۔ اپنے معزز والدین کے گھر میں داخل ہوتے وقت وہ اکادمی کا فوق البھڑک لباس پہنے ہوئے تھا، یعنی ریشم کی چوکور جوتیاں، گول ٹوپی پر گل بوٹے کی سنہری لیس، اور سینے و پشت پر بینگنی اور پیازی ساٹن کے فیتوں سے لکھے ہوئے چوؤلی اور طاچنگ لولی کے مقولے۔ کچھ عرصے بعد وہ امریکہ چلا گیا جہاں اس نے عالم گیر جنگ کے زمانے میں کئی چینی سفیروں کے ساتھ جان توڑ کام کیا۔ چونکہ وہ صبح سے لے کر آدھی آدھی رات تک کام کرتا تھا، اس لئے سُستی اور نیند کے غلبے سے محفوظ رہنے کے لئے اس نے افیم کھانی شروع کر دی۔ اور آخر کار اپنی آبائی عادت کا جو اسے وراثتاً ملی تھی شکار ہو گیا ---- بہرحال سی بری

کلارک کی طرح اس نے چین کی بے حد خدمت کی تھی اور وہ اُن لوگوں میں سے تھا جنھوں نے مادرِ وطن کو دوبارہ زندگی بخشی۔ لیکن انجام کار، اُس سے زیادہ بااختیار لوگوں نے اس کے ساتھ وہی سلوک کیا جو سی بری کے ساتھ ہوا تھا۔

کسی نے کہا بھی "ضوپو نے ہمارے ملک کی خاطر اپنی جان تک کی پروانہ کی۔ ہمیں اس کے معاوضے میں اسے کسی بڑے عہدے پر فائز کرنا چاہیئے۔"

جواب ملا "نہیں جی۔ مستعمل لکڑی کس کام کی؟"

"پھر بھی! اس لکڑی کو کہیں ٹھکانے لگا دو۔"

"میں بتاؤں؟" ایک جوان چینی افسر نے تمسخر سے کہا "اسے لیانگ کیاؤ بھیجدو ——— جہاں صرف گندگی اور بدبوئیں ہیں! ——— کوئی اور معقول افسر وہاں جانا پسند نہیں کرے گا۔"

بس اس طرح ضوپو کو لیانگ کیاؤ بھیجدیا گیا، وہی گندہ چھوٹا سا قصبہ، جہاں وسیع میدان کے کے پیچھے سی بری کلارک آیا، اور جو کچھ عرصے بعد نہایت اہم مقام اور شاید بین الاقوامی جنگ کا مرکز بننے والا تھا......

:- (۲) :-

ہر شام ضوپو کے مکان پر دونوں دوست جمع ہوتے اور اس دلفریب کمرے میں رات رات بھر گزار دیتے جہاں ساگوان کا فرنیچر، واٹگوں کونوں میں دھندلا پڑ جاتا تھا اور جس کی دیواروں پر زرد ساٹن منڈھی ہوئی تھی۔ اس کمرے میں چاروں طرف عمودی رسم الخط میں حکیمانہ مقولے کڑھے ہوئے تھے اور فرش پر اژدھوں کی نارنجی گلابی اور بادامی کھالیں بچھی ہوئی تھیں۔

سرما کی ایک خنک رات تھی۔ اور وہ دونوں اپنے اپنے شغل میں مصروف تھے۔ امریکی جام پر جام چڑھا رہا تھا اور چینی بار بار اپنا ہاتھ قریب کی الماری کی طرف بڑھاتا تھا جہاں شقیقہ اور بینگ کے بکسوں میں تشی اور رہون ہوک (مختلف قسم کی افیمیں) اور ایک چھوٹا سا چراغ جس میں سے زمرد جیسا شعلہ نکلتا تھا اور جس پر سبز تیلیاں منڈلاتی تھیں، رکھا ہوا تھا۔ وہ پھرتیلی انگلیوں سے کوکنار کی گولی بناکر اپنے پائپ کی ننھی سی پیالی میں ڈالتا اور پھر اسے چراغ کی لو پر گرم کرکے دیکھتا رہتا کہ افیم کی انٹی کہربائی اور طلائی رنگ بدل رہی ہے۔ افیم گرم ہوکر پگھل جاتی اور اس میں سے بخارات اٹھنے لگتے۔ بار بار کش لینے سے افیم کے خوشبودار دھوئیں کے بادل سارے کمرے میں پھیل جاتے اور ضوپو چمڑے کے چوکور تکیوں کا سہارا لئے پائپ پر پائپ پئے جاتا ——— بیرونی دنیا اسے اپنے سے دور، بہت دور، ہٹی ہوئی معلوم ہوتی۔

بند دریچوں میں سے آنے والی آوازیں اسے بہت مدھم سنائی دے رہی تھیں۔ برف کے گرنے کی دھب دھب اور تند و سرد ہواؤں کا شور، بس خواب سا معلوم ہوتا تھا۔ باہر لوگ اپنے اپنے کاموں پر جاتے ہوئے محبت و نفرت یا زندگی اور موت جیسے غیر ضروری موضوعات پر باتیں کر رہے تھے اور جو راہ گیر جاپانی جاسوس، یا غدارانِ وطن تھے تو وہ بظاہر منچوری ریلوں کا تذکرہ کرتے نگران کی مُراد بڑی بڑی سلطنتوں کے زوال اور کسی ہولناک جنگ سے ہوتی ——— لیکن ان لوگوں اور ان کی باتوں

پر بھی ضوپو کے لئے ایک خوابناک حقیقت چھائی ہوئی تھی - جنگ! ریلیں! غدار! جاپان!

...... ضوپو کو کوئی بات یاد آنے لگی ——

اس کے کانوں میں بھنک سی پڑ چکی تھی۔ اسے یاد آیا کہ نانکنگ سے حکومت نے کچھ ضروری کاغذات بھیجے ہیں۔ چند گھنٹے ہوئے ایک خفیہ قاصد ان اشد ضروری کاغذات کو لایا تھا لیکن کلارک کے کہنے سے اُس نے اُنھیں بغیر اچھی طرح پڑھے احتیاط سے رکھدیا۔ مگر قاصد بھی تو اس وقت آیا جب امریکی کئی جام اور ضوپو تین بار پائپ پی کر نشے میں چور ہو چکے تھے۔ اسی لئے انھوں نے ان کی کوئی پروا نہ کی، سوچا کہ صبح پڑھ لیں گے۔ پھر بھی اسے ایک خط میں کوئی ضروری بات یاد آنے لگی —— ایک جاپانی دستے کے متعلق، جو کہ دان سے طوفان کی طرح برق رفتاری سے جانبِ شمال دریار نونی کی طرف بڑھا آرہا ہے —— اور یہ کہ مغربی سرحد کے اس پار منگولیا کا حکمراں "چیپ سن دھمپا ہو تختو" (یعنی مقدس راہب) جاپان کا ہمدرد ہے، اس لئے وہ اپنی فوجیں منچوریا بھیج رہا ہے —— اور دونوں لشکر متحدہ حملہ کرنے کی غرض سے ایک دوسرے سے مل جانا چاہتے ہیں —— اور ان دونوں کو آپس میں ملنے سے روکنے کے لئے چینی وطن پرستوں کی ایک فوج مارشل چانگ سوہ لیانگ کی کمان میں، ہی لونگ کیانگ میں سے گزری ہے —— اور —— ہاں، کچھ مقامی چینی حکام کے متعلق بھی تو لکھا ہے جنھیں رشوت دی گئی ہے۔

اور —— کچھ اور بھی!

وہ کیا؟......

کوئی بہت ہی اہم معاملہ!

کاغذات میں یہی لکھا ہے۔ "بہت ہی اہم اور اشد ضروری!" —— اور اس کا تعلق —— ذرا سوچنے دو —— ریل کے پل سے ہے، ریل کا پل!.....

لیکن معاملہ کیا ہے؟

اس نے سوچا اور یاد نہ آنے پر جھنجھلا اُٹھا۔

آخر اس نے یاد کرنے کی کوشش بالکل چھوڑ دی۔

یاد نہیں آتا تو نہ آئے —— کوئی پروا نہیں! کسی چیز کی پروا نہیں، سوائے افیم کی انٹی کے —— اور اس نے پھر پینا شروع کر دیا۔

اس کے مطمئن زرد چہرے پر مسکراہٹ آگئی! اس نے افیم کے دھوئیں کو جس کے گھیرے دار بادل سامنے ناچ رہے تھے۔ غور سے دیکھا۔ وہ رنگ برنگی معلوم ہوتے تھے، بادامی، طاؤسی، نارنجی، ارغوانی اور حیرت زا سبز —— اس کے گزشتہ خوابوں کے رنگوں کی طرح —— وہ خواب جن میں اس نے اپنے تئیں اعزازات و تفاخر سے سجا ہوا دیکھا —— پھر یہ بادل دیکھتے ہی دیکھتے رنگ بدلنے لگے —— اس کے مستقبل کے خوابوں کی طرح —— خوش کن، نازک، حسین.....

اس نے سی بری کلارک کی طرف گردن پھیری —— وہ بھی خواب دیکھ رہا تھا۔ نشیلے، دلچسپ خواب! ضوپو نے اندازہ کر لیا کہ امریکی بھی مسرور ہے۔ شکر ہے گوتم بدھ کا! وہ دونوں خوش تھے۔

اور کیوں نہ ہوں؟ کیا کنفیوشس نے نہیں کہا

کہ فرزانوں کا واحد مقصدِ حیات مسرت ہوتا ہے۔۔۔؟
مسرت! ہاں اس کے لئے مسرت افیم میں ۔۔۔۔۔

وہ ستائیس بار دم لگا چکا تھا۔ اب اس نے الماری میں سے ایک اور پائپ نکالا جو چند سال ہوئے اس کے ایک دوست نے اسے جشنِ ماہتاب کے روز، خدائے اتش کی سرخروئی کی خوشی میں تحفتہً دیا تھا۔ یہ گلابی بلور کا بنا ہوا تھا اور اس پر سات سیاہ رنگ کے لمبے لمبے پھندنے بندھے ہوئے تھے۔ منہال پر نیلم و پکھراج کی پچیکاری تھی اور دستے پر آسمانی دیوتاؤں کے اوصاف کندہ تھے —— لاؤزی سے لے کر روحِ عظیم تک، موتی شاہ سے لے کر مولدِ قدیم تک، مادرِ مغرب سے لے کرتائی شان (کوہِ مشرق) کے دیوتا تک جو چین کی سرحدوں کو غیر ملکی وحشیوں کے حملے سے محفوظ رکھتا ہے

۔۔۔۔۔۔۔۔ غیر ملکی وحشی! یہ الفاظ ضوتو کے ذہن میں گونج اٹھے، فوراً اسے کوئی بات یاد آئی، کسی خطرے کا خیال آیا۔۔۔۔۔۔

ٹھیک تو ہے —— غیر ملکی وحشی — دشمن! وہ لوگ جنوب اور مغرب، نکدان اور منگولیا سے بھاگے آرہے ہیں اور دریا، توتی کے پاس تھال کی کوشش کر رہے ہیں —— اور مارشل چانگ شوہ لیانگ کے سپاہی اس اتحاد کو روکنے کے لئے روانہ ہو چکے ہیں اور وہ پل؟ کوئی اشد ضروری بات اس سے متعلق تھی ۔۔۔۔۔۔ لیکن کیا؟ اس نے یاد کرنے کی جدوجہد کی مگر بیکار ۔۔۔۔۔۔ آخر اس نے سوچا کہ اپنے دوست سے معلوم کرے۔

"سی بری!" اس نے جھنجھوڑا "سی بری" "اس وقت مجھ سے نہ بول، او چینی کافر!" اس نے نشے میں کہا "کتنا اچھا خواب ہے! ایوانِ خاص! لوگ خوشی سے پھولے نہیں سماتے چیخ چیخ کر کہہ رہے ہیں، پریذیڈنٹ کلارک! ۔۔۔۔۔۔۔۔ پریذیڈنٹ سی بری کلارک! ۔۔۔۔۔۔۔۔" اور مدہوش ہو گیا۔
ضوتو مسکرانے لگا۔

آخر کار اس نے فیصلہ کر لیا۔ پل ایسی کی تیسی میں پڑے اور چین چولھے میں جائے، دونوں اپنی حفاظت خود کریں گے۔ اس وقت کسی چیز کا فکر نہیں ہونا چاہئے —— سوائے لطف و سرور کے۔ چنانچہ اس نے افیم پینی شروع کی اور جلدی جلدی تین پائپ خالی کر دئے۔

سارے کمرے میں معطر کہر پھیل گئی اور ادھر اُدھر آراستہ کی ہوئی چیزیں دھندلی پڑنے لگیں۔ اژدھوں کی کھالیں اور دیواروں کے زرد ریشمی پردے نظروں سے اوجھل ہونے لگے۔ اس نے محسوس کیا کہ اس کی ہڈیوں، پسلیوں اور پٹھوں میں تقلیب ہیئت ہو رہی ہے۔ غیر مرئی اشیاء صاف نظر آنے لگیں۔ اس کی روح بیرونی سطح پر نمودار ہوئی اور مافی الضمیر گزشتہ آرزوؤں اور تجربوں کی طرف رجوع کرنے لگا۔ ناکامیاں اور مایوسیاں ۔۔۔۔۔۔۔؟ نہیں، نہیں، ان کا اب کوئی وجود نہیں۔ بلکہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایسا کبھی ہوا ہی نہیں۔ بس ایک دو کش اور لگانے کے بعد، ضوتو میں بھی الوہیت آجائے گی۔ اس کے لبوں پر تبسم کھیلنے لگا اور افیم کا سرور ایک دلکش نغمے کی مانند اس کی کائناتِ حیات پر چھا گیا۔ اب

اس کے کان کسی قسم کی آوازوں سے آشنا نہیں تھے۔ باہر کا طوفان اور سڑکوں کا شور و غل بجھی ہوئی قندیلوں کی طرح گُل ہو گیا تھا۔ اس نے پھر کش لگائے اور خوابوں میں محو ہو گیا۔ اس وقت کا سماں اس کے سامنے آیا جب وہ پیکن میں "تعلیم کے رفیع الشان محل" میں "چین شِغ" یعنی قانون کا ڈاکٹر بنایا گیا تھا۔ اس نے دیکھا ـــــــ جیسا کہ وہ ہر رات خواب دیکھتا تھا ـــــــ کہ وہ حجلۂ ساعت کی دہلیز پر کھڑا ہے۔

پھر وہ سات بار سرنگوں ہوا اور اس نے سامنے کی دیوار پر قرمزی ریشم کی چار شعاعی جھنڈیاں دیکھیں جن میں سے تین پر کونگ یون چانگ کے مقولے سلمے ستارے سے کڑھے ہوئے تھے۔ پہلا مقولہ تھا "مسرت نیکی ہے"۔ دوسرے کے الفاظ تھے۔ "میں نیک رہ کر مسرت حاصل کرنی چاہتا ہوں"۔ تیسرے کا مطلب تھا "لو دیکھو ــــــ میں نے مسرت حاصل کر لی ہے"۔

چوتھی جھنڈی خالی تھی۔ لیکن ضوتو جانتا تھا کہ ایک نہ ایک دن مالک مکان اس پر بھی کچھ نہ کچھ ضرور لکھے گا۔ جب مالک مکان داخل ہوا تو وہ سوچنے لگا، دیکھیے اس پر کیا لکھا جاتا ہے۔ وہ ایک طویل قامت شخص تھا، لیکن ضوتو نے اس کی صورت افیم کے بادلوں کی وجہ سے صاف طور پر کبھی نہیں دیکھی تھی۔ اس کے ہاتھ سینے پر جُڑے رہے اور وہ بھی نہایت نرمی سے اس کے سامنے کئی بار سرنگوں ہوا، اور جیسا کہ وہ ہر شب کہا کرتا تھا اس نے سرگوشی کے لہجے میں کہا "ازراہِ کرم پہلے آپ اندر تشریف لے چلیے"۔

چینیوں کی روایتی شائستگی کے مطابق، وہ اس سے زیادہ جھکا اور بولا "میں کیسے پہلے داخل ہونے کی جرأت کر سکتا ہوں، اے عاقل و مکرم بھائی!" اور جب بار بار وہ اپنی انکساری کا اظہار کر چکے تو دونوں اندر گئے اور ضوتو کو اس کے میزبان نے تعظیماً اپنے پاس بائیں جانب بٹھایا۔ پھر ایک نرم رو ملازم نے آ کر ان کو گرم شراب سے لبریز دو زرّیں و شفاف جام پیش کئے۔ جو صرف بڑے بڑے امرا اور علما و فضلا استعمال کرتے ہیں ـــــــ اور ضوتو نے فخر سے تصور کیا کہ وہ بھی عالم و فاضل ہے۔ اور کیا واقعی اس نے تمام امتحانات اعزاز سے پاس نہیں کئے تھے؟ اور کیا اس کی ماں کو ایسا لائق فرزند پیدا کرنے پر لوگوں نے بھرے مجمع میں مبارکباد نہیں دی تھی؟

وہ بیٹھا شراب کی چسکیاں لیتا رہا اور چوتھی جھنڈی کو دیکھتے ہوئے اس نے، ہر رات کی طرح پوچھا، "آپ چوتھی جھنڈی پر کب لکھیں گے۔ اے دانا و معظم بھائی؟"

بالعموم جواب ہوتا "شاید کبھی نہیں"۔ لیکن آج مالکِ مکان اس سوال پر کھڑا ہو گیا اور کہا، "ابھی!"

وہ دیواروں کے پاس پہنچا اور قرمزی ریشم پر یہ الفاظ لکھے۔ "تین چیزیں مسرت سے کہیں زیادہ باعثِ نیکی ہیں ــــــ وفاداری، ایثار اور جرأت"

سکوت!

یک لخت مالکِ مکان ضوتو کی طرف مڑا اور ــــــ جونہی یکایک افیم کی کہر ہٹ گئی تو اس نے

اپنے میزبان کا چہرہ صاف طور پر دیکھا ....
پُر رعب! خمدار ناک، چوڑی پیشانی، سفید براق لمبی داڑھی! اس نے پہچان لیا اور فوراً دو زانو ہوگیا۔

"کنفیوشس ....!"

کنفیوشس نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر دہرایا۔ "وفاداری، قربانی، بہادری ......"

یہ الفاظ اس کے منہ سے بجلی کی کڑک کی طرح نکلے، ایسی کڑک کی طرح جس نے اس کے دماغ کے ریشے ریشے کو تھرّا دیا اور اُسے اس کے خوابوں سے چونکا دیا۔ خواب ختم ہوگیا لیکن کڑک اس کے کانوں میں گونجتی رہی، بلکہ دم بدم تیز ہوتی گئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی دیو ڈھول پیٹ رہا ہے۔ اور جونہی ضو کو نے بھاگ کر جلدی سے دریچہ کھولا کہیں دور ایک بہت تیز روشنی بلندی پر نمودار ہوئی اور اس کے بجھنے سے پہلے بیشمار زرد شعلوں کی لپک آسمان پر پھیل گئی۔

ضو کو سمجھ گیا کہ یہ کیا ہے۔ جنگِ عظیم کے زمانے میں اُسے یورپ میں اس سے واسطہ پڑا تھا —— یہ دور، بیسیوں میل دور توپ کی گرج اور چمک تھی ....

وہ سی بری کو ہوشیار کرنے کے لئے مڑا، مگر وہ پہلے ہی بیدار ہوگیا تھا، سُرخ آنکھیں، سنجیدہ صورت! —— وہ بھی جان گیا تھا۔

"توپ ...... ؟"

"مغربی سمت میں ہے۔" ضو کو نے اشارے سے بتایا۔

"شاید منگولی ہیں ......"

"ہاں، جاپانیوں سے ملنے کے لئے دوڑے چلے آرہے ہیں —— وہ خط یاد ہے؟"

"ہاں!"

"جنگ!"

"جنگ!" سی بری نے استعجاب میں دہرایا اور اُن لوگوں کو کوسنے لگا جو دُنیا کے امن کو تہ و بالا کر دیتے ہیں۔ وہ جنگ کے نام سے کانوں پر ہاتھ دھرتا تھا۔ اُس نے سوچا کہ جیسے عالمگیر جنگ کا سبب صرف آسٹریا اور سربیا کی مقامی لڑائی تھا اسی طرح اب کے ہوگا چین اور جاپان کا تنازعہ آپس کی بات ہے اور شاید کچھ عرصے کے بعد دونوں میں صلح ہو جائے لیکن اگر منگولیوں نے اس میں حصہ لیا تو روس بھی آدھمکے گا کہ چین کے حصّے بخرے میں زرخیز علاقے خود ہتھیا لے اور جب روس میدان میں آیا تو فرانس، انگلستان، اٹلی اور جرمنی کیوں خاموش بیٹھنے لگے؟ ممالکِ چین کی تقسیم میں اپنا اپنا حصّہ برابر کا ٹھہرانے کے لئے وہ بھی کسی نہ کسی طرف سے ضرور شرکت کریں گے۔ ان کے بعد بلجیم اور پرتگال اور پھر پولینڈ بھی جنگ میں کود پڑیں گے —— کہ بڑے کتوں کو لڑتا دیکھ کر چھوٹے کتے صرف بھونکنے ہی میں اپنی بہادری سمجھتے اور ذرا خوش ہو لیتے ہیں۔

"ہم کو ایک ہڈی چاہیئے! ہم کو ایک ہڈی چاہیئے!"

"آؤ چلو لڑیں!"

"خدا ہمارے بادشاہ کو سلامت رکھے!"

"ایلونس۔ انفانٹس، دے لا پاٹری!"

"ہُرے! ہُرے! ہُرے!"
ہر شخص آمادہ بر جنگ ہوگا۔ ہر متنفس لڑنے کے لئے بیچین ہوگا اور آخر کار امریکہ بھی مداخلت کریگا۔ غرض ہر چہار طرف جنگ کے شعلے بھڑکیں گے۔ مشرق، شمال، جنوب، مغرب یعنی ہر سمت آگ اور خون سے ہولی کھیلی جائے گی۔ گورے، کالے، زرد، لال اور بھورے انسانوں میں خونریزی ہوگی۔ بحری علاقوں اور برّی خطّوں میں لہو کے پرنالے بہ نکلیں گے۔ فضا آتش ناک ہوگی۔ فلانڈرز کے لہلہاتے کھیتوں سے لے کر وسط افریقہ کے گھن وار جنگلوں تک لڑائیوں کی چنگاریاں بکھر جائیں گی۔ گویا ایک عالمگیر جنگ ہوگی ـــــ محض اس لئے کہ چند سو منگولی سوار جاپانیوں سے ملنے کے لئے چلے آرہے ہیں!!

سی بری کلارک نے تمنّا کی "کاش مارشل چانگ شوہ لیانگ جلدی سے پہنچ جائے، اور جاپانیوں کے آنے سے پہلے منگولیوں کو کاٹ کر سرحد سے پرے بھگا دے۔ کاش! یہ مقامی کشمکش صرف چین اور جاپان میں رہے کہ اس طرح دنیا خون کی ندیوں سے محفوظ رہے گی۔ لیکن یہ کیسے ممکن ہے.......؟"

توپ کی گرج اور چمک قریب تر ہوتی جارہی تھی، اور بم پے در پے پھٹ رہے تھے۔ آسمان کے مشرقی گوشے میں جہاں نورِ فجر ظاہر ہونے والا تھا۔ دھوئیں کا ایک تاریک بادل منڈلانے لگا۔

صبح ہوئی۔ لوگ باگ بستروں سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ گھبرا کر گھروں سے باہر نکلے اور پُرجوش سوال و جواب ہونے لگے۔ جاپانی اور بالشویکی ایجنٹوں نے اپنا کام شروع کر دیا۔ اوّل الذکر اپنی وسیع سلطنت کا پروپیگنڈا کرتے ہوئے کہنے لگے کہ جاپانی حکومت منچوریا میں امن و اطمنان کی بارش کردے گی اور ثانی الذکر یقین دلانے لگے کہ انقلاب احمر غریب و امیر میں مساوات قائم کردے گا۔

توپوں کی گرج قریب تر ہورہی تھی اور سی بری دل میں کہہ رہا تھا "کیا کیا جائے؟ اے خدا کیا کیا جائے.......؟"

اس نے ضو پو اور ضو پو نے اسے دیکھا اور معاً دونوں کے دلوں میں ایک ہی خیال آیا۔ "وہ کاغذات ـــــ" امریکی نے لڑکھڑا کر کہا۔ "نانکنگ سے جو آئے ہیں........"

"اور وہ پل......؟"

"ہاں ـــــ ہاں۔"

وہ دونوں دوڑے دوڑے الماری کے پاس گئے اور چاول کے کاغذوں کا بنڈل کھول کر ایک خط بڑے غور سے پڑھنے لگے جو محکمۂ افواج کے افسرِ اعلیٰ میجر چو یو نے بھیجا تھا۔ میجر نے انجنیری کی تعلیم امریکہ میں پائی تھی اور جنگ کی چالاکیوں سے خوب واقف تھے۔ اس خط میں نونی کے پل کا تذکرہ تھا جو لیانگ کیاؤ سے تھوڑے فاصلے پر تھا، اور منگولیوں کو جاپانیوں سے ملنے کے لئے اس پل پر سے گزرنا تھا۔ چینی فوجیں دوسری سمت میں تھیں لیکن پچاس میل کے فاصلے پر، اس لئے منگولیوں سے ان کی مڈبھیڑ ہونی قریباً ناممکن تھی۔ اس خطرے کو میجر چو یو نے پہلے ہی محسوس کر لیا تھا اور اسی سے

محفوظ رہنے کے لئے انھوں نے تدبیر کی تھی۔ خط میں آگے چل کر ناکور تھا کہ پُل سے متصل ایک سنگین اسلحہ خانہ ہے جس میں وہ سامانِ حرب جمع ہے جو جنگِ عظیم کے بعد بہت سستا مل گیا تھا۔ یہاں مختلف آلاتِ حرب کے علاوہ ایک اور خاص چیز ہے جو سیجر چویو کی ایجاد ہے۔ یہ ایک ننھا سا بکس ہے جسے وقتِ ضرورت ایک اکیلا آدمی استعمال کر سکتا ہے، لیکن وہ شخص بہادر اور جری ہونا چاہئے، کیونکہ ایک ذراسی جنبش سے بکس پھٹ پڑے گا اور تمام اسلحہ خانے، پُل اور ——— خود اس شخص کا خاتمہ ہو جائے گا ——— یہ کام کوئی محبِ وطن ہی انجام دے سکتا تھا۔

"یہ کام ———" ضوپو نے ہولے ہولے کہا۔ "اپنے انجام دینے والے کو اس کی زندگی کے تمام عیوب و نقائص سے پاک کردے گا اور بعدِ موت اس میں الوہیت سما جائے گی۔ تاکہ وہ دیوتاؤں کے جلو میں سیاحی کر سکے۔"

"ہاں۔ یہ کام صرف کوئی شریف النفس اور محبِ وطن ہی کر سکتا ہے۔" امریکی نے آہستہ سے جواب دیا۔

ضوپو مسکرایا اور دروازے کی طرف مڑا،

"مجھے جلدی کرنی چاہئے۔"

"اور مجھے بھی۔"

"تمھیں؟"

"ہاں۔ میں بھی تمھارے ساتھ جاؤں گا۔"

"تمھیں کیا ضرورت پڑی؟ تم تو امریکی ہو ...."

"میں تمھارا دوست بھی تو ہوں۔"

"پھر بھی ......!"

"رہنے دو۔" سی بری نے بے چینی سے کہا۔ "پُل یہاں سے دس میل ہے، اور منگولی بہت قریب آگئے ہیں۔ ہمیں بگ ٹٹ بھاگنا چاہئے۔"

وہ دونوں موٹر میں سرپٹ دوڑے چلے گئے اور بازاروں، گلیوں، کوچوں سے نکل کر کھلے میدان میں آگئے کہ جس قدر جلد ممکن ہو دریا رنوتی کے پُل تک پہنچ جائیں۔ وہاں پہنچتے پہنچتے انھوں نے گردوغبار اُڑتا دیکھا اور ان کے پیروں تلے کی زمین نکل گئی۔ ان کے کان مختلف النوع شوروغل سے گونج اُٹھے۔

"منگولی آن پہنچے، جلدی کرو۔" امریکی نے اسلحہ خانے کے قریب رُکتے ہوئے کہا "جس طرح ہو جلد اندر گھس جاؤ۔ میرے پاس ریوالور ہے، میں ان سے نبٹتا ہوں۔"

"میں جاتا ہوں ——— لیکن تم اکیلے ان سے کیسے لڑوگے؟"

"خدا کے واسطے اندر جاؤ جس طرح بھی ہوگا میں ان سے مقابلہ کروں گا اور تمھیں کام کرنے کے لئے وقت مل جائے گا۔"

وہ خاموش کھڑا سیکنڈ گنتا رہا۔ وہ اندازہ کر رہا تھا کہ ضوپو اب اندر پہنچ گیا ہوگا، اب بکس ڈھونڈھ لیا ہوگا۔ اب کل پر ہاتھ رکھا ہوگا ——— اور اسی دم بندوقوں اور نیزوں سے مسلح سوار سامنے نظر آئے اور ان کی تلواریں چمکنے لگیں۔ اس نے کوئی حرکت نہیں کی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ ابھی ضوپو کو دو منٹ اور ملنے چاہئیں تاکہ منگولیوں کے پار کرنے

سے پہلے پُل ٹوٹ جائے اور وہ جاپانیوں سے متحد نہ ہوسکیں ــــــــ اور اس طرح دُنیا حرص وہو کے سمندر میں ڈوبنے سے بچ جائے۔۔۔۔۔۔ بالآخر اس نے فائر کیا اور منگولی کپتان گولی کھا کر گھوڑے پر سے گر پڑا۔ اس نے پھر فائر کیا اور منگولیوں نے چیخوں کے طوفان میں اس کی طرف نیزے پھینکے۔

اس نے اسلحہ خانے کی طرف آخری نگاہ ڈالکر قہقہہ لگایا اور عین اسی لمحے جب وہاں سے ایک غضب ناک دھماکے کے ساتھ پُل، اسلحہ خانے اور ایک قیمتی جان کی تباہی و بربادی کا اعلان ہوا۔ سی ہری کے قلب میں ایک منگولی برچھی ہمیشہ کے لئے پیوست ہوگئی۔

شاہکار (نومبر ۳۹ء) ـــــــــــــــــــــ احمد عبداللہ

اشتراکی

"کل صبح چھ بجے اسے گولی سے اُڑا دیا جائیگا"

بس یہی ایک چیز اس کے دل و دماغ میں واضح طور پر جمی ہوئی ہے۔ باقی تمام خیالات جو گزشتہ مہینوں کی دہشت انگیزیوں اور ہنگامہ پروریوں کی یادگار تھے۔ یکسر محو ہوگئے ہیں۔ بچپن کے زمانے میں جب وہ مشن اسکول کی صنعتی جماعت میں پڑھتی تھی۔ ایک دن اس نے ایک کوڑے کپڑے کو پھاڑ کر اس کے نئے پن اور اس کی آب و تاب کو غارت کر دیا تھا، بس اسی طرح کل صبح کوئی اس کی زندگی کو قطع کرکے اس کے ذہن کو ان تمام یادوں سے محروم کر دے گا جو اس وقت تک اس کے احساسات پر حاوی و طاری تھیں اور پھر ایک بیجان ڈھیر کے سوا کچھ بھی نہ ہوگا، کیونکہ اسے سینکڑوں اور مجرموں کے ساتھ کھڑا کرکے باڑ مار دی جائے گی اور دوسرے آدمیوں سے اُسے ممیز بھی تو نہیں کیا جا سکے گا۔ اس کے مردہ جسم پر کوئی نشانی بھی تو نہیں ہوگی۔ مزید برآں کوئی اس کی نعش لینے بھی نہیں آئے گا۔ آنا کیسا کسی کو یہ تک معلوم نہیں کہ اوروں کے ساتھ اُسے جیل خانے میں ٹھونس دیا گیا ہے۔ اس دس ماہ کے عرصے میں، جب سے انقلاب پسند لوگ شہر میں داخل ہوئے، ایک دفعہ بھی اسے اپنے والدین کی یاد نہیں آئی۔ ایک دفعہ بھی سوائے اُس لمحے کے جب اس نے نہایت بیقراری سے ان کی بے بضاعتی اور بے حیثیتی کا تصور کیا تھا۔

وہ بے چارے طبعاً سست اور سادہ لوح تھے مگر اپنے گاؤں میں ان کا کھاتا پیتا گھرانا تھا اور وہ شرافت سے اپنی زندگی گزار رہے تھے۔ لیکن اس وقت ان کا خیال بے محل ہے۔ برمحل صرف ایک چیز ہے' یہ کہ "اگلے روز صبح، چھ بجے اسے گولی سے اُڑا دیا جائیگا"۔

اس تمام عرصے کا ماحصل بس یہ تھا کہ ——

ہر چیز کو تباہ ہونا ہے، ہر شے کو بدلنا ہے اور ان کی بنیادوں پر نئے عالی شان قصر تیار کرنے ہیں۔ دس ماہ پہلے وہ کس قدر ناسمجھ تھی! اُس وقت جب وہ اپنے بورڈنگ میں سینا پرونا سیکھتی تھی اور اس کی بے وقوف امریکی اُستانیاں الفاظ چبا چبا کر جماعت میں ٹہلا کرتی تھیں! وہ باتیں کس قدر تیزی سے گزر گئیں!! صرف ایک دن میں اسکول کا تختہ اُلٹ دیا گیا۔ ہر چیز تہ و بالا کر دی گئی۔ انقلابی مارچ کرتے ہوئے سڑکوں اور بازاروں میں چلے آئے۔ وہ گا رہے تھے اور اپنے گانے میں (شراب میں نہیں) مدہوش تھے۔ اُن میں کچھ اس قسم کا جوش بھرا ہوا تھا کہ تمام لڑکیاں خوفزدہ ہوگئیں۔ لیکن وہ بالکل نہیں ڈری، بلکہ کھڑکی میں سے جھک کر جب اس نے پرچموں کے سفید سورج کو دیکھا جو ایک نئی دُنیا کا پیامی تھا، تو وہ اور بھی باہر لٹک گئی، اور اُس نے بہ آواز بلند پکارا۔

"انقلاب کی ہزاری عمر ہو"

اور اس آواز کو سن کر تمام انقلابیوں کے پُرجوش چہرے اس کی طرف اُٹھ گئے۔ سینکڑوں صورتوں نے اُسے بیک وقت دیکھا، لیکن وہ سب ایک ہی جیسے تھے، سیاہ آنکھیں اور تانبے کی طرح تپتے ہوئے بدن سب کے سب، سوائے اُس ایک شخص کے! لیکن اُسے اس وقت اُس کا خیال کیوں آرہا ہے؟ یہ نہیں آنا چاہئے۔ خصوصاً اب جبکہ اس کی زندگی کی صرف چند گھڑیاں باقی رہ گئی ہیں۔

انقلابی نہایت تیزی سے اسکول کے صحن میں داخل ہوئے اور انھوں نے وہاں کی ہر شے تتر بتر کر دی۔ غیر ملکی اُستانیاں اپنی جان بچاکر بھاگیں، بلکہ بہت سی ملکی طالبات بھی ڈرتی اور روتی ہوئی ایندھن کی کوٹھڑیوں میں جا چھپیں۔ لیکن وہ اس سانحے کا خیال کیوں کرے؟ گنتی کی یہ چند ساعتیں وہ اُن واقعات کو یاد کر کے کیوں ضائع کر دے؟ اب تو سب کچھ ختم ہو چکا ہے۔

پھر بھی اُسے یاد آرہا ہے کہ جب دوسری لڑکیاں ڈر کر بھاگیں تو وہ خود مردانہ وار دروازے پر جا کھڑی ہوئی اور جب وہ چمکیلی آنکھوں اور شکرے جیسے چہروں والے لوگ اس کے پاس سے گزرے تو اس نے نہایت عقیدت سے سلام کیا اور چیخ کر کہا:۔

"انقلاب کی ہزاری عمر ہو!"

سب لوگ، جو بالکل ایک جیسے تھے، آگے بڑھ گئے۔ لیکن وہ ایک شخص جو اپنے طویل قامت، نیلی آنکھوں اور سرخ و سپید جلد کی وجہ سے سب میں ممتاز تھا، اس کے قریب آگیا، اور نہایت بیدردی سے اس کے شانوں کے گرد اپنے بازو ڈال کر بولا

"کامریڈز! یہ میرا حصہ ہے!"

یہ اُسے بڑا عجیب معلوم ہوا کیونکہ اسے سان و گمان بھی نہیں تھا کہ کوئی غیر ملکی اتنی صاف چینی بول سکتا ہے۔ اُس نے اُسے بغور دیکھا تو گویا چودہ طبق روشن ہو گئے۔ اُس نے اس کی کمر تھپکی اور اس انداز سے ہنسا جس میں شوکت و ہوس ہم آہنگ تھیں۔ لیکن وہ اسے اس وقت کیوں یاد آرہا ہے؟ کل صبح تو وہ قتل ہی کر دی جائے گی؟ مگر اس لمحے اُس کی یاد اُسے بُری طرح ستا رہی ہے، تو پھر اسے یاد کر لینے دیجئے کہ آخر موت کیوں اس کے لئے مقسوم ہو چکی ہے۔

اُس نے تمام دن اُسے کہیں نہیں جانے دیا۔ ہر وقت اپنے بازوؤں کے گھیرے میں لئے رہا اور اپنی طاقت ور آواز میں اس نے بیسیوں دفعہ کہا، تمھیں مجھ سے ڈر نہیں لگتا؟ تب تو تم میری کامریڈ ہو! مجھے اُن لڑکیوں کا بھاگنا اور چھپنا سخت ناگوار گزرا لیکن تم اچھی ہو کہ تمھیں میرے ساتھ چلے آنے میں خوف نہیں معلوم ہوتا!"

وہ ایک لفظ بھی نہیں بولی۔ وہ ایک لفظ بھی نہیں کہہ سکتی تھی۔ جب بھی اس نے اس طرف نگاہ اٹھائی، بولنے کا ہر امکان جاتا رہا۔ لیکن اسے کسی بات کا ڈر بھی نہیں تھا۔ وہ اس سے جو چاہے کہے اُسے مطلق اعتراض نہیں! —— اور جب تمام انقلابی دن بھر کی غارت گری اور لوٹ مار کے بعد تھک گئے اور ان کا گانا بے ربط چیخوں میں تبدیل ہو گیا تو رات کو ایک عمارت کے سائے میں اس نے اُسے اپنے کمبل لٹالیا۔

ہر طرف مردوں، عورتوں اور بچوں کی لاشیں

بکھری ہوئی پڑی تھیں۔ پہلے پہل انھوں نے صرف ان لوگوں کو قتل کیا جنھوں نے مخالفت کی تھی لیکن بعد میں دوست دشمن کی پہچان مشکل ہوگئی اور بعض انقلابیوں نے، جو بھی نظر آیا اُسے موت کے گھاٹ اُتارنا شروع کردیا۔ پھر تو سب کے سب اپنے جذبے میں دیوانے ہوگئے، سوائے اُس شخص کے جس کی آغوش میں وہ سارے دن رہی! وہ گاہے گاہے ہنستا رہا اور اس کی آنکھیں چمکتی رہیں۔ اُس نے خونریزی بھی بہت کم کی۔ ایک دفعہ اس نے ایک بہت موٹے سوداگر کو قتل کردیا جو انقلابیوں کے گھستے ہی، ریشم کا چغہ پہنے، کانپتا ہوا گھر سے نکل آیا تھا اور اسے قتل کرنے کے بعد جب اس نے سوداگر کے ریشمی چغے سے اپنا خون آلود خنجر صاف کیا تو اس وقت بھی وہ بالکل نہیں ڈری۔ اُس نے اُسے مسکراتے ہوئے دیکھا۔ اس کی آنکھیں بے رحم اور برف کی طرح شفاف تھیں۔

"جو لوگ موٹے ہیں اور ضرورت سے زیادہ کھاتے ہیں، وہ جینے کا حق نہیں رکھتے، کیوں کہ وہ کریہہ المنظر ہوتے ہیں۔" اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ "سرمایہ دار کہیں کے!" اور یہ کہتے ہوئے اس کی آواز میں نفرت جھلک آئی .... لیکن وہ اُس کے متعلق کیوں سوچے جارہی ہے؟

سورج منازلِ سفر طے کر رہا تھا اور اس کی اِکا دُکا کرنیں کھڑکی میں سے اندر آرہی تھیں۔ جیل خانے میں زندگی کے آثار پیدا ہوچلے تھے اور لوگ انگڑائیاں لیتے ہوئے جاگ اٹھے تھے۔ کوئی جمائیاں لے کر اپنے زرد دانتوں کی نمائش کر رہا تھا۔ کسی کو کھانسی اُٹھ رہی تھی۔ کوئی تھوکے چلا جا رہا تھا۔ لیکن کل صبح، اس وقت، یہ سب کے سب مرے ہوئے ہوں گے! آج وہ ان میں گھری ہوئی، کھڑکی کی سلاخیں تھامے سرو قد کھڑی ہے کہ شاید تازہ پھولوں اور سرسبز پتوں میں سے آتا ہوا کوئی ہوا کا جھونکا اُن کی خوشبو لے آئے، چاہے وہ ذرا ہی سی ہو۔ کل صبح تو وہ کھڑی بھی نہ ہوسکے گی۔ اُس کا جسم بیجان پڑا ہوگا۔ لیکن کیا یہ ممکن ہے، کہ اس کے جسم سے تمام احساسات سلب ہوجائیں گے؟ اُس جسم سے، جس کی رگ رگ میں اُس شب کے بعد سے زندگی پیدا ہوگئی ہے جب اس کے محبوب نے اُسے اپنے کمبل میں لٹا کر اپنے قریب کھینچ لیا تھا۔

رات کو اس نے ایک بار اُس سے سوال کیا "تمھیں یہ انقلاب پسند ہے؟ دیکھو، میں نے تمھیں ایک بڑے حادثے سے بچا لیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ دیہات کے کسی شریف زادے سے تمھاری نسبت ہوچکی ہے ـــــ تمھارے یہ سُرخ رُخسار بتاتے ہیں کہ تم کسی گاؤں کی رہنے والی ہو ـــــ مگر وہ تم سے کبھی اتنی محبت نہیں کرے گا جتنی میں نے تم سے کی ہے۔" اُس نے اُسے پہلے آہستگی سے اور پھر تیزی سے جھنجھوڑا۔ "مجھے جواب دو، ورنہ میں تمھیں اس قدر خونخوار طریقے سے پیار کروں گا کہ تمھاری جان نکل جائے گی! ہم اشتراکیوں کو قتل کرنے کے بے شمار طریقے آتے ہیں۔ بولو، میں تمھیں پیار کے ذریعے مار ڈالوں؟ میں مار سکتا ہوں اور مار ڈالوں گا، ورنہ مجھے بتاؤ، تم اس بات سے خوش ہو کہ تم مجھے مل گئیں؟"

اُس نے اپنا سر کھڑکی کی سلاخوں سے ٹکا دیا۔ آج کیوں اُسی کا خیال چلا آرہا ہے؟ یہ سچ ہے کہ وہ بچپن سے اپنے پڑوسی کے لڑکے سے منسوب تھی اور وہ دونوں چھٹپن میں ساتھ کھیلتے تھے۔ جب وہ بڑی ہوئی تو والدین نے اُسے مدرسے میں داخل کر دیا کیونکہ یہ مناسب نہیں تھا کہ دولھا لڑکی کو روزانہ دیکھے۔ اُس نے اسے اب عرصۂ دراز سے نہیں دیکھا تھا، لیکن دولھا والوں کی ماما نے اُسے رازدارانہ اور اشاروں اشاروں میں بتایا تھا کہ وہ بڑا خوبرو اور باوفا لڑکا ہے، اور اخلاقیات کنفیوشس بڑے دل لگا کر پڑھتا ہے۔ اخلاقیات! کنفیوشس!! —— مگر وہ کچھ نہیں جانتی، سوائے اس کے کہ ایک دفعہ ساری رات وہ ایک مرد کے پہلو میں لیٹی رہی اور اس کے رخسار اس مرد کے برہنہ شانوں سے چپٹے رہے۔

"مجھے تمھارا نام تک نہیں معلوم، اور تم بھی میرا نام نہیں جانتیں۔" اُس نے اندھیرے میں ہنستے ہوئے کہا۔ اس کی ہنسی میں بے فکری اور ہوس جلوہ گر تھی "لیکن منی! اس کی ضرورت بھی کیا ہے؟ مجھے لوگ اشتراکی پیٹر کہتے ہیں اور میرا پتہ ہر دنیا! مگر آج رات میرا گھر یہ ہے۔ تمھارے پاس، یوں!"

اور وہ بولی "تم مجھے کبھی چھوڑ دو گے تو نہیں؟ سچ بتاؤ!"

وہ پھر ہنسا "اے منی تمھیں اس کی کچھ فکر نہیں کرنی چاہیے۔"

"مجھے تو اس کا بڑا فکر ہے۔" اس نے سرگوشی میں کہا اور اس کا جواب سننے کے لئے سراپا انتظار بن گئی۔ پھر تاریکی میں پیٹر کی ہنسی سن کر اس کے دل میں بے ساختہ تمنا پیدا ہوئی کہ کاش یہ اندھیرا دور ہو جائے تو میں اس کی صورت کو دوبارہ دیکھ لوں کیونکہ اسے ایسا محسوس ہوا کہ جب سے تاریکی پھیلی ہے وہ اس کے چہرے کے نقوش بالکل بھول گئی ہے۔ تھوڑے فاصلے پر اُن مکانات سے شعلے اُٹھ رہے تھے جہاں اشتراکیوں نے آگ لگائی تھی۔ اُس کے دل میں آرزو پیدا ہوئی کہ کاش کوئی گھر قریب ہی جل رہا ہوتا تاکہ اس کی روشنی اس کے لئے چراغ کا کام دیتی۔ مگر نہیں، اس کے قرب و جوار کی آگ بجھ چکی تھی اور وہاں اب محض خاک کے تودے پڑے ہوئے تھے۔

اب کے وہ نہیں ہنسا اور اس نے ذرا سنجیدگی میں جلدی سے کہا "تم چاہو تو میرے ساتھ چل سکتی ہو۔ مگر نہیں میرا کسی ایک جگہ قیام نہیں ہے، اس لئے عورتوں کو ساتھ نہیں لے جایا سکتا۔ دیکھو نا، مجھے دنیا میں بڑے کام کرنے ہیں۔"

"کون سے کام؟"

وہ ہنسا "ہائیں؟ تم سارے دن میرے ساتھ رہیں اور تم نے میرا کام بھی نہیں دیکھا؟ —— وہ فربہ سوداگر۔ یہ آتش زدہ مکانات! یہ سب میرے کام ہیں!!"

وہ خاموش ہو گئی اور ذرا تلخ کامی سے سوچنے لگی، کیا خبر کل صبح یہ کسی اور لڑکی کو ہتھیالے اور ساری رات اس کے ساتھ بسر کرے۔ لیکن فوراً ہی پیٹر کے تند و سخت ہاتھوں نے اس کے غرور کو عجز میں تبدیل کر دیا۔ کچھ ہرج نہیں۔ کوئی فکر نہیں۔ یہی

انقلاب سے ۔ کل صبح کیا ہوگا، یہ کچھ حقیقت نہیں رکھتا وہ ازخود اس کے سینے سے لپٹ گئی اور اس نے اپنے چہرے کو اس کے بڑے بڑے کھردرے، جلتے ہوئے ہاتھوں میں چھپالیا۔ اس کی زبان گنگ تھی کیونکہ اُسے محبت کے الفاظ کبھی معلوم ہی نہیں ہوئے تھے۔ اس نے کہا" میں سوؤں گی نہیں، بس اسی طرح لیٹی رہوں گی"۔ لیکن صبح ہونے سے پہلے وہ تھک کر سوگئی اور جب جاگی تو وہ جاچکا تھا، اور سورج آسمان پر زرد تانبے کی مانند دمک رہا تھا۔

وہ اُٹھ کھڑی ہوئی اور اس نے چاروں طرف اُس ملبے اور اینٹوں کو دیکھا جن کے سہارے کل شاندار عمارتیں کھڑی تھیں۔ کچھ لوگ سہمے سہمے اِدھر اُدھر پھر رہے تھے تاکہ کچھ بچا کھچا مال مل جائے۔ اُس نے اپنے سیاہ دراز بال ایک ہاتھ سے پکڑ کر انھیں بغور دیکھا۔ یہ لوگ وہ نہیں تھے جن کا وہ رُکن تھا وہ تو چلا گیا تھا اور اس نے اسے پھر کبھی نہیں دیکھا۔

اور اب اس کی فکر ہی کیا کیونکہ کل اُسے جان سے ماردیا جائے گا؟ اسے تو یہ قلق تھا کہ وہ پیٹر کی صورت کو ترس گئی۔ اُس نے اس کی ہر جگہ تلاش کی۔ اشتراکیوں کے ہر درجے میں اُسے یہ کہہ کہہ کر ڈھونڈا " کامریڈز! میں اشتراکی ہوں مجھے اُس طویل قامت روسی، پیٹر نے اشتراکی بنا دیا تھا۔ بتاؤ وہ کہاں ہے؟ کیا تم میں سے کسی نے اُسے کہیں دیکھا ہے؟" لیکن وہ کہیں نہیں ملا۔

اُن لوگوں نے اُسے اشتراکیوں کے گانے اور نعرے سکھائے اور اس نے انھیں نہایت آسانی سے سیکھ لیا کیونکہ وہ پیٹر کے تصنیف کردہ تھے۔ اور پھر اس نے کبھی کبھی ان لوگوں کو یہ بھی کہتے ہوئے سُنا "اب ہمیں ان روسیوں کی ضرورت نہیں۔ ہم چینیوں کو اپنے "انقلاب" کا خود بندوبست کرنا چاہئے۔ وہ لمبا روسی اگرچہ اشتراکی تھا، پھر بھی یہ مناسب نہیں تھا کہ وہ چینیوں کو قتل کرتا۔ اب ہم اپنوں کو قتل بھی خود ہی کریں گے۔"

پھر یکایک جذبات اور جوش وخروش کی رو بدل گئی اور وہ لوگ جن کے مکانات جلائے گئے تھے، جن کے عزیز واقارب کو قتل کیا گیا تھا اور جو اشتراکیت کے خلاف تھے، پھر برسرِاقتدار آگئے۔ چنانچہ اشتراکیوں کو جیلوں میں بھردیا گیا اور ہر روز ان باغیوں کو موت کے گھاٹ اُتارا جانے لگا۔

اس کو گرفتار کرنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی کیونکہ اسے اشتراکی ہونے پر فخر تھا۔ اس کے والدین نے اُسے گاؤں واپس بلانا چاہا تاکہ وہ اپنے گھر میں امن وامان سے رہے لیکن اس نے آنے سے انکار کردیا اور ملازم کو یہ کہہ کر لوٹا دیا کہ میں بالکل محفوظ ہوں۔ انقلاب کی خدمت میرا فرض ہے۔ آخر اس کا بوڑھا باپ ڈرتا ڈرتا، چوری چھپے راتوں رات شہر میں داخل ہوا اور اُس سرائے میں پہنچا جہاں وہ دوسری اشتراکی عورتوں کے ساتھ مقیم تھی۔ وہ باہر دروازے پر ہی اُس سے ملنے چلی آئی۔ بوڑھے کے سفید بال ہوا میں اُڑ رہے تھے اور اس کا جبڑا خوف سے کانپ رہا تھا۔ جب وہ کسی طرح نہیں مانی تو بے چارہ اسکے ـــــ اپنی بیٹی کے ـــــ قدموں پر گر پڑا "اے میری لختِ جگر! ہمیں تیری زندگی کا خطرہ ہے"۔

"تم فکر نہ کرو۔ مجھے کوئی خطرہ نہیں ہے!"
"میں، تیرا باپ ہوں 'بیٹی'!"
"میرا کوئی باپ یا ماں نہیں ہے۔ انقلاب ہی میرا باپ اور میری ماں ہے۔"
"اور وہ تیرا شوہر؟ جو تیرا انتظر ہے!؟"
"میری تو شادی ہو چکی ہے۔"
"شادی ہو چکی؟" وہ واقعی بے حد معمر تھا اور چاندنی میں اس کی جھریاں نمایاں ہو گئی تھیں۔
"ہاں میری شادی ہو چکی ہے —— انقلاب سے!" یہ کہہ کر اس نے دروازہ بند کر دیا۔ وہ کیسے وہاں سے چلی جاتی؟ اُس خاموش و پُرسکون گاؤں کے متعلق تو اُسے یقین تھا کہ وہاں پیٹر سے ہرگز ملاقات نہیں ہو سکتی۔ وہاں تو وہ منکوحہ ہو گی اور گھر کی چہار دیواری میں مقید!

نورِ سحر نمودار ہوا۔ آسمان پر چاند کی سی سفیدی پھیل گئی۔ محافظ آنے شروع ہو گئے تاکہ جن اشتراکیوں کو آج گولی سے اُڑانا ہے، انھیں شہر والوں کے بیدار ہونے سے پہلے جلدی جلدی جائے مقررہ پر لے جائیں۔ لیکن شہریوں کے لئے اب یہ کوئی انوکھی بات نہیں رہی تھی۔ باغیوں کو سزا دینے کے لئے روز ہی نشانہ بنایا جا رہا تھا۔ خیر، اب کوئی دم میں وہ زندگی سے محروم ہو جائے گی۔ وہ، جو طوفانِ انقلاب کا ایک معمولی ذرہ تھی! قریب ہی، ایک بھاری بھرکم شخص جمائی لے کر اٹھ بیٹھا اور اپنے اِرد گِرد مجمع پر نظر ڈال کر بولا "آج ہم میں سے ستّو اور انقلابی موت کے گھاٹ اُتار دیئے جائیں گے!"

—— اب اُسے بھی تیار ہونا چاہئے لیکن جاتے جاتے ان گریز پا لمحوں میں وہ اُس خلوتِ مختصر کی یاد کیسے منائے جب کسی کے پہلو میں وہ سچ مچ زندہ تھی؟

محافظوں نے اُن سب کو باہر نکال لیا۔ صرف وہ اکیلی رہ گئی۔ زنداں کی نمناک دیوار کے سہارے کھڑی ہوئی! اور جب اس کا نمبر آیا تو ایک محافظ نے اپنی بندوق اس کے چھوتے ہوئے کہا "نکل باہر!"

اُس نے مایوسی سے چاروں طرف دیکھا "میں نہیں نکلتی۔"

"کیا؟ تو مرے گی نہیں؟"

"مجھے مرنے کی پروا نہیں ہے۔ لیکن میں یہ پسند نہیں کرتی کہ مجھے یوں بھیڑ بکریوں کی طرح ہنکایا جائے۔ میں تو یہ چاہتی ہوں کہ مقتل میں گاتی ہوئی جاؤں۔"

"تو عیسائی ہے کیا؟" محافظ ہنسا اور اپنے مددگار کو اشارہ کرتے ہوئے بولا "بال بجل ہے! ہے نا؟ اچھا، بول تو کیا چاہتی ہے؟ تیرے لئے عروسی پالکی منگاؤں یا گورنر کی کار؟"

اُسے سعاً ایک خیال آیا۔ کوئی بھی ایسی چیز ہو جس میں وہ دوسرے خوفزدہ اور ذلیل قیدیوں سے سربلند اور ممتاز ہو سکے۔ اس نے کہا "میرے لئے کار منگا دو۔ دیکھو، میں کمزور ہوں۔ کل میں کھانا بھی نہیں کھا سکی۔"

"اچھا، انتظام کرتا ہوں۔" اس نے اس کی باتوں کا لطف اٹھاتے ہوئے جواب دیا۔ لیکن دراصل جو سواری اس کے لئے منگائی گئی وہ پولس کی گاڑی تھی جسے دو موٹے اور بھدّے بیل کھینچ رہے تھے۔ اس نے اس پر سوار ہونے سے انکار کیا مگر محافظ میں اب تاب نہیں رہی تھی۔ وہ چیخ کر بولا "نخرے

کرتی ہے؟ چل ——، ورنہ ہمارے پہنچنے سے پہلے سب قتل ہو چکے ہوں گے"۔

آسمان پر ایک سیاہ بادل میں سے دم بدم طلوع ہونے والے آفتاب کی روشنی چمک رہی تھی اور جلوس دیکھنے کے لئے لوگ اپنے اپنے گھروں کے دروازوں میں کھڑے ہونے شروع ہو گئے تھے۔ وہ آپس میں کہہ رہے تھے "وہ اشتراکیوں کو مارے ڈال رہے ہیں۔ آہ، قاتل آخر مقتول بن رہے ہیں"۔

وہ بیل گاڑی میں، چھت کو پکڑے ہوئے کھڑی تھی۔ بیل سست رفتار تھے، جنھیں دیکھ کر اسے اپنے باپ کا گاؤں اور سیاہ زمین کے کھیت یاد آگئے جو پانی سے لبریز، چاول بونے کے لئے تیار رہتے تھے۔ لیکن اب یہ سب کچھ کسی قدیم کتاب کا فراموش شدہ ورق معلوم ہوتا تھا۔ اس نے کسی کو کہتے ہوئے سنا "ذرا اُسے دیکھو —— کس قدر کم عمر اور خوبصورت لڑکی موت کے منہ میں جا رہی ہے"۔ اور دفعتاً اس کا تنفس تیز ہو گیا اور اُسے یہ احساس ہونے لگا کہ وہ بے حد قابلِ رحم ہے۔ اس نے اپنے جسمِ لاغر کو دیکھا جو نیلے سوتی کوٹ اور پائجامے میں ملبوس تھا۔ پھر اُسے خیال آیا کہ اس کے محبوب نے اُسے بار بار یوں بھی تو مخاطب کیا تھا کہ "اے میری ننّی! اے میری ننّی!"

وہ چپکے چپکے رونے لگی۔ لیکن کیا وہ سچ مچ رونے لگے گی؟ نہیں، یہ کوئی ایسا المناک واقعہ تو نہیں ہے۔ وہ تو آزاد مر رہی ہے! پیٹر نے اُسے آزادی کا سبق سکھا کر آزاد کر دیا ہے۔ ان تمام سینکڑوں آدمیوں میں صرف وہی اکیلی ہستی ہے جسے ایک ایسی شب بستر آگئی جو سالہا سال کی عمر سے بھی افضل و بہتر ہے۔

بادل کے چاروں طرف آفتاب کی سیمیں گوٹ چمک اُٹھی اور وہ اپنے صاف و شیریں لب و لہجہ میں ایک ایسا گیت گانے لگی جسے وہ فی البدیہہ ترتیب دے رہی تھی۔ اس گیت کو کوئی نہیں سمجھ سکا کیونکہ درحقیقت یہ اُس ہستی کا نغمہ تھا جس کی عمر کل ایک ساعت تھی وہ ساعت جواب گزر چکی تھی۔ لوگ سنتے رہے اور جب تک وہ گاتی رہی، اس کا جسم تنا رہا اور اس کی آنکھیں چمکتی رہیں —— وہ آپس میں چہ میگوئیاں کرنے لگے "یہ کم سن لڑکی بڑی راسخ العقیدہ اشتراکی ہے —— مگر یہ اپنی موت کا استقبال نغمات سے کیوں کر رہی ہے؟"۔

پرل بک

شکست

افراد :-
ایک افسر
ایک لڑکی

جنگِ عظیم کا زمانہ ــــــــــــــ شام

[ایک خالی کمرہ کھنچے ہوئے پردوں، مدھم روشنی اور فرنیچر سے ہلکی سبزی عیاں ہے۔ بائیں جانب آتشدان، صوفہ اور ایک چھوٹی میز ہے۔ پُشت کی دیوار میں ایک دریچہ ہے جس پر پردہ پڑا ہوا ہے۔ میز پر گلدان میں ہری بھری شاخوں سے گندھا ہوا ایک گلدستہ ہے۔ دائیں طرف کے دروازے سے ایک لڑکی اور خاکی کپڑوں میں ملبوس ایک افسر داخل ہوتا ہے۔ لڑکی کے کپڑے، ٹوپی اور نقاب سیاہی مائل ہیں۔ افسر دراز قد ہے۔ اس کا کھلا کھلا چہرہ تر و تازہ، نیلی آنکھیں ترحم آمیز، اور پاؤں میں کسی قدر لنگ ہے۔ لڑکی دریچے کا پردہ ہٹا کر اسے کھولتی ہے اور چاند کی تیز اور شفاف روشنی اندر آتی ہے۔ باہر سے چند درخت نظر آرہے ہیں اور وہ انہیں دیکھنے میں محو ہو جاتی ہے لیکن فوراً ہی خود بخود ایک کپکپی کے ساتھ اس کی طرف مڑتی ہے۔]

نوجوان افسر۔ جب میں نے تم سے پہلے پہل بات کی تو تم رو کیوں رہی تھیں ؟

لڑکی۔ یونہی ذرا کچھ یاد کر کے طبیعت بھر آئی تھی ۔

(وہ نقاب اور ٹوپی اُتار دیتی ہے ۔ اس کے بال سنہری اور گھنگریالے ہیں۔)

افسر۔ (دریچے تک لنگڑاتا ہوا پہنچتا ہے) میں کہتا ہوں تم نے یہ ـــــــ ایسی زندگی کیوں اختیار کی ، کیا یہ شرمناک نہیں ہے ؟

لڑکی۔ ہے تو سہی۔ تم زخمی ہو گئے ہو ؟

افسر۔ ہسپتال سے آج ہی نجات ملی ہے ۔

لڑکی۔ آہ ! یہ تمام تباہ کاریاں جنگ ہی کی بدولت ہیں ۔ یہ کب ختم ہوگی ؟

افسر۔ (دریچے پر جھک کر اس کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے) تم کس قوم سے تعلق رکھتی ہو ؟

لڑکی۔ (جلدی سے) روسی

افسر۔ اچھا ! میری کبھی کسی روسی لڑکی سے ملاقات نہیں ہوئی ۔

لڑکی۔ (افسر کے بازو میں اپنا ہاتھ ڈال کر آہستہ سے

مسکراتی ہے) تم یہاں اس لئے آئے ہو کہ میں
مغموم ہوں، دوسرے اس لئے آتے ہیں کہ
میں مسرور ہوتی ہوں، مگر میں مردوں کی بالکل
شائق نہیں۔

افسر۔ تم مردوں سے واقف نہیں ہو، وہ بڑے
بہادر ہوتے ہیں۔

لڑکی۔ تم بھی کچھ کم بہادر نہیں معلوم ہوتے۔

افسر۔ میں تو کچھ بھی نہیں ہوں۔ سچ جانو جب ہم
نے حملہ کیا ہے (جہاں میں زخمی ہوا تھا) تو ہم
میں سے ہر شخص اپنی جان پر کھیل گیا تھا۔

لڑکی۔ (حیرت زا آواز میں) شاید ——— دشمن بھی
ایسا ہی کرتے ہیں۔

افسر۔ ہاں، بے شک۔

لڑکی۔ کم ظرف لوگ دشمن کی بہادری کا اعتراف
نہیں کرتے۔ اس لئے مجھے اُن سے نفرت
ہے مگر تم بہت اچھے لڑکے ہو، ہیں نا؟

(افسر یہ طرزِ تخاطب پسند نہیں کرتا اس لئے اس
کی تیوری پر ہلکا سا بل آجاتا ہے)

لڑکی۔ (اس سے قریب ہوتے ہوئے) میں تو تمھیں
اسی لئے پسند کرتی ہوں۔ اچھے آدمی سے ملاقات
ہونی خوش نصیبی ہے۔

افسر۔ اس لئے کہ تم تنہا ہو؟ کیا تمھارے روسی
دوست نہیں ہیں؟

لڑکی۔ (فوراً ہی) روسی؟ نہیں۔ شہر بھی تو کتنا بڑا
ہے۔ مجھ سے ملنے سے پہلے کیا تم تماشے میں
تھے؟

افسر۔ ہاں۔

لڑکی۔ میں بھی وہیں تھی۔ مجھے موسیقی بیحد پسند ہے۔

افسر۔ شاید سب ہی رُوسیوں کو ہوتی ہے۔

لڑکی۔ میرے پاس جب بھی پیسے ہوتے ہیں، میں
وہاں ضرور جاتی ہوں۔

افسر۔ ہیں؟ کیا تم اس قدر مفلس ہو؟

لڑکی۔ ہاں۔ میرے پاس اس وقت صرف ایک شلنگ ہے۔
(وہ ہنستی ہے اور اس کی ہنسی جو تلخی آمیز ہے افسر
کو پریشان کر دیتی ہے۔ وہ دریچے کی سِل پر بیٹھ کر
اس کی طرف جُھک جاتا ہے۔)

افسر۔ تمھارا نام کیا ہے؟

لڑکی۔ مے۔ مگر میں تمھارا نام پُوچھنے کی ضرورت نہیں
سمجھتی۔

افسر۔ (ہنستے ہوئے) معلوم ہوتا ہے تمھیں کسی پر
اعتماد نہیں ہے۔

لڑکی۔ نہیں۔ لیکن اس کی کچھ وجوہ بھی ہیں۔

افسر۔ ہوں گی۔ تم ہم مردوں کو درندے ہی سمجھنے پر
مجبور ہو۔

لڑکی۔ (دریچے کے پاس ایک کرسی پر بیٹھ جاتی ہے۔
چاندنی میں اس کے غازہ ملے ہوئے رخسار دمک
رہے ہیں) کچھ ایسی ہی وجوہ ہیں جو میں ہر وقت
ڈرتی رہتی ہوں اور کسی پر بھروسہ نہیں کر سکتی۔
تم نے بہت سے جرمنوں کو جان سے مار دیا ہوگا؟

افسر۔ یہ تو صرف اس وقت معلوم ہو سکتا ہے جب
لڑائی دست بدست ہو اور یہ نوبت ابھی تک
نہیں آئی۔

لڑکی۔ لیکن جرمنوں کو قتل کر کے تمھیں خوشی تو بہت
ہوتی ہوگی۔

افسر۔ نہیں۔ ہم صرف اپنا فرض ادا کرتے ہیں۔
لڑکی۔ اُف! کس قدر خوفناک ہے۔ میرے بھائی تو شاید مارے جا چکے ہوں گے۔
افسر۔ کیا اُن کے پاس سے کوئی خبر نہیں آتی؟
لڑکی۔ خبر؟ نہیں، میرے وطن والوں کی خبریں یہاں نہیں آتیں۔ اور میرا تو اب کوئی وطن بھی نہیں ہے۔ میرا باپ، ماں، بہنیں، بھائی سب مر کھپ چکے ہیں۔ آہ! وہ صورتیں اب کہاں نظر آئیں گی! دیکھو تو یہ مہیب جنگ دلوں کو توڑے دیتی ہے۔ جانتے ہو، جب تم میرے پاس آئے تھے تو میں کیا سوچ رہی تھی؟ مجھے اپنا وطن یاد آ رہا تھا جہاں چاندنی رات میں دریا گنگناتا ہے۔ کیا تم کبھی اپنے وطن سے جدا ہوئے ہو؟ کیا دُکھ ہوتا ہے! ـــــ یہاں سب مجھ سے نفرت کرتے ہیں، کیا خبر ایک دن یہ لوگ مجھے قید بھی کر دیں۔
(اس کے سینے کے زیر و بم سے اس کے دماغی انتشار کا پتہ چلتا ہے)
افسر۔ (تسلی دیتے ہوئے) نہیں، نہیں، فکر مت کرو۔
لڑکی۔ تم پہلے آدمی ہو جس نے اس طویل عرصے میں پہلی بار مجھ سے ہمدردی کی ہے۔ مجھے تم سے سچ سچ کہہ دینا چاہیے ـــــ میں روسی نہیں ہوں ـــــ جرمن ہوں!
افسر۔ تو کیا ہوا، ہم عورتوں سے نہیں لڑ رہے۔
لڑکی۔ (اس کی طرف دیکھتے ہوئے) ایک اور آدمی نے بھی مجھ سے یہی کہا تھا لیکن اسے محض اپنی دلبستگی کا خیال تھا۔ تم بہت اچھے آدمی ہو۔ مجھے تم سے مل کر جتنی خوشی ہوئی ہے، کہہ نہیں سکتی ـــــ اچھا، فرض کرو میں اب بھی باعصمت ہوں ـــــ جیسے کہ پہلے تھی ـــــ اور تم مجھے اپنی ماں بہنوں میں لے جا کر کہو "یہ بیچاری ایک مفلس جرمن لڑکی ہے جس کا دنیا میں کوئی نہیں ہے۔" معلوم ہے کیا جواب ملے گا؟ یہی کہ "جرمن لڑکی! خیر، افسوس۔" اور اس کے بعد مجھے ناپاک سمجھ کر وہ اپنے ہاتھ ضرور دھوئیں گی۔
(افسر خاموش ہے اور اس کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہا ہے)
لڑکی۔ سمجھے تم! وہ ایک جرمن کا چاہے وہ کتنی ہی اچھی کیوں نہ ہو، اپنے گھر میں گھسنا بھی پسند نہیں کریں گی ـــــ اور میں اب اچھا ہونا بھی نہیں چاہتی۔ زمانے نے مجھے بُرا رہنا سکھا دیا ہے۔ کیا تم مجھے پیار نہیں کرو گے؟
(وہ اپنا چہرہ اس کے قریب لاتی ہے لیکن اس کی نظریں افسر کے خیالات پراگندہ کر دیتی ہیں اور وہ پرے ہٹ جاتا ہے)
لڑکی۔ (اس کو گھورتے ہوئے) کیا تم ہم لوگوں سے اتنی نفرت کرتے ہو؟
افسر۔ (فوراً ہی) نفرت؟ نہیں تو۔
لڑکی۔ میں تو انگریزوں تک سے نفرت نہیں کرتی ـــــ ہاں انھیں حقارت سے دیکھتی ہوں۔ اپنی قوم کو بھی حقارت سے دیکھتی ہوں بلکہ زیادہ حقارت سے، کیونکہ جنگ شروع انھوں ہی نے کی تھی۔ مجھے سب ہی قوموں سے نفرت ہے۔ آخر انھوں نے دنیا میں یہ ہلڑ ہلوں کیوں

مچا رکھی ہے؟ اور یہ قتل وغارت کیوں کیا جارہا ہے؟ کتنی ہزاروں اور لاکھوں جانیں اس لڑائی کے بھینٹ چڑھ چکی ہیں اور وہ بھی بے فائدہ! انھوں نے دنیا کو کس قدر خوفناک اور گھناؤنا بنا دیا ہے! حقارت وعداوت کے چشمے پھوٹ پڑے ہیں اور ہر چیز تباہی کی طرف جارہی ہے۔ اور مجھے بھی انھوں ہی نے برباد کیا ہے۔ اب میرا ایمان بھی سلامت نہیں رہا۔ ایمان کس پر لاؤں؟ خدا پر؟ کیا اس کا کہیں وجود ہے؟ نہیں۔ اور یہ نمازیں ——— کیا مضحکہ خیز نہیں ہیں؟ کبھی میں بھی مسیحؑ کو جانتی تھی۔ اب تو عیار اور احمق کے سوا اُسے کوئی نہیں مان سکتا۔ میں چاہتی ہوں کہ ہسپتال میں تم جیسے غریب لڑاکوں کی خدمت کروں لیکن ——— چونکہ میں جرمن ہوں، اس لئے وہ مجھے نکال باہر کریں گے۔ یہ تعصب یہاں ہی نہیں، جرمنی، روس، فرانس غرض ہر جگہ ہے۔ تو کیا پھر بھی میں خدا اور یسوعؑ پر ایمان لاؤں؟ ——— کبھی نہیں۔ میرے خیال میں، ہم سب درندے ہیں! ——— تم یہ نہ سمجھنا کہ میری زندگی مجھ سے یہ سب کچھ کہلوا رہی ہے۔ لوگ اپنے آپ کو اب مہذب اور عالی ظرف سمجھنے لگے ہیں اور پھر بھی جنگ کا باعث ہوتے ہیں، چنانچہ قتل وخون اور تباہی وبربادی شروع ہو جاتی ہے۔ جوان موت کے گھاٹ اُتارے جاتے ہیں، بیگناہوں کو جیلخانوں میں سڑایا جاتا ہے اور ہم میں منافرت پیدا کی جاتی ہے۔ اور یہ خود غرض وحشی بھی، جو اخبار نویس اور نامہ نگار بنتے ہیں ——— میرے وطن میں بھی ایسا ہی ہوتا ہے ——— اس قابلِ نفریں عمل میں برابر کے شریک ہوتے ہیں۔ اسی لئے تو کہتی ہوں کہ ہم سب درندے ہیں۔

(افسر زچ ہو کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ لڑکی اس پر نظریں جمائے رہتی ہے)

لڑکی۔ میری باتوں کا بُرا نہ ماننا۔ میرا کوئی اور نہیں ہے جس سے بات کرکے دل کی بھڑاس نکال سکوں۔ اگر تمھیں ناگوار گزرتا ہے تو میں اب کچھ نہیں کہوں گی۔

افسر۔ نہیں، نہیں، جو تمھارا دل چاہے کہو۔ یہ ضروری تو نہیں ہے کہ میں تمھاری ہر بات سے متفق ہوں۔

لڑکی۔ (وہ دیوار سے لگ کر کھڑی ہوگئی ہے اور اس کے سیاہ لباس میں چاند کی کرنیں جھلملا رہی ہیں۔ اس کی آواز نرم، آہستہ اور تلخ ہے۔)

اچھا تم ہی بتاؤ اس دنیا کا آخر انجام کیا ہوگا جہاں لاکھوں آدمی بے گناہ عذاب میں مبتلا کئے جاتے ہیں۔ کیا تم ایسی دُنیا کو خوبصورت کہہ سکتے ہو؟ جب مجھے اپنے ہموطنوں کا خیال آتا ہے کہ وہ دُکھ اور مصیبت میں گرفتار ہیں تو میں کانپ اُٹھتی ہوں۔ اور اسی طرح جب میں یہاں کے قیدیوں اور اُن لوگوں کے متعلق سوچتی ہوں جو اپنے چہیتوں سے جُدا ہوگئے ہیں تو مجھے بڑا رنج ہوتا ہے۔ کیا میں ان سب کو بھول جاؤں؟ اگر نہیں تو پھر اس دنیا کو خوبصورت اور اچھا کیسے مان لوں؟

(افسر خاموش کھڑا اس کی طرف تک رہا ہے)

لڑکی۔ ہر شخص کی زندگی جلد ختم ہو جاتی ہے اور اس کے بعد کچھ بھی نہیں۔
افسر۔ کیوں نہیں ؟
لڑکی۔ تم سمجھتے ہو کہ جنگ مستقبل کی بہتری کے لئے کی جاتی ہے! تم اپنی جانیں اس امید میں لڑاتے ہو کہ دنیا بہتر ہو جائے! ہے نا؟
افسر۔ ہاں۔ جب تک فتح حاصل ہو ہمیں لڑتے رہنا چاہیئے۔
لڑکی۔ جب تک تمھیں فتح حاصل ہو! میری قوم بھی یہی سمجھتی ہے۔ تمام قومیں یہی سمجھتی ہیں کہ اگر ہم جیت جائیں تو دنیا کی حالت بہتر ہو جائیگی۔ لیکن یہ کبھی نہیں ہوگا، دنیا اور بھی بدتر ہو جائیگی۔
(وہ ٹوپی اٹھا کر جانے لگتا ہے۔ لڑکی کی آواز اس کے ساتھ ساتھ جاتی ہے)
لڑکی۔ میری طرف سے کوئی جیتے! میرا ملک اگر ہار بھی جائے تو مجھے پروا نہیں۔ مجھے سب سے نفرت ہے ــــ درندے! ــــ وحشی! اگر تم جا کیوں رہے ہو۔ اچھا لو میں بالکل خاموش ہو جاتی ہوں۔
(افسر اپنی جیب میں سے کچھ نوٹ نکال کر میز پر رکھتا ہے اور اس کے قریب جاتا ہے۔)
افسر۔ خدا حافظ۔
لڑکی۔ (غمگین ہو کر) کیا تم سچ مچ جا رہے ہو؟ کیا تم مجھے پسند نہیں کرتے؟
افسر۔ کیوں نہیں، میں تمھیں پسند کرتا ہوں۔
لڑکی۔ تو کیا اس لئے جا رہے ہو کہ میں جرمن ہوں؟
افسر۔ نہیں۔
لڑکی۔ تو پھر تم ٹھیرتے کیوں نہیں؟
افسر۔ جاننا چاہتی ہو؟ ــــ تم نے میرا دماغ مختل کر دیا ہے۔
لڑکی۔ کیا تم مجھے ایک بار بھی پیار نہیں کرو گے؟
(وہ اپنے لب اس کی پیشانی پر رکھ دیتا ہے)
لڑکی۔ (ہنستے ہوئے) تم کتنے اچھے ہو! مجھ سے تھوڑی دیر باتیں کرو، کوئی اور شخص مجھ سے باتیں نہیں کرتا۔ ہاں۔ کیا تم نے بہت سے جرمن قیدیوں کو دیکھا ہے۔
افسر۔ (ٹھنڈا سانس لیتے ہوئے) ہاں۔
لڑکی۔ اُن میں کچھ رائین کے بھی تھے؟
افسر۔ شاید۔
لڑکی۔ کیا وہ بہت رنجیدہ تھے؟
افسر۔ بعض رنجیدہ تھے، بعض خوش بھی۔
لڑکی۔ تم کبھی رائین گئے ہو؟ آج رات وہ دیکھنے کے قابل مقام ہے۔ ایسی ہی چاندنی وہاں بھی ہوگی اور جس طرح یہاں درخت خوشنما معلوم ہو رہے ہیں وہاں بھی بڑے دلفریب معلوم ہو رہے ہوں گے .... یہ جنگ کیا حماقت کا ثبوت نہیں ہے؟ گویا زندہ رہنا کوئی جرم ہے!
افسر۔ تم زندگی کی حقیقت اس وقت تک نہیں سمجھ سکتیں جب تک کہ تمھیں موت سے دوچار ہونا نہ پڑے، اور جب تم دوسروں کے لئے اپنی جان قربان کرنے پر آمادہ ہو جاؤ تو اس وقت جو لطف محسوس ہوتا ہے اس کے آگے بڑی سے بڑی عمر ہیچ ہے۔
(وہ رُک جاتا ہے اور اس لڑکی کے آگے ایسی باتیں

کرتے ہوئے جن کو وہ ڈھکوسلا سمجھتی ہے، شرم محسوس کرتا ہے)

لڑکی۔ (آہستہ سے) تمھارے یہ چوٹ کس طرح لگی تھی ؟

افسر۔ حملہ کرتے وقت ۔

لڑکی۔ جب انھوں نے تمھیں حملے کا حکم دیا تو کیا تمھیں قطعی کوئی خوف نہیں معلوم ہوا ؟

(وہ سر ہلا کر انکار کرتا ہے اور ہنستا ہے)

افسر۔ واہ، یہ تو ایک کارنامہ تھا۔ اس روز ہم نے خوب خوشی منائی ۔

لڑکی۔ خوشی منائی ؟

افسر۔ ہاں ملک کی خاطر قربان ہوجانا خوش بختی ہے ۔

لڑکی۔ میں ان باتوں کو نہیں مانتی۔ میرا دل مرچکا ہے ۔

افسر۔ صِرف تمھاری رائے ہیں۔ اگر یہ در اصل مرچکا ہوتا تو مجھ سے ملاقات کے وقت تم روتی نہیں ۔

لڑکی۔ تم اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ اگر دل مُردہ نہ ہوچکا ہوتا تو میں اس طرح زندہ نہیں رہ سکتی تھی کہ ——— راتوں کو گلیوں میں ماری ماری پھرتی رہوں، ہر اجنبی شخص پر جھوٹی محبت کا اظہار کروں، کبھی کسی سے ہمدردی کا ایک لفظ نہ سُنوں اور اس خیال سے ہمیشہ مُنہ بند رکھوں کہ کوئی مجھے پہچان نہ لے کہ میں جرمن ہوں۔ صِرف آج رات میں اپنے آپ کو سمجھ رہی ہوں ورنہ مجھے کبھی اور کسی کی پروا نہیں رہتی ۔

افسر۔ اور ابھی جو تم اپنے ہموطنوں اور قیدیوں وغیرہ کو یاد کرکے کُڑھ رہی تھیں ؟

لڑکی۔ ہاں، اس لئے کہ وہ رنج والم میں مبتلا ہیں اور جو رنج والم میں مبتلا ہے وہ میری طرح ہے ——— مجھے اپنے پر بھی تو ترس آتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور محبت وخلوص تو اس دُنیا میں بے معنی ہیں ۔ ہم صِرف اپنے تئیں محبت کرتے ہیں اور اس کے علاوہ ہمیں کسی کی پروا نہیں رہتی ۔

(یہ تلخ اور تکلیف دہ باتیں سُن کر وہ کھڑا ہو جاتا ہے ۔ کچھ فاصلے پر ایک اخبار فروش آواز لگا رہا ہے۔ لڑکی کی انگلیاں اس کی انگلیوں میں پھنس جاتی ہیں ۔ وہ مُڑ کر اس کے چہرے کو دیکھتا ہے ۔ باوجود مصنوعی آرائش کے اس کا پُر معصیت حُسن دلکش ہے ۔)

افسر۔ کیوں نہیں ؟ ہم صِرف اپنے آپ ہی سے محبت نہیں کرتے ۔ دُنیا میں اس سے کچھ زیادہ بھی ہے۔ میں اس کو بتا نہیں سکتا لیکن کوئی عظیم ترین وصف ہے ضرور، ہمدردی اور ——— اور ———

(اخبار فروشوں کی آوازیں تیز ہو رہی ہیں مگر ان کی گرم جوشی اور بہت سی چیخوں کی وجہ سے الفاظ صاف نہیں سُنائی دیتے ۔ افسر سُننے کے لئے کان ایک طرف لگا دیتا ہے ۔ اس کے بازو کے گرد، لڑکی کے ہاتھ کی گرفت ——— مضبوط ہو جاتی ہے ۔ چاند کی روشنی میں بہت سی صورتیں نظر آتی ہیں، کوئی بھاگ رہا ہے، کوئی پکار رہا ہے، کوئی خوشی سے شور مچا رہا ہے۔ وہ بھی سُن رہی ہے ، آوازیں قریب آ رہی ہیں ۔

"فتح عظیم ——— فتحِ عظیم ——— ہماری فتح ! دشمن کو شکستِ فاش !" خبر آناً فاناً پھیل جاتی ہے ۔ وہ خوشی سے پھولا نہیں سماتا اور اپنا دھڑ دریچے سے باہر نکال کر پاگلوں کی طرح ٹوپی اُچھالتا ہے ۔ پھر باہر نکل جانا چاہتا ہے کہ کسی

نرم ونازک شے سے ٹکر ہوتی ہے۔ لڑکی مٹھیاں بند کئے کھڑی ہے اور اس کے چہرے پر کرب و پریشانی کے آثار ہیں۔ وہ اس کے ہاتھ کو بوسہ دینے کے لئے جھکتا ہے۔ لڑکی اُن نوٹوں کو بٹور لیتی ہے جو افسر نے میز پر رکھے تھے اور ہاتھ میں لے کر اس کی طرف بڑھ جاتی ہے)

لڑکی۔ ان کو واپس لے لو ——— میں تمہاری انگریزی دولت نہیں لینا چاہتی ——— ان کو لے لو۔

(یکایک وہ ان نوٹوں کو پھاڑ کر پرزے پرزے کر دیتی ہے اور ان کو فرش پر بکھیر کر اس کی طرف سے منہ پھیر لیتی ہے۔ وہ اس کی طرف کھڑا دیکھ رہا ہے لیکن فوراً ہی دروازے کا رُخ کرتا ہے۔ اس کے جانے کے بعد بھی وہ خاموش کھڑی ہے۔ اس کی ٹھوڑی اس کے سینے پر لٹک آئی ہے اور اس کے کانوں میں بھاگنے دوڑنے کی آوازیں آ رہی ہیں۔ کوئی چیخ چیخ کر خوشی سے کہہ رہا ہے "شکستِ فاش"! وہ نوٹوں کے پُرزوں میں گھری ہوئی چاند کی روشنی کو دیکھ رہی ہے لیکن وہ اپنے گرد و نواح کو نہیں دیکھ رہی بلکہ اس کی نگاہوں میں جرمنی کا ایک پھلوں والا باغ ہے جہاں وہ اپنی چھوٹی سی عمر میں سیب توڑتی پھر رہی ہے اور ایسی ہی اور بہت سی تصویریں۔ پھر وہ فرش پر گر پڑتی ہے اور اس کی پیشانی خاک آلود قالین پر ڈھلک آتی ہے۔ یک بارگی وہ اُٹھ کر بیٹھ جاتی ہے اور اُن پھٹے ہوئے نوٹوں کو جمع کرتی ہے۔ اس کے رُخساروں پر آنسو بہہ رہے ہیں۔)

لڑکی۔ شکست! اے میرے غریب وطن! شکست! .... ایک شلنگ!

(دفعتہً چمکتی ہوئی چاندنی میں وہ اپنی پوری طاقت سے ایک پُرسوز اور رنج و الم میں ڈوبا ہوا نوحہ گانے لگتی ہے ——— اور باہر لوگ گاتے ہوئے گزر رہے ہیں):-

"برطانیہ زندہ باد"

(پردہ گرتا ہے)

ہمایوں (ستمبر سنہ ۴۳ء) ——— جون گولز وردی

محبّت اور جسمانی لذّت

فاش اگر گویم، جہاں برہم زنم

نہیں میرے دوست، اس کا ذکر نہ کرو۔ تم مجھ سے جس چیز کے طالب ہو مجھے اس سے نفرت اور کراہبت ہے، یہ تو ایسا ہے گویا خُدا ——— کیونکہ خُدا پر میں ایمان رکھتی ہوں ——— ہر نفیس شے کے ساتھ ایک کریہہ چیز کا تعلق پیدا کرکے اُسے ستیاناس کردینا چاہتا ہے، خُدا نے ہمیں محبت عطا کی جو دُنیا کی مقدّس ترین شے ہے، لیکن یہ دیکھ کر کہ وہ ہمارے لئے ضرورت سے زیادہ حسین اور عمدہ ہے، اسے ہماری گھناؤنی، شرمناک اور حیوانی بغاوت پر آمادہ کردینے والی حِسیّات کا خیال آگیا۔ چنانچہ اس نے جسمانی ناپاکیوں کو طنزیہ طور پر ہمارے ساتھ وابستہ کردیا۔ اس نے ان حِسیّات کو اس طرح ترتیب دیا ہے کہ ہم محبت کا ذکر بھی شرمندہ ہوئے بغیر نہیں کرسکتے اور محبّت کی باتیں کرنی چاہیں تو وہ سرگوشی کے لہجے میں کرنی پڑتی ہیں۔ اور وہ جو دہشت ناک حرکت ہم کر بیٹھتے ہیں وہ شرم و حیا کی پوٹ ہے۔ اور چاہے یہ چھپی ہی رہے، لیکن یہ ہماری روحوں میں منافرت پیدا کردیتی ہے اور آنکھوں کو ندامت سے جھکا دیتی ہے، اخلاق اسے حقارت سے دیکھے، قانون اس کی مذمّت کرے، پر یہ اپنی تکمیل تاریکی ہی میں کرتی ہے گویا یہ کوئی مجرم ہے۔

مجھ سے ایسی بات پھر کبھی نہ کہنا، ہرگز نہ کہنا!

مجھے نہیں معلوم مَیں تم سے محبّت کرتی ہوں یا نہیں، ہاں اتنا جانتی ہوں کہ تمہارا قرب مجھے مسرور کرتا ہے، تمھاری نگاہیں مجھ پر اثر کرتی ہیں اور تمھاری آواز میرا قلب پیار سے چمکارتی ہے۔ جس دن بھی میں نے اپنا جسم تمھاری خواہش کے مطابق تمھارے حوالے کردیا۔ تم میرے لئے مجسمۂ نفرت بن جاؤ گے اور وہ نازک زنجیر جو ہم دونوں کو جکڑے ہوئے ہے ٹوٹ جائے گی۔ علاوہ ازیں رُسوائی کی ایک وسیع خلیج بھی ہمارے درمیان حائل ہوجائے گی۔

آؤ، ہم ایسے ہی رہیں جیسا کہ اب تک رہ چکے ہیں، اور.......... اگر تم چاہو تو مجھ سے محبّت کئے جاؤ، میں تمھیں اجازت دیتی ہوں۔

تمھاری رفیق جینی ویڈ

"محترمہ، مجھے بھی اجازت دیجئے کہ مَیں آپ سے صاف صاف الفاظ میں کہہ سکوں:—

مجھے بھی نہیں معلوم کہ میں آپ کو چاہتا ہوں یا نہیں۔ مجھے تو اس کا یقین صرف اُس چیز کے بعد ہوگا جس سے آپ کو کراہیت ہے۔

انتہائی تنفّر اور دہشت کا احساس تو صرف اسی وقت ہوتا ہے جب کہ ہمارے خون کی دیوانگی نے ہمیں وقتی ہیجان کی ڈگر پر لا ڈالا ہو، لیکن اگر وہ عورت

ایک ایسی ہستی ہے جسے ہم نے ہزاروں میں منتخب کیا ہو اور وہ بے حد دل کش ہونے کے علاوہ اس قابل ہے کہ اس کے حاصل کرنے کی آرزو کی جائے (جیسا کہ آپ میرے لئے ہیں) تو پھر محبت کی جسمانی لذت لابدی ہو جاتی ہے، مکمل، اور غیر محدود مسرت کا سرچشمہ!

یہ جسمانی لذت، اے خاتون، محبت کا ثبوت ہے، اگر یہ جذبہ پُرجوش ہم آغوشی کے بعد فنا ہو جائے تو بیشک ہم اپنے آپ کو دھوکا دے رہے ہیں لیکن اگر یہ اور زیادہ ہو جائے تو ہماری محبت یقیناً سچی ہو!

ایک فلسفی نے جو اپنے اصولوں پر خود کاربند نہیں تھا، ہمیں فطرت کے اس دام سے خبردار کیا ہے۔ اس کا قول ہے کہ فطرت زندگی میں تنوع چاہتی ہے اور اس لئے کہ وہ ہم کو نت نئی زندگی پیدا کرنے کے لئے مجبور کرتی رہے اور ہم اس کے دام میں پھنسے رہیں، اس نے محبت اور لذت کا چوگا اس میں لگا دیا ہے، وہ کہتا ہے "جیسے ہی ہم اپنے آپ کو اس کے سپرد کر بیٹھتے ہیں اور وقتی جنون سر سے اُتر جاتا ہے ہم پر قنوطیت چھا جاتی ہے، کیونکہ ہم اُس جال کو جس نے ہمیں پھانس لیا تھا، سمجھ جاتے ہیں اور اس مستور اُکسانے والے راز کو جان لیتے ہیں، جس نے باوجود ہماری فرزانگی کے، ہمیں اُس لمحے میں عقل و ہوش سے محروم کر دیا تھا۔"

اور یہ سچ ہے، اکثر ایسا ہی ہوتا ہے، بعد میں ہم خود ہی نفرت کرتے ہیں۔ مگر فطرت نے تو فتح پالی اور ہمیں ہماری مرضی کے خلاف اُس فعل پر آمادہ کر لیا جو وہ چاہتی تھی۔

ہاں، میں اُن سرد وحشیانہ بوسوں سے واقف ہوں جو اجنبی لبوں پر دئے جاتے ہیں اور جذبات سے مملو اُن نگاہوں سے بھی جو کسی نے نہ اس سے پہلے دیکھیں اور نہ بعد میں دیکھ سکے گا۔ المختصر میں وہ سب کچھ جانتا ہوں جو ہمارے دلوں پر چرکہ لگا دیتا ہے۔

لیکن اگر محبت کے سحاب نے دو انسانی ہستیوں کو گھیر لیا ہو، اس طرح کہ وہ مدت دراز تک بلکہ ہمیشہ ایک دوسرے کا تصور کرتے رہتے ہوں، اگر جدائی اُن کو شب و روز تڑپاتی رہتی ہو، محبوب کی چاہت، اور اس کی مسکراہٹ ہر وقت اُن کے پیش نظر رہتی ہو، اگر تنہائی میں وہ ایک دوسرے کے سوا کچھ اور سوچ تک نہ سکتے ہوں تو کیا پھر بھی یہ قدرتی نہیں کہ آخرکار آغوشیں وا ہو جائیں، لب ایک ہو جائیں اور جسم واصل ہو جائیں؟

کیا آپ کو پیار کرنے کی آرزو کبھی نہیں ہوئی؟ مجھے بتائیے، کیا لب لبوں کو نہیں پکارتے اور کیا نظریں جو ہماری رگوں تک میں سرایت کر جاتی ہیں انتہائی اور ناقابلِ ضبط آرزوئیں برانگیختہ نہیں کر دیتیں؟

آپ جو کہتی ہیں کہ یہ ایک جال ہے۔ شرمناک جال، اچھلیے یہ سچ ہی ——— لیکن اس میں حرج کیا ہے؟ ——— میں بھی یہ جانتا ہوں، مگر اسے بُرا نہیں سمجھتا، فطرت نے اپنی عیاری چھپانے کے لئے ہمیں محبت عطا کر دی ہے تاکہ ہم ——— اپنی مرضی کے خلاف سہی ——— افزائش نسل پر مجبور ہو جائیں۔ اگر آپ پسند کریں تو آئیے ہم اس

محبت کو اپنا کر ذرا بہتر بنالیں۔ علوی اور مثالی! بلکہ جتنا کچھ فطرت ہم کو سکھا سکتی ہے اُس سے ذرا زیادہ ہی کر گزریں۔ یاد رکھئے محبت کا لمس ایک بیش بہا دھات کی طرح ہے جو ابھی ابھی کان سے نکالی گئی ہو۔ آیئے اس پر محنت کر کے ہم اس کو مجلّیٰ کر دیں۔ اُس ہستی کی چھپی ہوئی مرضی کو دنیا میں لائے بغیر جسے آپ خدا کہتی ہیں، آیئے خاتون! ہم اسے اس کی تمام حیوانیت، ناپاکی اور اس کے کریہہ سے کریہہ تخیل سمیت مثالی بنادیں۔

آیئے عشق کی اُس جسمانی لذت سے، جو ہم میں سنسنی پیدا کر دیتی ہے، ہم اس طرح محبت کریں جیسے ہم پرانی شراب اور خوشبودار پھلوں سے محبت کرتے ہیں۔ ہمیں جسم سے یقینی محبت کرنی چاہیے، کیونکہ یہ خوبصورت ہوتا ہے، گورا، سڈول، شیریں! لبوں اور ہاتھوں کے لئے باعثِ لذت!

محترمہ، شرم کا سبق معلمِ اخلاق کیلئے اور احتیاط کا سبق ڈاکٹروں کیلئے چھوڑ دیجئے اور ان چھوٹے شاعروں کی بھی پروا نہ کیجئے، جو فریب میں مبتلا ہونیکی وجہ سے روحوں کے پاک اتحاد اور روحانی مسرت کے گیت گاتے ہیں، اور نہ اُن مُلّاؤں کا کچھ خیال کرنے کی ضرورت ہے جو احکام و اوامر کی دھمکیاں سناتے رہتے ہیں، آیئے ہم محبت کی اس جسمانی لذت کی قدر کریں جو ہمیں مدہوش کر دیتی ہے، دیوانہ بنا دیتی ہے۔ کمزور کر دیتی ہے، تھکا دیتی ہے اور شادابی بخشتی ہے جو خوشبو سے زیادہ سرور آگین، نسیم سے زیادہ ہلکی اور زخموں سے زیادہ تیز ہے، جو مردوں کو سربسجود کرا دیتی ہے اور جس کی بدولت وہ سربہادرانہ فعل کر گزرتے ہیں۔

آیئے ہم محبت کریں —— لیکن قانع، مناسب اور جائز نہیں بلکہ ایسی جو طوفانی ہو، جذباتی ہو اور قید و بند سے آزاد! آیئے ہم بغیر کسی ہچکچاہٹ کے اس کی جستجو کریں اور اسی میں اپنی زندگی ختم کر دیں۔

محترمہ۔ لیجئے میں آپ کو ایک ایسی حقیقت سے آگاہ کئے دیتا ہوں جو آپ کو کتابوں میں نہیں ملے گی — اس دنیا میں خوش و خرم عورتیں صرف وہی ہیں جن کے گرد و پیش محبت کی جسمانی لذت کی کمی نہیں، ان کی زندگی میں تفکرات اور تکلیف دہ خیالات نہیں ہیں، ان کو کسی شے کی آرزو ہی نہیں ہوتی، سوائے ایک اور بوسے کے جو ایسا ہی شیریں اور تسلّی بخش ہو جیسا کہ پہلا!

اور وہ عورتیں جن کی زندگی میں جسمانی لذت اوسط درجے کی ہے، اور یا ایسی جس سے اُن کی تسلّی نہیں ہوتی، ان کو دُکھ اور پریشانیاں ہر وقت گھیرے رہتی ہیں۔

لیکن وہ عورتیں جن کے لئے یہ لذت کافی و وافی ہے، وہ کسی شے کی محتاج نہیں، انھیں کسی چیز کی خواہش ہوتی ہے نہ رنج۔ وہ سرزمینِ خواب میں رہتی ہیں، مطمئن اور مسکراتی ہوئی، انھیں شاذ و نادر ہی ان چیزوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے جو دوسروں کے لئے ناقابلِ تلافی تباہیوں کا باعث ہیں، کیونکہ لذتِ محبت انھیں سب کچھ دے دیتی ہے اور ان کے زخموں پر پھایا رکھتی ہے۔ میں اس سے بھی زیادہ لکھ سکتا تھا ......"

ہنری

یہ دونوں خطوط، جو جاپانی چاول کے کاغذ پر لکھے ہوئے تھے، ایک جیبی روسی کتاب میں رکھے ہوئے کل اتوار کو ہاتھ آئے!

ننگ وناموس

کھانے سے فارغ ہوکر باتوں باتوں میں تضیع حمل کا ذکر آگیا، کیونکہ ایک ایسا ہی واقعہ ابھی چند روز ہوئے کہیں قرب وجوار میں پیش آیا تھا۔ بیگم نواب الدولہ جو دولت مند ہونے کی وجہ سے پارسائی کی بھی علمبردار تھیں، تڑخ کر بولیں "لاحول ولا میری تو سمجھ میں نہیں آتا کہ اس لڑکی نے، جسے وہ قصائی کا لڑکا لے بھاگا تھا اپنے بچے کو کوڑے پر کیسے پھینک دیا۔ توبہ! اور وہ غریب مرا ہوا بھی تو نہیں تھا۔"

ڈاکٹر نے جواباً اس واقعے کی خوفناک تفصیل سنائی۔ وہ اس بدنصیب ماں کی ہمت پر انگشت بہ دنداں تھا جو بچے کو جننے کے بعد اسے جان سے مارنے کے لیے یک وتنہا دو میل تک پیدل چلی آئی۔

"عورت کا عزم آہنی تھا!" ڈاکٹر نے کہا "بلکتے ہوئے بچے کو سینے سے لگائے جنگل میں مارے مارے پھرنے میں اسے کس قدر اذیت ہوئی ہوگی! میرے تو اس خیال سے ہی رونگٹے کھڑے ہوئے جاتے ہیں! کیا آپ کو اندازہ ہوسکتا ہے کہ اس وقت اس بے چاری کے دل پر کیا بیت رہی ہوگی۔ اُف! یہ زندگی کس قدر گھناونی اور قابلِ نفریں ہے! کتنی بیہودہ پابندیاں عاید ہیں ہم پر! انہیں تو بیہودہ ہی کہوں گا۔ عصمت وناموس کا بے معنی نظریہ! جو خود جرم سے زیادہ گیا گزرا ہے! تصنع سے پُر تصورات، عزت وتوقیر کے کریہہ تخیلات، اور بغاوت پر آمادہ کرنے والے جذبات! ——— یہی تو وہ چیزیں ہیں جن کی بدولت بے بس لڑکیاں زندگی کی اس پکار پر عمل کرکے جس کی سرتابی ممکن نہیں، بچے کا گلا گھونٹنے پر مجبور ہوجاتی ہیں۔ یقیناً یہ انسانیت کی پیشانی پر کلنگ کا ٹیکہ ہے کہ اس نے اخلاق وناموس کا ایسا اندوہ ناک معیار قائم کیا، اور دو انسانوں کے فطری ملاپ کو ایک ناقابلِ معافی جرم قرار دیا ہے۔"

بیگم نواب الدولہ چڑ گئیں "تو ڈاکٹر! آپ کی رائے میں بدی نیکی سے بہتر اور ایک حسن فروش عورت ایک عصمت مآب خاتون سے افضل ہے؟ یعنی ایک وہ عورت جو اپنے نفس کی غلام ہے اس پاکباز بیوی کی برابری کی مستحق ہے جو اپنے ضمیر کے مطابق اپنے فرائض ادا کئے جاتی ہے؟"

ڈاکٹر جس نے زندگی کے بیسیوں نشیب وفراز دیکھے تھے، الفاظ پر زور دے کر کہنے لگا "خاتون! آپ ایک ایسے معاملے پر گفتگو کر رہی ہیں، جس کے متعلق آپ بالکل لاعلم ہیں، کیوں کہ آپ نے اپنے میں کبھی وہ بے پناہ ہلچل محسوس نہیں کی جو انسان کو بے قابو کردیتی ہے۔ لیجئے میں آپ کو ایک تازہ واقعہ سناتا ہوں جس کا میں خود عینی شاہد تھا۔

آہ خاتون! آپ انسانی سرشت سے واقف نہیں۔ بے شک وہ لوگ بدنصیب ہیں جن میں فطرت نے ہیجانی جذبات ودیعت کئے ہیں۔ سیدھے سادے

آدمی جن کے جذبات میں کبھی طوفان بپا نہیں ہوتا، وہ تو خود ہی شریفانہ زندگی بسر کریں گے۔ بھلا جن لوگوں کو دیوانہ بنا دینے والی خواہشات اپنی بھڑکتی ہوئی آگ میں نہیں جھلسا دیتیں، ان کو پاکباز رہنے میں کیا دقت پیش آسکتی ہے؟ متوسط طبقے کی لاغر عورتیں جو جوانی کی سرمستی سے محروم ہوں بیشک دوسری عورتوں کے گناہوں کا حال سُن کر کانوں پر ہاتھ دھریں گی۔

آپ اپنے آرام دہ بستر میں نہایت پُرسکون اور گہری نیند سوتی ہیں، کیونکہ آپ کے دل و دماغ پر کوئی غیر معمولی شے چھائی ہوئی نہیں ہوتی۔ آپ جیسے دوسرے لوگ اپنے احساسات کی اعتدال پسندی کی بدولت بُرائیوں سے محفوظ رہتے ہیں۔ آپ کو شیطانی رغبتوں سے بس ایک ذراسی کشمکش کرنی پڑتی ہے اور صرف آپ کا دل شیطانی خیالوں سے لذت یاب ہوتا ہے، لیکن آپ کا جسم فوراً ہی اپنی تسکین کے لیے نہیں مچل جاتا ـــ مگر وہ لوگ جن کی فطرت بے انتہا طوفانی ہے ان کی خواہشات اور جذبات کو قابو میں نہیں کیا جا سکتا۔ کیا آپ ہوائی یا سمندری طوفان پر قابو پا سکتی ہیں؟ کیا کبھی قدرت کے کارخانوں کو بند کیا جاسکتا ہے؟ نہیں۔ تو پھر ہم اپنے حواس اور خواہشات پر کیسے قابو پا سکتے ہیں، کہ یہ بھی تو قدرت کے کارخانوں اور طوفانِ باد و باراں کی طرح ہیں جن کو مغلوب نہیں کیا جاسکتا۔ یہ مَردوں کے پیر ڈگمگا کر ان میں ایک ایسے تلذذ کے حصول کی چینک پیدا کر دیتے ہیں جس کا رد کرنا ممکن نہیں۔ یہی حال عورتوں کا ہے۔ اور جو عورتیں ثابت قدم رہ جائیں ان میں جذبات اور حس ہی نہیں۔ مانتا ہوں کہ ان کی تعداد زیادہ ہے مگر ان کی پارسائی قابلِ تعریف نہیں۔ کیوں کہ ان میں کشمکش کا مادہ ہی نہیں ہوتا۔ اور جو عورتیں نفس پرست ہیں وہ کبھی پاکباز نہیں ہوسکتیں۔ وہ تو پیدا ہی عیش و عشرت کے لئے ہوتی ہیں۔ ان کے اعضا آپ کے اعضا جیسے نہیں ہوتے۔ ان کا گوشت پوست آپ سے مختلف ہوتا ہے۔ زیادہ حساس! دوسرے جسم سے مس ہو کر جلدی شعلہ زن ہو جانے والا! اور آپ کو جب تک کچھ محسوس بھی نہیں ہوتا، ان میں اس وقت تک ہیجان بپا ہو کر ان کو مغلوب بھی کر لیتا ہے۔

کاش آپ کو احساسات اور جذبات کی شدّت کا اندازہ ہوتا! جب جوانی کی آگ ایک دفعہ بھڑک جائے تو ساری ساری رات انسان آتش زیرپا رہتا ہے۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکتا ہے اور پاگل بنا دینے والے خواب اسے شب بھر ستاتے ہیں۔ یاد رکھئے! جن لوگوں میں حس نہیں ہوتی، ان کا خون سرد ہوتا ہے۔ اور وہ دوسروں سے حسد کرتے ہیں۔ ہاں وہ قصہ یہ ہے:

ایک عورت ـــ جسے میں ہیلن کہوں گا ـــ بچپن سے ہی نفسانی خواہشات کا شکار تھی۔ شاید آپ کہیں کہ یہ کیفیت تو مرض کی سی ہے لیکن کیوں؟ کیا یہ مرض نہیں کہ کسی میں شہوانی جذبات سرد ہوں؟ خیر جب وہ بارہ سال کی ہوئی تو مجھ سے مشورہ لیا گیا اور میں نے معائنہ کرکے یہ نتیجہ مرتب کیا کہ وہ بالغ ہو چکی ہے، اور نفسانی خواہشات اس کے ہوش و حواس ٹھیک نہیں رہنے دیتے۔ خود اس کے بشرے سے یہ سب کچھ ظاہر ہوتا تھا۔ اس کے ہونٹ موٹے اور پکے ہوئے پھل کی طرح رسیلے تھے، گردن مضبوط، جلد گرم ناک لمبی، نتھنے چوڑے اور حساس، اور آنکھوں میں

اس غضب کی نیلاہٹ کو دیکھنے سے مَردوں کے جذبات برانگیختہ ہوجائیں۔ بھلا ایسی حیوانیت سے بھرپور ہستی کو کون سکون آشنا کرسکتا ہے؟ وہ تمام رات کسی نامعلوم شے کے لئے رو رو کر گزار دیتی تھی۔ اسے ایک مرد کی ضرورت تھی، جس کے نہ ہونے سے وہ ایک ناقابلِ بیان عذاب میں مبتلا تھی۔ آخر پندرہ سال کی عمر ہی میں اس کی شادی کردی گئی۔ دو سال بعد اس کا شوہر سِل کا شکار ہو کر چل بسا، کیوں کہ اس کی زندگی ہیلن کی جوانی کی نذر ہوگئی۔ یہی حشر دوسرے شوہر کا اٹھارہ ماہ بعد ہوا۔ تیسرا شوہر چار سال زندہ رہا۔

اب اس نے کوشش کی کہ بیوگی میں پارسا رہے۔ وہ آپ کی طرح سوسائٹی کے قایم کردہ اخلاقی معیار کی حامی تھی۔ ایک دن اس نے مجھے بُلایا۔ کیونکہ اس کو بار بار دورے اُٹھ رہے تھے۔ میں نے فوراً تاڑ لیا کہ اس کا تجرّد اس کی جان کا لاگو ہے، اور یہ میں نے اس سے کہہ بھی دیا۔ وہ ایک معزز عورت تھی۔ اس لئے باوجود ذہنی اذیت اور میرے مشورے کے اس نے یہ پسند نہیں کیا کہ وہ کسی اور سے جنسی تعلق رکھے۔ لوگ کہتے تھے کہ وہ پاگل ہوگئی ہے۔ رات رات بھر وہ جنگلوں میں ماری ماری پھرتی تھی، تاکہ اپنے باغی جسم کو تھکا ڈالے، یہاں تک کہ اس پر غشی کے دورے پڑنے لگے اور اس کی حالت متذبذب ہوجاتی۔ وہ ایک خاموش اور تنہا مقام پر رہتی تھی، اور قریب ہی اس کی ماں اور دوسرے رشتے داروں کے مکانات تھے۔ میں کبھی کبھی اس کے ہاں جو آتا تھا۔ مگر افسوس قدرت کی ستم ظریفی اور ہیلن کی مرضی کے درمیان جو جنگ ہو رہی تھی اس کو ختم کرنے کا کوئی علاج میری سمجھ میں نہیں آتا تھا۔

ایک شب کوئی آٹھ کا عمل ہوگا، میں کھانا کھا کر اٹھا ہی تھا کہ وہ آئی اور تنہائی میں لے جا کر کہنے لگی "—— آہ! میں کہیں کی نہ رہی .... میں ماں بننے والی ہوں"

میں فرطِ حیرت سے اس کا مُنھ تکنے لگا۔ "ہیں؟"

"میں ماں بننے والی ہوں"!

"تم"

"ہاں۔ میں"

پھر یک بارگی اس نے پریشان اور دُکھ بھرے لہجے میں کہنا شروع کیا "اپنے مالی ہی سے مجھے حمل ہوا ہے، ڈاکٹر! پائیں باغ میں ٹہلتے ہوئے مجھے غشی سی محسوس ہوئی۔ مالی مجھے گرتے ہوئے دیکھ کر بھاگا آیا اور اندر لے جانے کے لئے اس نے مجھے اپنی آغوش میں اٹھا لیا۔ اور میں نے کیا کیا؟ یہ مجھے یاد نہیں۔ شاید میں اس سے چمٹ گئی اور اس کے لبوں میں اپنے لب پیوست کردیے۔ آپ کو تو میرے شرمناک مرض کا علم ہے ہی۔ مختصر یہ کہ میں نے اپنے آپ کو اس کے سپرد کردیا۔ مجرم میں ہی ہوں۔ کیوں کہ میں نے خود ہی اپنے آپ کو اگلے دن بھی اس کے سپرد کردیا، اور پھر دوسرے موقعوں پر بھی، کیونکہ اب ضبط کرنا میرے بس میں نہیں تھا"

وہ سسکیاں لیتی ہوئی پھر کہنے لگی "اسی نے مجھے ایک بچّے کی ماں بنایا ہے۔ میں آپ سے بغیر کچھ چھپائے سارا اعتراف کر رہی ہوں —— میں نے اسقاطِ حمل کی بہت کوشش کی۔ میں نے کھولتے

ہوئے پانی میں غسل کیا۔ میں نے بغیر زین کسے ہوئے گھوڑے پر سواری کی، میں نے کسرتیں بھی کیں، دوائیں تک کی استعمال کر ڈالیں، لیکن کسی طرح میں کامیاب نہ ہو سکی۔ آپ میرے والد اور بھائیوں سے واقف ہیں۔ ہائے میں تو کہیں کی نہ رہی۔ میری بہن ایک شریف آدمی سے منسوب ہے۔ آہ! میری یہ آوارگی ان سب پر اثر انداز ہوگی۔ ہمارے عزیز و اقارب، ہمارے ملنے جلنے والے اور ہمارے پڑوسی کیا کہیں گے میرے باپ کی عزت خاک میں مل جائے گی:۔۔۔ اور بے چاری ماں۔۔۔۔۔!"

وہ روتی رہی۔ میں نے اس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیے۔ اور کچھ دیر باتیں کرنے کے بعد اسے صلاح دی کہ کہیں سفر پر چلی جاؤ تاکہ بچہ یہاں سے کہیں دور پیدا ہو۔

اس نے میری بات پوری نہیں سنی اور "ہاں ہاں۔۔۔۔۔۔ ٹھیک ہے" کہتی ہوئی چلی گئی۔

میں اس سے کئی بار ملنے گیا۔ وہ پاگل ہوئی جا رہی تھی۔ اس بچے کا خیال جو اس کے پیٹ میں روز بروز بڑھ رہا تھا، اور جسے وہ اپنے شرمناک افعال کا جیتا جاگتا نتیجہ تصور کرتی تھی، اس کے دماغ میں ایک مسموم تیر کی طرح سمایا ہوا تھا۔ اور اس کے ذہن سے ایک لمحے کے لیے بھی محو نہیں ہوتا تھا۔ آخر کار اس نے روز روشن میں کہیں آنا جانا اور ملنا ملانا ترک کر دیا۔ کہ کہیں اس کا یہ نفرت انگیز راز فاش نہ ہو جائے۔ ہر شب وہ ایک قدِ آدم آئینے کے سامنے برہنہ ہو کر اپنے بے ڈول پیٹ کو دیکھا کرتی اور پھر پیٹ کے بل زمین پر گر گر پڑتی۔ اس سے اس کو بے انتہا تکلیف ہوتی مگر وہ تولیہ منہ میں ٹھونس کر اپنی چیخوں کو بلند نہ ہونے دیتی تھی۔ رات میں بیس بیس دفعہ وہ بستر پر سے اٹھ بیٹھتی اور آئینے میں اپنے بے ہنگم پیٹ کو دیکھ کر ہوش و حواس کھو کھو دیتی۔ جنون کی حالت میں وہ اپنے پیٹ پر مکے مارتی تاکہ وہ ننھی سی جان جس نے اس کی جان پر بنا رکھا تھا، مر جائے۔ دونوں کے درمیان ایک خوف ناک جنگ جاری تھی مگر بچہ کسی طرح نہ مرتا تھا۔ وہ پیٹ میں بار بار حرکت کرتا۔ گویا اپنے تحفظ کی کوشش کر رہا ہے۔ وہ کبھی زمین پر زور زور سے پیٹ کے بل گرتی تاکہ بچہ کچل کر رہ جائے، اور کبھی اپنے پیٹ پر بھاری بھاری بوجھ اٹھا کر رکھ لیتی کہ شاید اسی طرح بچے کا دم گھٹ جائے۔ وہ اپنے بچے سے ایسی سخت نفرت کرتی تھی جیسے کوئی اپنے کسی خون آشام دشمن سے کرتا ہے۔

اپنے بچے سے چھٹکارا پانے کی ان تمام کوششوں میں ناکام رہنے کے بعد اس پر آئے دن دیوانگی کے دورے پڑنے لگے اور وہ مایوسی و خوف کی حالت میں اکثر باہر کھیتوں میں بے تحاشا بھاگنے لگتی تھی۔ ایک صبح لوگوں نے دیکھا کہ وہ ندی کے کنا ــــ بے طرح پڑی ہے۔ اس کے پاؤں پانی میں تھے، اور اس کی آنکھوں میں پاگل پن کی جھلک تھی۔ انھوں نے سوچا کہ اس پر کوئی دورہ پڑ رہا ہے لیکن اصل تہ کو کوئی نہ پہنچ سکا۔ وہ تو لگاتار اس کوشش میں غلطاں و پیچاں تھی کہ کسی طرح اس بدنصیب بچے کو جو گناہ کی پوٹ ہے اپنے جسم سے علیحدہ کر دے۔

ایک دفعہ اس کی ماں نے اس سے ہنس کر کہا "ہیلن! تم آج کل بڑی موٹی ہو رہی ہو! اگر تمھارا

شوہر زندہ ہوتا تو میں سمجھتی کہ تم ماں بننے والی ہو۔"
ان الفاظ نے یقیناً اس پر پورا پورا اثر کیا ہوگا، جب ہی تو وہ وہاں سے فوراً اپنے گھر چلی آئی اور اس کے بعد کیا ہوا؟ شاید اس نے اپنے بڑھتے ہوئے پیٹ کو پھر دیکھا ہوگا اور پھر اسے مارا ہوگا، کچلا ہوگا، دے دے پٹکا ہوگا، جیسا کہ وہ ہر رات کرتی تھی۔ آخر اس نے ایک بڑا چھرا نکالا، چار شمعیں روشن کیں اور آئینے کے سامنے ایک بیت کی کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس وقت اس کا دماغ مختلف خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ اس ثمرۂ گناہ اور خوفناک ہستی کو نکال کر جان سے مار ڈالے اور اپنے جسم سے کہیں دور پھینک دے۔ چنانچہ گھن کھاتے ہوئے اور خشمناک ہو کر اس نے اس جگہ کو ٹٹولا جہاں وہ متحرک معلوم ہوا تھا، اور ایک ہی وار میں اپنا پیٹ چیر ڈالا۔

بیشک اس نے اپنا کام بڑی پھرتی اور کامیابی سے سرانجام دیا، کیونکہ اس نے اپنے دشمنِ جانی کو آخر پکڑ ہی لیا جو اب تک اس کے قبضے میں نہ آسکا تھا۔ اس نے اس کی ایک ٹانگ پکڑلی اور باہر کھینچ کر چاہا کہ سامنے کے آتش دان میں پھینک دے۔ لیکن وہ ابھی چند آنتوں وغیرہ میں الجھا ہوا تھا جنھیں وہ نہیں کاٹ سکی اور پیشتر اس سے کہ وہ سمجھ لیتی کہ اس بچے کو اپنے جسم سے علیحدہ کرنے کے لئے ابھی اس کو اور کیا کرنا ہے اس کی روح پرواز کر گئی، اور اس کی لاش خون میں لت پت، اپنے بچے کے اوپر گر پڑی۔ ...... تو خاتون

—— کیا آپ کے خیال میں وہ واقعی بدکردار عورت تھی؟"
ڈاکٹر خاموش ہو گیا اور جواب کا انتظار کرنے لگا۔
مگر بیگم نواب الدولہ سے جواب ہی کیا بن پڑ سکتا تھا۔

کلیم (مئی ۳۹ء) —————— گائی دے، موپسان

پلنگ

میں نے نیلام میں سے ایک خوبصورت مجسمہ خریدا لیکن جب اُسے اٹھانے لگا تو میں نے محسوس کیا کہ اس کے نیچے کچھ کاغذات ہیں۔ دیکھا تو خطوط تھے۔ تین میں صرف جائے ملاقات کا ذِکر تھا، چوتھا یہ ہے :—

میرے دوست! —— میں بیمار ہوں، سچ مچ بیمار، اور اتنی کہ پلنگ سے اٹھ بھی نہیں سکتی۔ بارش کے قطرے دریچوں سے ٹکرا رہے ہیں اور میں شال اوڑھے نرم و گرم بستر پر آرام سے لیٹی ہوئی ہوں۔ میرے پاس ایک کتاب ہے جسے میں بے حد پسند کرتی ہوں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس میں کچھ میرا ہی تذکرہ ہے۔ تمھیں بتاؤں یہ کیا کتاب ہے؟ نہیں، تم مجھے خواہ مخواہ بُرا بھلا کہو گے۔

میرے پیچھے تکیے لگے ہوئے ہیں جن سے ٹیک کر میں بیٹھ جاتی ہوں، اور اس وقت میں یہ خط اُس ننھی سی میز پر رکھ کر لکھنے بیٹھی ہوں جو تم نے مجھے تحفتاً دی تھی۔

تین روز سے پلنگ پر پڑے پڑے میں بہت کچھ پلنگ ہی کے متعلق سوچنے لگی ہوں بلکہ نیند میں بھی میرا طائرِ خیال اسی کے گرد پرواز کرتا ہے۔ اور میں اب اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ پلنگ ہماری تمام زندگی کو محیط کیے ہوئے ہے کیونکہ ہم پیدا اسی پر ہوتے ہیں، پھر زندگی کا لطف اسی پر اٹھاتے ہیں اور آخرکار اسی پر دُنیا سے سدھارتے ہیں۔ اگر میرے قلم میں ایک کہنہ مشق انشا پرداز کی سی طاقت ہوتی تو میں پلنگ کی تاریخ تحریر کرتی اور بھلا کون سا ایسا پُرجوش اور دہشت ناک، خوش کن اور ولولہ انگیز پہلو ہوتا جو اس کتاب میں قلم بند ہونے سے رہ جاتا؟ اور ایسا کون شخص ہوتا جو اس سے اخلاقی درس حاصل نہ کرتا؟

تم میرے پلنگ سے واقف ہو میرے دوست، لیکن تم یہ خیال نہیں کر سکتے کہ مجھے ان دنوں اس سے متعلق کیا کیا نئی باتیں سُوجھی ہیں اور مجھے اس سے کس قدر محبت پیدا ہو گئی ہے!

آہ! میں ان لوگوں کی ذہنیت نہیں سمجھ سکتی جو نئے پلنگ خریدتے ہیں۔ بھلا یہ نئے پلنگ کس کام کے جو نہ کسی کی نشانیاں ہیں اور نہ جن سے کوئی یادوابستہ ہے؟ میرا (بلکہ ہمارا کہنا چاہیے) یہ پلنگ جو اس قدر جھلنگا مگر کشادہ ہے بہت سی جانوں کا، پیدائش سے لیکر موت تک حائل رہا ہوگا۔ ذرا اس پر غور تو کرو میرے دوست! ان زندگیوں پر ایک سرسری تبصرہ تو کر جاؤ جن کا بڑا حصہ ان جہاں دیدہ چارپایوں کے حلقے میں گزرا ہے۔ تمھیں معلوم ہے ان چارپایوں نے اس تین سو سال کے عرصے میں جب سے ان کو اس طرح جوڑ کر پلنگ بنایا گیا ہے، کیا کیا دیکھا ہوگا؟

پہلے ایک نوعمر لڑکی کا تصور ذہن میں آتا ہے جو اس پلنگ پر لیٹی ہوئی ہے۔ وہ کراہ رہی ہے اور کبھی کبھی

اس کی چیخیں بہت بلند ہو جاتی ہیں۔ اس کی ماں اس کے پاس ہے۔ چند دن یونہی گزر کر ایک نئی ہستی جھریوں اور سکڑی ہوئی کھال میں ملفوف بلّی کی طرح میاؤں میاؤں کرتی عالمِ وجود میں آجاتی ہے۔ یہ لڑکا ہے جو اس کے ہاں پیدا ہوا ہے، اور یہ نوجوان ماں باوجود سخت اذیت کے خوشی سے پھولی نہیں سماتی۔ بچے کی پہلی چیخ سن کر خوشی سے اس کا سانس گھٹنے لگتا ہے اور وہ اپنے ہاتھ اس کی طرف بڑھا دیتی ہے اور وہ جو اس کے گرد ہیں مسرت کے آنسو بہانے لگتے ہیں کیونکہ اس گوشت کے لوتھڑے سے خاندان کا نام چلے گا اور اُن بڑے بوڑھوں کی نسل دُنیا میں باقی رہے گی جو اب تک کسی بات سے خائف، اس گھڑی کے منتظر تھے۔

اور پھر ان دو محب و محبوب کا تصور کرو جو زندگی کے اس معبد میں پہلی مرتبہ یک جا ہوئے ہیں۔ اُن میں یکپی پیدا ہو گئی ہے اور وہ مسرت میں بے خود ہیں۔ ایک دوسرے سے اس قدر نزدیک ہو کر انھیں جو لذت حاصل ہو رہی ہے اُسے کون بیان کر سکتا ہے؟ اور دیکھو، آہستہ آہستہ ان کے لب آپس میں ملتے جا رہے ہیں۔ یہ مقدس بوسہ ان دونوں کو ایک جان کر دیتا ہے اور سچ پوچھو تو یہ بوسہ جو ارضی فردوس میں داخل ہونے کا نقیب ہے اور انسانی جذبات و سرمستیوں کا امین، اور جس میں بے شمار عہد و پیمان پنہاں ہیں ان کے لئے یہی سب کچھ ہے۔ آخر کار ان کے پلنگ میں طغیانی سے بپھرے ہوئے سمندر کی طرح ہلچل مچ جاتی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خود اس میں بھی زندگی اور مسرت کی بے پناہ موجیں رہ رہ کر اُٹھ رہی ہیں کیوں کہ اس پر محبت کا جنون انگیز راز شرمندۂ تکمیل ہو رہا ہے آخر دنیا میں اس ہم آغوشی سے زیادہ اور کون سی شے مکمل اور قابلِ ترجیح ہو سکتی ہے جس کا نتیجہ ایک تیسری ہستی میں ظاہر ہوگا اور جو محب و محبوب دونوں کے دلوں میں بہ یک وقت ایک ہی خیال پیدا کرتی ہے، ایک ہی توقع، ایک ہی آپے سے باہر کر دینے والی کیفیت اور ایک ایسی سرخوشی جو ان پر آسمانی اور نگل جانے والے شعلوں کی طرح نازل ہوتی ہے۔

اور پھر میرے دوست، اُن لوگوں کی دل ہلا دینے والی موت کا لرزہ خیز تصور کرو جنھوں نے اس پلنگ پر دم توڑا ہے کیونکہ یہ پامال اور ٹوٹی ہوئی آہوں کا مقبرہ بھی تو ہے اور ایک ایسا دروازہ بھی جو کبھی دنیا میں داخل ہونے کا راستہ تھا مگر اب کائنات کی ہر شے پر ہمیشہ کے لئے بند ہو گیا ہے۔ کتنی چیخیں، کتنی کرب و بے چینی، کتنی تکلیفیں اور کتنی آہیں اس پلنگ سے بلند ہو چکی ہیں! ماضی میں کتنی آغوشیں یہاں وا ہوئی ہوں گی! کتنی سرخوشی و سرمستی یہاں طاری ہوئی ہوگی جو اب ہمیشہ کے لئے معدوم ہو چکی ہے! عالمِ جانکنی میں پتھرائی ہوئی آنکھوں اور بدشکل ہونٹوں کے علاوہ اور کون کون سی اذیتیں ہوں گی جو اس پلنگ پر اس تین سو سال کے عرصے میں (عجب ہے کہ یہ پلنگ انسانی ہستیوں کے لئے جائے پناہ ہونا شروع ہوا ہے) جسدِ خاکی کو نہ پہنچی ہوں گی!

یاد رکھنا! پلنگ زندگی کی تشبیہ ہے۔ دنیا میں کوئی اور شے اس جیسی عمدہ نہیں ہے اور کیا واقعی ہمارے چند بہترین مہینے سوتے میں نہیں گزرتے؟ لیکن

پھر ہم دُکھ بھی تو پلنگ ہی پر اٹھاتے ہیں! وہ جو بیمار اور تکلیفوں کا شکار ہیں اسی میں پناہ لیتے ہیں، اور تھکے ماندے جسموں کے لئے اس سے بہتر آرام اور سکون کی جگہ ہو بھی کیا سکتی ہی؟

اس وقت اور بہت سے خیالات میرے دماغ میں آرہے ہیں مگر کیا یہ ضروری ہی کہ میں ان سب کا اظہار کر ہی دوں؟ اور پھر میں تھک اس قدر گئی ہوں کہ میں اب تھوڑی دیر سو جانا چاہتی ہوں لیکن کل تین بجے تم مجھ سے ملنے ضرور بالضرور آؤ، شاید میں بہتر ہوں اور مجھ سے مل کر تمھیں خوشی ہو۔

خدا حافظ، میرے دوست! یہ لو میرے ہاتھ تمھارے پیار کرنے کے لئے حاضر ہیں اور میں تمھیں اپنے لب بھی پیش کرتی ہوں۔

رومان (جنوری ۳۸ء نمبر ۱) ——— گے دی موپساں

نغمۂ فردوس

"آخر نیند کے ماتے ایک طویل خوش گوار خواب کے بعد بیدار ہوجائیں گے۔ اور ان کا گھر اس کثیف دنیا کی بجائے جنّت الفردوس میں ہوگا۔ جہاں دُور، بہت دور کوئی لطیف اور سہاونی آواز نغمہ ریز ہوگی۔۔۔۔۔۔"

مریض نے یہ الفاظ بہ آواز بلند کہے۔ پھر کروٹ لے کر آنکھیں کھول دیں، اور اپنے معالج کی سرد اور روکھی نظروں کو دیکھا جو گھڑی ہاتھ میں لئے، جھکا ہوا اس کا مطالعہ کر رہا تھا۔

ڈاکٹر نے آنکھیں میچتے ہوئے کہا "ہوشیار ہو! نبض دیکھیں!"

مریض نے کلائی آگے بڑھا دی۔

"ٹھیک ہے۔ نہ جانے ابھی آپ بحران میں کیا بک رہے تھے، مسٹر ڈینور"!

ڈینور کے چہرے پر ایک غمگین مسکراہٹ آئی اور وہ آہِ سرد بھر کر بولا "واقعی؟ میں تو شاید خواب دیکھ رہا تھا ــــــ" وہ ذرا رک گیا اور پھر اپنا فقرہ پورا کیا "جنّت کے متعلق!"

ڈاکٹر نے گھڑی جیب میں رکھ لی اور اپنی ٹوپی اور دستانے اٹھانے کے لئے مڑا! "ہوں"! وہ رکھائی سے کہنے لگا "خواب اکثر ہوتے تو دل چسپ ہیں۔ مسٹر ڈینور! ابھی اس دوا کو جاری رکھئے، اس سے آپ کے درد میں افاقہ ہوگا۔ فی الحال اس سے زیادہ کچھ نہیں کیا جاسکتا۔ ذرا آپ میں طاقت آجائے تو پھر آپریشن کا سوچیں، اس وقت تو جراحی غیر مفید رہے گی۔"

ڈینور کی گہری، اُداس آنکھیں اس پر جم گئیں "ڈاکٹر صاحب! ذرا ٹھہریئے۔ میں آپ سے ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں۔ مجھے سرسام نہیں ہے میں بالکل اپنے آپ میں ہوں۔ میرے ہوش و حواس بجا ہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ مرض لاعلاج ہے۔ سرطان دیر یا سویر، ضرور میرا خاتمہ کردے گا۔ لیکن آپ بھی تو فانی ہیں۔ ایک وقت آئے گا کہ آپ بھی اسی راستے پر گامزن ہوں گے جس پر میں چل رہا ہوں۔ میری کشتی کنارے آلگی ہے۔۔۔۔۔ جھوٹی تسلی تشفی دے کر مجھے دھوکے میں رکھنے سے کچھ فائدہ نہیں۔ مجھے آپ ایمانداً یہ بتا دیجئے کہ آپ کا دوزخ جنت پر اعتقاد ہے؟"

ڈاکٹر نے صاف صاف جواب دیا "اگر جنّت سے آپ کی مراد کوئی مافوق الفطرت شے ہے تو قطعی نہیں۔ انسان کے لئے جنّت کے صرف یہی معنی ہیں کہ دل و دماغ میں کچھ ایسے احساسات پیدا ہوں جن کی لذت سے اس پر مسرت طاری ہوجائے۔ اسی لئے مثل مشہور ہے کہ جنّت کوئی مقام نہیں، بلکہ ایک ذہنی کیفیت ہے"۔

ڈینور نے آہستگی سے پوچھا "پھر تو آپ کی رائے میں موت کے بعد انفرادی یا شعوری زندگی ناممکن ہے"

ڈاکٹر زچ ہو گیا۔ ویسے بھی وہ بہت بڑا ڈاکٹر تھا۔ بیسیوں امراء اس کے زیرِ علاج تھے "یہ سوال آپ پادری سے کیجئے۔ میں اس مسئلے پر کچھ نہیں کہہ سکتا۔ میں نے تھوڑی سی سائنس پڑھی ہے۔ اس لئے میں صرف یہ جانتا ہوں کہ موت مریض اور تھکے ہوئے انسان کا قدرتی انجام ہے، اور جب وہ مر جاتا ہے تو پھر اس کی کسی قسم کی بقاء حیات کا ذرہ بھر امکان نہیں۔"

جون ڈینور نے اسے نگاہ بھر کر دیکھا۔ پھر قدرے رُک کر بولا "آپ پڑھے لکھے آدمی ہیں، ڈاکٹر صاحب! آپ کو معلوم ہونا چاہئے تھا۔ میں ہمیشہ سے جاہل ہوں لیکن جب لڑکپن میں میں پیٹ پالنے کے لئے کانوں کی گہرائی میں کام کرتا تھا اور رات کی تاریکی میں کبھی کبھی مجھے تاروں سے جھلملاتے ہوئے آسمان کو دیکھنے کا موقع ملتا تو میں سمجھتا تھا کہ وہیں جنت ہے اور خدا ان تاروں کے کہیں بیچ میں رہتا ہے۔ بے شک یہ خیال واہیات تھا۔ مگر کاش اب بھی میرے وہی اعتقادات ہوتے اور میں یہ روحانی کرب آسانی سے سہہ لیتا۔"

ڈاکٹر تنگ آگیا۔ یہ داستان اس کے لئے پرانی تھی۔ بہت سے مریض اس سے اس قسم کی گفتگو کرکے اسے پریشان کر دیا کرتے تھے اور جون ڈینور اگر غریب ہوتا تو وہ حسبِ معمول اس کی بات کا جواب تک نہ دیتا لیکن لکھ پتی لوگ ڈاکٹروں کے دام میں روز روز تھوڑی پھنستے ہیں۔

"آپ پادری کو کیوں نہیں بلا لیتے؟" اس نے پوچھا "شاید وہ آپ کا اعتقاد پھر ویسا ہی کر دے۔"

ڈینور نے افسوس ناک لہجے میں جواب دیا "پادری؟ اس کو ارضی آرام و آسائش کی فکر سے فرصت ہی کہاں جو وہ سماوی لطف و انبساط کا خیال کرے۔ آخری بار جب وہ مجھ سے ملا تو اس نے گڑگڑا کر کہا کہ آپ اپنی وصیت میں کچھ اثاثہ گرجے کے لئے بھی وقف کر دیجئے۔ کہنے لگا "مجھے یہ سُن کر افسوس ہوا کہ آپ کا مرض لاعلاج ہے۔ مگر مجھے یقین ہے آپ کی یہ خواہش ضرور ہو گی کہ آپ کی تھوڑی سی دولت اُس قادرِ مطلق کے کام آجائے۔"

گویا انسان کی دولت واقعی خالقِ موجودات کے کام آسکتی ہے! نہیں ڈاکٹر صاحب! میں جس آزمائش میں مبتلا ہوں، پادری اس میں کوئی مدد نہیں دے سکتے۔ میں سب کچھ خود ہی برداشت کروں گا۔ مجھے اب آپ کو زیادہ نہیں ٹھیرانا چاہئے۔ خدا حافظ۔"

ڈاکٹر جلدی سے دروازہ بند کرکے باہر نکل گیا۔ وہ خوش تھا کہ اُسے اس مجذوب کی بڑ سے چھٹکارا مل گیا ہے۔

جون ڈینور اب اکیلا رہ گیا تھا۔ تنہائی سے گھبرا کر اس نے وسیع کمرے میں نظر دوڑائی جس کے ٹھاٹھ امیرانہ تھے۔ سامنے کے ایک دریچے میں سے اُسے دُور دُور تک پھیلے ہوئے سرسبز و شاداب باغات نظر آئے جو اس کی ملکیت تھے۔ پھر ہوتے ہوتے اگلی پچھلی تمام باتیں اس کی نگاہوں کے سامنے پھر گئیں۔ اُسے وہ وقت یاد آگیا جب وہ موجودہ دولت و امارت کے حصول کے لئے اپنا خون پسینہ ایک کرتا اور محنت و استقلال سے کبھی جی نہ چُراتا تھا۔ پھر خدا نے اُسے چھپر پھاڑ کر دولت دی اور سان نہ گمان، ایک روز اسے کسی خام چاندی کی کان کا پتہ چلا جس نے اُسے دُنیا کے امیر ترین لوگوں کی صف میں لا کھڑا کیا اور جب سے روپے کی ریل

پیل ہوئی، سوسائٹی کی جھوٹی چمک دمک اور مطلبی دوستوں نے اُسے آگھیرا۔ پھر اُسے اُس خوبصورت دوشیزہ کا خیال آیا جس سے اس نے شادی کر لی تھی ـــــ ـــــ وہی دوشیزہ جس نے اُسے یقین دلایا تھا کہ میں تم پر جان و دل سے فدا ہوں لیکن شادی ہوتے ہی اس نے کینچلی بدل لی اور اپنی اصلیت پر آ گئی، یعنی ایک فیشن پسند اور دولت پرست عورت! جس کے لئے سوسائٹی والوں کی خوشنودی سے بڑھ کر کوئی چیز اہم نہیں تھی اور جس کا دل دولت کے بوجھ سے دب کر پتھر سے زیادہ سخت ہو گیا تھا۔ پھر وہ اپنی اولاد کے متعلق سوچنے لگا۔ مگر ان میں سے بھی کسی کو اس سے کبھی ہمدردی یا بے غرض محبت نہیں ہوئی ـــــ ایک لڑکا تھا جو اسے صِرف اپنے اخراجات کا کفیل سمجھتا تھا، ایک لڑکی تھی جو ہر وقت منچلے نوجوانوں میں رہا کرتی تھی تاکہ کسی خطاب یافتہ نوجوان کو پھسلا کر اپنا شوہر بنالے اور جسے یہ احساس نہیں تھا کہ اس کا باپ ایک لاعلاج مرض میں گرفتار بسترِ مرگ پر پڑا ہے۔ ان تمام تکلیف دہ باتوں کی یاد سے اُسے بڑا صدمہ ہوا اور اس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے "اے خدا! میں نے اپنی زندگی میں کیا کمایا؟ اور اگر موت لابدی ہے تو زندگی کا مقصود کیا ہے؟"

دروازے پر کسی نے دستک دی اور پیشتر اس سے کہ وہ اسے اندر آنے کی اجازت دیتا، ملاقاتی خود بخود کمرے میں آ گیا اور اس نے مدھم، شیریں لہجے میں کہا: "میرا خیال تھا۔ تم اس وقت تنہا ہی ہو گے: جون ڈینور! مجھے باغ میں تمہاری بیوی ملی تھیں انھوں نے بتایا کہ ڈاکٹر ابھی ابھی تم کو دیکھ کر گیا ہے۔"

ڈینور نے آہستہ سے اثبات میں گردن کو جنبش دی۔

اس وقت وہ بڑی تکان محسوس کر رہا تھا۔ یوں بھی وہ اپنے اس عجیب و غریب دوست کے سامنے بہت کم زبان کھولتا تھا۔ اور واقعہ یہ ہے کہ پال واسکی جس پر لوگ دہشت پسند روسی ہونے کا شبہ کرتے تھے غیر معمولی وجاہت اور رعب داب کا آدمی تھا۔ مزید برآں اُس کے بشرے میں کچھ ایسے مقناطیسی اثرات پنہاں تھے کہ بہت سے لوگ اس کشش کے زیرِ اثر اس کی طرف کھنچے چلے آتے تھے اور بعض اس سے دُور ہی رہنے میں عافیت سمجھتے تھے۔ وہ پست قد اور زرد رو تھا لیکن اس کی سبزی مائل آنکھیں اس کے چہرے کے لئے بے پناہ حُسن کا خزانہ تھیں جن سے ناظر کبھی مسحور ہوئے بغیر نہ رہتا۔ اس نے ڈینور کو دیکھا۔ اس کی نظروں میں حد درجے رحم اور ہمدردی تھی۔

"تو زندگی کا چراغ گُل ہو چلا ہے! سب کو ایک دن یہاں سے جانا ہوگا!" واسکی نے محبت بھری آواز میں کہا "لیکن زندگی میں بہت سی چیزیں موت سے بدتر ہیں"

ڈینور کے لبوں پر مُہرِ خاموشی لگی ہوئی تھی

اس کا ملاقاتی قدرے ٹھیر کر بولا "تمھیں موت عزیز نہیں ہے۔؟ مقبرے کی تنہائی اور خاموشی تم پسند نہیں کرتے؟ تم کچھ بے چین معلوم ہوتے ہو۔ مگر تم تو بہادر ہو ـــــ تم کو موت سے نہیں ڈرنا چاہیے"

ڈینور نے استقلال سے جواب دیا "نہیں۔ میں نہیں۔ میں تو بس ـــــ متاسف ہوں!"

"متاسف؟ کیوں؟"

"اس لئے کہ میں نے اپنی زندگی کی قدر نہیں کی۔

میرا سارا وقت صرف دولت جمع کرنے میں گزرا اور اس کا نتیجہ؟ ——— ایک فتح باطل، ایک مضطرب کن نفع، کیونکہ میری گاڑھی کمائی میرے کام نہیں آئی، یہ دھن دولت میرے مرض کا علاج نہیں کر سکتی نہ اس سے موت کو پرے دھکیلا جا سکتا ہے، اور پھر بد قسمتی سے۔" وہ رُکا اور آہ سرد بھر کر کہنے لگا" مجھے کسی کی محبت و ہمدردی بھی تو حاصل نہیں۔ دیکھ لو، میں یہاں اپنی بدنصیبی کو بھگتنے کے لئے تن تنہا پڑا ہوں۔ پھر کیوں نہ مجھے مرنے کا افسوس ہو! اس خوبصورت دُنیا سے جانے کا مجھے سخت رنج ہے۔ اس نیلے آسمان اور چمکدار دھوپ سے عنقریب محروم ہو جانے کا بڑا قلق ہے ——— " دفعتًا اس نے بات کا رُخ بدلا " لیکن پال! اگر مجھے تمھاری طرح حیات بعد الموت کا یقین ہو جائے اور جو خواب میں نے ابھی گھنٹہ بھر ہوا دیکھا تھا، حقیقت ہو تو پھر مجھے مرنے کا کوئی افسوس نہیں، بلکہ خوشی ہوگی۔"

واسکی نے ہمدردی سے استفسار کیا " کون سا خواب؟ کیا دیکھا تھا تم نے؟"

" میں نے دیکھا کہ میں جنت میں ہوں۔" ڈینور کا بے چین بشرہ روحانی وجدان سے چمک اُٹھا " لیکن اس جنت میں نہیں جس کا ذکر پادری کرتے ہیں، وہ جگہ تو اس دنیا سے ملتی جلتی تھی۔ ہاں اس سے زیادہ وسیع اور حسین ضرور تھی۔ مجھے یہ محسوس ہوا کہ میں یکایک گہری نیند سے بیدار ہوا ہوں، اور جب میں جاگا تو مجھے ایک سہانی آواز سنائی دی ——— ایسی آواز جس سے زیادہ لطیف اور شیریں آواز کا تصور ناممکن ہے ——— معلوم نہیں وہ رُوح پرور نغمہ کون گا رہا تھا، مگر پال مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں اس نادیدہ مغنی کو جانتا اور چاہتا ہوں!"

پال دریچے کے پاس رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا تھا یہ سُن کر وہ کھڑا ہوا اور اس کے پلنگ کے قریب آکر اُس نے اپنا کانپتا ہوا ہاتھ اس کے پہنچے پر رکھ دیا۔

" تو تم نے دوسری دُنیا کی آواز سُن لی ہے، میرے دوست! پال نے اس کی نظر اپنی بے پناہ اور پُر سحر نگاہوں سے گرفت میں کرلی" اور پھر بھی تمھیں شبہ ہے! تم جانتے ہو کہ بعض اوقات غیر مرئی دنیا کے پردے میری آنکھوں کے سامنے سے اُٹھ جاتے ہیں۔ لوگوں نے مجھے ساحر روحانی اور خبطی سمجھ رکھا ہے کیونکہ مجھ پر وہ راز منکشف ہو جاتے ہیں۔ جن تک ان معمولی دنیاداروں کی پہنچ نہیں ہوتی۔ لیکن مجھے اُن کی کیا پروا ہے؟ موت کے وقت میری روح کو سکون و اطمینان ہوگا اور ان لوگوں کی مادیت خوف وہراس سے تھرائے گی۔ جو آواز تم نے سُنی ہے، کیا وہ اس جیسی تھی ——— ؟"

اس نے ایک ہاتھ بلند کر کے ہلایا ——— اور دُور بہت دُور، نغمے کی ایک کرن پھوٹی، دھیمی، شیریں اور صاف، گویا آسمان سے بارش غنا ہو رہی ہے۔

ڈینور چونک پڑا " بار الٰہا! یہ تو وہی ہے ——— بالکل وہی! پال! اس کا کیا مطلب ہے؟"

واسکی نے سمجھا سمجھا کر کہا " اس کا یہ مطلب ہے، میرے دوست! کہ تم دوام و بقا کے کنارے آ پہنچے ہو اور مجھے، جو ایک معمولی واسطہ ہوں حکم دیا گیا ہے کہ تم کو اس حقیقت کا یقین دلا دوں۔ جو جنت تم نے خواب میں دیکھی وہ اصلی ہے جو آواز تم نے سنی وہ واقعی ہے۔ اور مغنی تمھارے انتظار میں ہے تاکہ وہ تمام محبت

جس سے تم اب تک اپنی زندگی میں محروم رہے ہو، تم پر نچھاور کر دے۔ تم چاہے مجھ پر اعتبار کرو یا نہ کرو، لیکن میں جو کچھ کہہ رہا ہوں وہ سچ ہے۔ فانی انسان جس شے کو موت کہتے ہیں وہ تم کو ایسی بے پایاں مسرت عطا کرے گی جو انسانی ذہن اور اندازے سے باہر ہے، لیکن اس کے ساتھ مجھے یہ بھی کہہ دینا چاہئے کہ تمھیں انتخاب کا حق حاصل ہے۔ جو کچھ میں نے تمھیں بتایا اُسے جانتے ہوئے بھی تم یہ فیصلہ کرنے کے لئے بالکل آزاد ہو کہ تم موت کو پسند کرو یا زندگی کو ترجیح دو۔"

حیرت سے ڈینور کی آنکھیں، کھلی کی کھلی رہ گئیں "تم تو پہیلیاں بجھواتے ہو، ہاں! زندگی کو ترجیح دوں؟ میں؟ میری تقدیر تو طے ہو چکی ہے، میرا وقت تو آیا چاہتا ہے۔ مانا کہ تم ماہر روحانیات ہو لیکن تم کر کچھ نہیں سکتے۔ موت کو بھلا تم کیسے ٹال دوگے؟"

والسکی نے اٹل انداز میں کہا "تم اگر زندگی کو پسند کرو، تو تم زندہ رہو گے! میں اس کا ذمہ لیتا ہوں' کیونکہ مجھے اس کا حکم ملا ہے۔ سرطان تمھیں موت کے گھاٹ نہیں اُتارے گا اور نہ کوئی اور بَلا تمھارا رشتۂ حیات منقطع کرے گی۔ لیکن اگر میں تمھاری جگہ ہوتا تو میں موت کو زندگی پر ترجیح دیتا۔"

اس نے آہستہ سے کانپتی ہوئی آواز میں پوچھا "تم —— میری زندگی کا وعدہ کرتے ہو؟ اگر میں جینا چاہوں تو کیا مجھے اس کی مہلت مل جائے گی؟"

"ہاں، ضرور۔ میں اس کی قسم کھاتا ہوں! میں آج اسی غرض سے تو تمھارے پاس آیا تھا۔ مگر فیصلہ کرنے سے پہلے خوب غور کر لو —— آخرت کے دروازے ایسے میں تمھارے استقبال کو کھلے ہوئے ہیں۔ اگر تمھاری ہی مرضی سے یہ بند ہو گئے تو جو آواز تم نے سُنی ہے، پھر کبھی نہ آئے گی۔"

ڈینور کی پُر تجسس اور متعجب نگاہیں اپنے دوست کے زرد چہرے کا جائزہ لینے لگیں جس کی آنکھوں میں غیر معمولی چمک اور روشنی پیدا ہو گئی تھی۔ وہ خالی الذہن ہو گیا۔ آخر یہ اَن ہونی بات کیسے مان لے؟ لیکن معاً اُسے خیال آیا کہ والسکی کے متعلق بے شمار روحانی روایات مشہور ہیں۔ نیز اس کے پُر ایقان اندازِ گفتگو سے متاثر ہو کر اس نے ایکا ایکی فیصلہ کر لیا اور جھٹ بول اٹھا۔

"میں جیوں گا —— کیا خبر آخرت محض خیال و خواب ہو۔ کون جانے وہ سہانی آواز جس نے میرے دل پر قبضہ کیا، فریب ہو! اس کے مقابلے میں یہ دنیا سچ مچ کی ہے۔ قابلِ لمس ہے۔ یہاں ہم چلتے پھرتے ہیں سانس لیتے ہیں، سوچ بچار کرتے ہیں جب تک میرے بس میں ہے، میں تو یہیں رہوں گا! اگر تم میں واقعی وہ طاقت ہے جو بظاہر معلوم ہوتی ہے تو مجھ پر صَرف کرو اور مجھے زندگی دے دو —— یہ زندگی! یہی میرا انتخاب ہے، جنت نہیں بلکہ دنیا! میں زندہ رہنا چاہتا ہوں!!"

والسکی آہستگی سے، اس کے بستر سے پرے ہٹ گیا اور اس نے حقارت و ہمدردی کی ملی جلی نظروں سے ڈینور کو سرتاپا دیکھا۔ "یہی سہی"۔ اس نے جواباً کہا "بس تو زندہ رہو اور کوشش کرو کہ اس زندگی میں خوشی، سکون اور محبت میسر آجائے۔ میرے دوست! افسوس تم نے غلط انتخاب کیا! تم نے آفات سے لبریز جہان میں آکر جلیل المرتبت حقیقت کو ٹھکرایا ہے۔ خیر، جب تم اپنے انتخاب سے تنگ آجاؤ،

تو مجھے اطلاع کر دینا۔ اچھا اب خدا حافظ!"

دروازہ آہستہ سے بند ہوگیا ——— وہ جاچکا تھا۔

جون ڈینور کئی گھنٹے تک آنکھیں کھولے بے حس و حرکت پڑا رہا۔ اپنے اس عجیب و غریب ملاقاتی کی حیرت ناک گفتگو اس کو شروع سے آخر تک بار بار یاد آتی رہی اور وہ سوچنے لگا، کیا یہ سچ ہے کہ مجھے زندگی کی ایک اور مدت عطا کر دی گئی ہے، یا وہ اسکی محض شیخی بگھار کر گیا ہے۔

تھوڑی دیر بعد وہ طویل نیند کے آغوش میں دُنیا و مافیہا سے غافل ہوگیا۔

اگلے روز وہ بیدار ہوا تو اس کے درد کو آرام تھا اور ایک ہفتے کے اندر اندر وہ اس قابل ہوگیا کہ پلنگ سے اُٹھ کھڑا ہو اور روزمرّہ کے کام سرانجام دے لے۔ وہ بڑا ڈاکٹر، جو اس کے علاج سے مایوس تھا، اس کی صحت یابی سے حیرت میں رہ گیا۔ اب پتہ چلا کہ اسے سرطان کی کوئی تکلیف نہیں تھی۔ گویا ایک بار پھر ثابت ہوگیا کہ بڑے سے بڑے معالج کی تشخیص بھی غلط ہوتی ہے۔ واسکی کے وعدے کے مطابق ڈینور موت کے منہ سے واپس آگیا، لیکن زندگی کے اس نئے عرصے میں اس کی آنکھوں نے کیا کیا دیکھا؟ ——— اس کے بیٹے کو کسی شخص کے جعلی دستخط کرنے کے جرم میں قید ہوئی۔ اس کی بیٹی نے ایک نام نہاد نواب سے شادی کی جو حد درجے بدمعاش، شرابی اور جواری تھا۔ اس کی بیوی بیوفا نکلی، کیونکہ اسے تو اس کی موت کی تمنا تھی، اب اس کی تطویلِ حیات سے اس کے ارادوں پر پانی پھر گیا۔

اس سے زیادہ یہ کہ ڈینور نے خون پسینہ ایک کر کے کمائی ہوئی دولت کو مطلبی "دوستوں" اور نمک حرام ملازموں پر لٹایا اور لُٹاتا گیا، حتیٰ کہ اس کی آنکھیں کھلیں اور اسے اپنے ہی ہم جنسوں کی جھوٹی خوشامد، کمینہ پن اور خودغرضی کا پورا پورا احساس ہوگیا۔ گویا بس یہی اس نئی زندگی کے تحفے تھے۔

سات سال اسی طرح بیت گئے۔ ایک شام وہ اکیلا اپنے وسیع و شاندار کتب خانے میں بیٹھا ہوا افکار میں غلطاں و پیچاں تھا اور اس کی نظریں باہر چاندنی میں ملفوف سبزے پر جمی ہوئی تھیں، کہ وہ سوچنے لگا "ہائے یہ عرصۂ حیات بھی ناکام اور بے فائدہ گزرا!"

اور اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے چشمے اُبل پڑے۔ "کاش! میں جنّت کا پھر خواب دیکھوں اور بیدار ہو کر وہی حسین و محبوب نغمہ ایک بار اور سُنوں!"

معاً اس نے قلم اٹھایا اور پال واسکی کو مندرجۂ ذیل سطور لکھیں:-

"رفیقم ——— تم نے مجھ سے کہا تھا کہ جب میں اس زندگی سے تنگ آجاؤں تو تمھیں مطلع کر دوں۔ تو سُنو، میں اس جینے سے بیزار ہوگیا ہوں۔ اس زندگی نے مجھے کچھ نہیں دیا اور تم نے جو کچھ کہا تھا وہ حرف بحرف سچ نکلا۔ بیشک میرا انتخاب غلط تھا۔ ..... اگر تم جنّت کے معتقد ہو تو خدارا مجھے بھی اس کا یقین دلا دو! جو آواز میں نے اُس دن سُنی تھی اگر وہ حقیقی ہے، اگر یہ اس کی ہے جو رحیم، صادق اور رحمان ہے، تو کیا میں اسے اب کبھی نہ سُن سکوں گا؟ تم پر بہت سے رازہائے سربستہ منکشف ہیں، بہت سے اعتقادات واضح ہیں۔ اگر یہ تطویل حیات تمھارے ہی باعث

ہوئی ہے، تو میں تم سے التجا کرتا ہوں کہ اپنی عنایت واپس لے لو اور مجھے اسی دوام و بقا کے کنارے چھوڑ دو، جہاں میں سات سال پہلے پہنچ گیا تھا، اور جہاں سنہرے دروازے میرے لئے وا تھے!"

کئی دن گزر گئے۔ اس کی بے چینی اور بے صبری روز بروز بڑھنے لگی آخرکار جواب آیا جس سے اس کی پُرشور طبیعت قدرے سکون آشنا ہو گئی۔ لکھا تھا۔

میرے دوست! جنت اب بھی ویسی ہی ہے۔ اندھے "دنیا داروں کی خاطر کہ وہ اس کے متعلق شبہ کرتے ہیں، اس نے اپنا نقشہ یا مقام نہیں بدلا جو سات سال تم نے گزارے وہ جنت والوں کے نزدیک محض سات لمحے ہیں —— یا اس نغمے میں جو تم نے سنا تھا، ایک ننھا سا وقفہ! مطمئن رہو —— جس رات تمھیں یہ خط ملے گا، وہی نغمہ پھر سنائی دے گا اور تم معنی سے واقف ہو جاؤ گے۔"

خط ہاتھ میں لئے، جون ڈینور خواب آلود نگاہوں سے کھڑکی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ دنیائے رنگ و بو غروب آفتاب کی گلابی روشنی میں نہائی ہوئی معلوم ہوتی تھی اور ایک بلبل ہزار داستان شمشاد کی ٹہنی پر جھولتی ہوئی نغمۂ شام الاپ رہی تھی۔ اس نے سنا۔ ایک غیر معین مسرت چھا چلی تھی۔ وہ بالکل تنہا تھا —— کیونکہ بہت عرصہ ہوا اس کی شریک حیات تک اسے چھوڑ کر اپنے کسی عاشق کے ساتھ چلی گئی تھی، یہ کیا؟ یہ تو عجیب و غریب احساس سرایت کر رہا ہے! وہ محسوس کرنے لگا کہ وہ دوئی میں رنگا جا رہا ہے گویا وہ، یعنی جون ڈینور تو محض چوکھٹا یا خول ہے کسی لائق شخصیت کا، جو اب تک تکالیف اور صعوبتیں اٹھانے کے لئے آب و گل میں مقید رہی، لیکن اس وقت آزادی اور مسرتِ بے پایاں حاصل کرنے کے لئے اس قید خانے کی زنجیریں ایک جھنکار کے ساتھ توڑ پھینکنا چاہتی ہے۔

اس نے نیم بلند آواز میں کہا "لیکن جنت اگر ہو بھی تو مجھے اس میں جانے کا کیا حق ہے؟ میں نے کوئی ایسا کارِ ثواب نہیں کیا جو اس کا مستحق بنوں۔ بیشک میں نے اپنی طرف سے ہمیشہ اچھا ہی کام کرنے کی کوشش کی۔ مگر اس سے کیا ہوتا ہے؟ یہ ٹھیک ہے کہ میں دنیا میں محبت سے محروم رہا، لیکن میں یہ توقع کیسے کروں کہ آخرت میں یہ مجھے حاصل ہو جائیگی؟ والسکی کہتا ہے کہ خدا کا کارخانہ مساوات پر قائم ہے اور ہر انسان کا جوڑا اُتارا گیا ہے۔ کسی کو اپنا رفیق یہیں مل جاتا ہے، کسی کو بعد الموت ملتا ہے۔ اگر یہ صحیح ہے —— اگر یہ صحیح ہو سکتا ہے تو پھر شاید خدا کے قانون کے مطابق جس میں کبھی تبدیلی نہیں ہوتی، مجھے وہی فردوسی نغمہ نواز مل جائے!"

عین اسی ساعت ایک دلنواز اور قلب کے پار ہو جانے والی آواز نے خاموشی کو توڑا، جس کی شیرینی کو دنیا کا کوئی ارگن یا برہ کی ماری بلبل بھی نہیں پہنچ سکتی اور جون ڈینور —— وہ دنیوی تفکرات سے تھکا اور مایوسیوں کا ستایا ہوا انسان —— ایکا ایکی سرو قد کھڑا ہو گیا، زرد رو اور متوقع اس نے گھبرا کر کمرے میں جمع ہونے والے بے شمار سایوں کو مشکوک نگاہوں سے دیکھا۔ دنیا اور دنیا کے منافع تو سراب ثابت ہوئے —— کیا آخرت کی امید بھی اسی طرح خیالِ خام ثابت ہو گی؟

خوشی میں آپے سے باہر ہوتے ہوئے اس کے

منہ سے نکلا" وہی نغمۂ مقدّس ہے! وہی محبوب نغمہ جسے میں نے پہلے سُنا تھا........ اور لو وہ پھر گونجا! ایسی شیریں آواز فریب نہیں دے سکتی۔ یہ قطعی خدا کی صداقت کا یقین دلا رہی ہے!"

اس نے آنکھوں پر زور دے کر، دم بدم بڑھنے والی تاریکی کو پھر دیکھا...... کہیں تخیّل تو کارفرما نہیں ہے؟ اور یا یہ سچ مچ کوئی فرشتہ ہے جس کی صورت حد درجے دلکش، تارے کی مانند تابناک اور محبت و معصومیت کی تصویر ہے؟ اس نے آپ ہی آپ اپنے ہاتھ بڑھا دئے ...... یہ استعجاب، یہ مسرتِ بے پایاں اس میں کہاں سے آ گئی؟

"یہ سچ ہے!" اس نے کہا" دنیا داروں کی تنگ نظری اور شکوک کے باوجود، خدا انصاف والا ہے اور جنت کا وجود ہے ـــــ محتاجوں، گنہگاروں اور جاہلوں تک کو روحانی تسکین عطا کی جائے گی! کیونکہ موت، موت تھوڑی ہے، یہ تو حیاتِ تازہ ہے!"

اس کے پاؤں لڑکھڑائے ـــــ اس کا تنفس اس کا ساتھ چھوڑنے لگا ـــ وہ کرسی پر گرا اور گرتے ہی اس نے آنکھیں بند کرلیں۔ الہامی آواز گونجتی رہی جس کی بے پناہ موسیقی کا سیلاب پیمانۂ سکوت کو لبریز کئے جا رہا تھا۔ وہ سُنتا رہا اور مسکرائے گیا۔

"طویل نیند کے بعد ہم جنّت میں بیدار ہونگے اور ایک حسین نغمہ ہماری روح کو محظوظ کرے گا۔" اس نے زیرِ لب کہا اور اس کے بعد وہ خاموش ہو گیا۔

ـــــ اور اس طرح جون ڈینور کو موت کی نیند آ گئی، اور اگر اعتقادات جنون و خبط نہیں ہوتے تو اسی طرح وہ بیدار بھی ہوا ہوگا۔

ادبی دُنیا (جولائی سنہ ۳۰ء) ـــــــــ میری کوریلی

نورِ الٰہی

"پھر خدا نے کہا، دُنیا نور سے معمور ہو جائے

——— اور دُنیا نور سے معمور ہو گئی"

رنگ برنگی بادل آہستہ آہستہ فضا میں تحلیل ہو گئے۔ کہر کی دبیز نقاب کائنات کے چہرے سے ہولے ہولے اٹھ گئی اور بڑے بڑے پہاڑ ہلکے نیلے آسمان کے پس منظر میں صاف اور خوشنما نظر آنے لگے۔ ان پر برف کے سفید تودے جمے ہوئے تھے۔ جس کی چرخ نیلوفری کوہستانی مقامات پر ازل سے بارش کرتا ہے۔ ان کی سرد بلند چوٹیاں سفید گالوں میں ملفوف ایسی معلوم ہوتی تھیں گویا ان تک پہنچنے کے لئے کئی منزلیں طے کرنی پڑینگی۔ لیکن جب تنویرِ فلک کی ایک کرن پھوٹی تو پہاڑوں کی مشرقی ڈھلان نور کی ایک وسیع و عظیم نہر میں نہا گئی اور اس کی نازک تمازت میں برف کی سخت چٹانیں پگھلنے لگیں اور ارغوانی گل ہائے بنفشہ قدسی فضا میں سانس لے کر آزادی و مسرت سے لہلہانے لگے۔

نور کی نہر اٹھلاتی ہوئی بہ رہی تھی۔

دو مرد، جواب تک تاریکی میں اپنی مسافت طے کر رہے تھے، اس کی جانب بڑھے۔ اس کی تلاش میں ان کو ریاضت کرتے ہوئے ایک عرصہ گزر گیا تھا۔ دور سے نور کی سنہری جگمگاہٹ دیکھ کر وہ تیز گامی سے لپکے اور بیک وقت بابِ تنویر میں داخل ہوئے۔ وہ دونوں ہم مذہب اور امارت و اعزاز میں برابر سرابر تھے لیکن یہاں پہنچتے ہی دونوں کے تیور بگڑ گئے اور ان کی رگ رگ میں خشم و بے اعتمادی شعلے بھڑکانے لگی۔

"تو یہاں کیوں آیا؟" ان میں سے ایک نے کہا،

"یہ نور میرا ہے!"

"پاگل تو نہیں ہوا؟" دوسرا، جواب تک بھرا بیٹھا تھا، غصے سے ہنکارا "کاذب کہیں کا۔ احمق، یہ نور تو میرا ہے!"

ان کے چہرے پر بدی و شیطنت کے نقوش زیادہ گہرے ہو گئے اور انھوں نے لڑائی کی ٹھان لی۔ ان کے ذہن سے اُتر گیا کہ سب انسان بھائی بھائی ہیں، اور ان میں ہاتھا پائی شروع ہو گئی۔ وہ غصے میں اندھے ہو رہے تھے، چنانچہ اس سحرناک نور کے ایک ٹکڑے کے لئے جو ان کی ملکیت نہیں تھا، وہ ایک دوسرے پر پل پڑے، یہاں تک کہ بنفشہ کے پھول جو سبزہ زار میں رقص کناں تھے۔ یہ انسانیت سوز منظر دیکھ کر مُرجھا گئے اور خون کی ندی میں جو اس بے دردی سے بہایا گیا تھا، سرنگوں ہو گئے۔

پھر یکایک ان کے درمیان ایک پرچھائیں نمودار ہوئی جس کا نام موت تھا۔ وہ دونوں سراسیمہ ہو گئے اور ایک دوسرے کو چھوڑ کر جان بچانے کے لئے بگٹٹ بھاگے، مگر پرچھائیں ان کا پیچھا کرتی رہی۔ آخر کار ان کا

پُرجوش لہو، سردِ بھوری مٹی میں مل گیا اور گلہائے رنگین پھر مسرت سے تالیاں بجانے لگے ——— ———
اور نورِ الٰہی پہاڑوں پر حسبِ سابق جگمگاتا رہا۔

———— ⁂ ————

پھر دو عورتیں اس دریائے نور کی جانب بڑھیں۔
ان میں سے ہر ایک کوئی عظیم المرتبت ملکہ تھی اور اس کا حسن و سنگھار دُور دُور تک بے مثال تھا۔ اس وقت بھی وہ سر سے پیر تک زر و جواہر میں سجی ہوئی تھیں اور ان کے بشروں سے شاہانہ وقار ٹپکتا تھا۔ وہ دونوں ایک نحیف و زار بچے کو گھسیٹتی ہوئی لا رہی تھیں جس کے بازو پر ننھے ننھے پَر لہرا رہے تھے اور جو تکلیف کے مارے تھر تھر کانپ رہا تھا۔ اس معصوم بچے کے مُنہ سے بُری طرح چیخیں نکل رہی تھیں اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی دم میں یہ اللہ کو پیارا ہو جائے گا۔ نور کی نہر کے کنارے پہنچ کر دونوں عورتیں رُکیں اور ایک نے دوسرے کو زہر میں بجھی ہوئی نظروں سے گھورا۔
"اسے چھوڑ دے! تیرا محبت پر کوئی بس نہیں ہے" ان میں سے ایک بولی "اب ہم منزلِ مقصود پر آگئے ہیں۔ قسم ہے اپنے حسنِ شرر فشاں کی! یہ نور اور محبت دونوں میرے ہیں!"
"او دغا باز!" دوسری نے جھلّا کر جواب دیا۔ "میری موجودگی میں تیرا حسن کس کام کا؟ میں دنیا کی حکمراں ہوں۔ محبت کا فرشتہ میرا غلام ہے اور نور میری وراثت!"
پھر وہی پرچھائیں نمودار ہوئی اور ان دونوں رقیب عورتوں کا خون خشک ہو گیا اور وہ فوراً غیر مرئی روحوں کی مانند تاریکی میں گم ہو گئیں۔ لیکن پروں والا بچہ اکیلا رہ گیا ——— روتا ہوا ———
اور نورِ الٰہی پہاڑوں پر پہلے کی طرح اپنے جلوے دکھاتا رہا۔

———— ⁂ ————

اب کے ایک برہنہ سر راہ گیر دریائے نور کی جانب بڑھا۔
وہ تنہا تھا اور کوئی ہستی اس کی رقیب نہیں تھی۔ وہ ٹھٹکا، نگاہ اونچی کی اور مسکرایا۔ اس کا تن لاغر اور تھکا ہوا تھا اور اس کی محنت ہمیشہ بے ثمر رہی تھی۔ اگرچہ اس کا چہرہ تفکرات کا آئینہ معلوم ہوتا تھا جس پر زردی کھنڈی ہوئی تھی، مگر وہ خوبصورت تھا۔ اس پر وجد طاری ہو گیا اور بے خودی کے عالم میں اس کے لبوں کو جنبش ہوئی۔
"یہی وہ نور ہے!" اس نے زیریں لہجے میں کہا "اے خدا! میں کیونکر تیرا شکر ادا کروں!"
اور **محبت کا فرشتہ** جو اکیلا پڑا رو رہا تھا اُس کے پاس چلا آیا اور اس نے اس کے قدموں کو بوسہ دیا۔
"اے شخص تو کون ہے؟" اس نے سسکیاں لیتے ہوئے پوچھا "معلوم ہوتا ہے تو عرصۂ دراز سے اس نور کی تلاش میں سرگرداں ہے اور یہاں تک پہنچنے کے لئے تو نے بڑے بڑے جتن کئے ہیں، لیکن تیری زبان پر حسد کا ایک لفظ نہیں، بلکہ تیری آنکھوں سے سکون اور شکرانہ ظاہر ہوتا! تو کون ہے؟"
اجنبی مسکرایا اور اس نے رُک رُک کر جواب دیا۔
"بچے! لوگ مجھ سے نفرت کرتے ہیں اور میرے وجود کو کوئی گوارا نہیں کرتا۔ اس بھری دنیا میں میری کوئی مِلک نہیں، کسی کی دُعا تک نہیں۔ تن تنہا

میں تمام عمر اس نور کی جستجو میں رہا اور آخر آج اسے پالیا۔ میں اس نور کے عطا کرنے والے کا اس لئے شکر بجالایا ہوں کہ اس نے مجھے نامراد و مایوس نہیں کیا۔ آہ! دنیا والوں کو میرے نام سے چڑ ہے۔ میرا نام **صداقت** ہے۔"

پھر وہی پرچھائیں نمودار ہوئی لیکن اس دفعہ وہ تاریک نہیں تھی بلکہ اس میں روشنی کے فوارے جھلل جھلل کر رہے تھے۔ تھکے ہوئے **صداقت** (کے فرشتے) نے نور کی نہر میں سے چند جرعے پیئے اور اس میں قوت عود کر آئی۔ محبت (کے فرشتے) نے بھی اپنے طفلانہ آنسو پونچھے، اور دور، بہت دور، سے ایسی دھیمی اور شیریں آواز آئی جیسے کسی گوشۂ فردوس میں فرشتے مل کر گا رہے ہوں ——— ——— اور خدا کا نور پہاڑوں پر سلسلے میں پھیل گیا۔

عصمت (فروری ۱۹۱۶ء) ——— میری کوریلی

نغمۂ رُوح

(۱)

کہیں دُور ــــ بہت دُور ......

ایک تاریک اور چمکیلے جزیرے میں جہاں دن اور رات طلوع اور غروب آپس میں گلے ملتے ہیں وہ ــــ یعنی حیاتی ــــ رہتی تھی ...... کیونکہ کرۂ ارض پر اس کا کوئی خاص مسکن نہیں تھا۔

ــــ لیکن انسان جب سن شعور کو پہنچتا ہے تو اسے یاد بھی نہیں رہتا کہ وہ کبھی ایسی جگہ رہا ہوگا ــــ اور یہی خیال ننھے پتیر کا تھا، جس کی عمر چار سال ہوگی۔

پتیر حیاتی سے غالباً بہت ہی کم سنی میں ملا ہوگا جب اس کو بولنا بھی نہیں آتا تھا اور سوائے بسورنے، ہاتھ پھیلانے، اور ہنسنے کے کچھ نہ جانتا ہوگا۔ زیادہ سے زیادہ وہ ان "سایوں" کو پکڑنے کی لاحاصل اور انتھک کوشش کر لیا کرتا ہوگا جو حال سے ماضی میں تبدیل ہو جایا کرتے ہیں۔

بہرحال سب سے پہلے اس نے چار سال ہی کی عمر میں اس سے گفتگو کی۔ وہ اس کو چاہتا تھا ــــ حیاتی کے فردوسی لباس کو، اس کی آسمانی مسکراہٹ کو اور اس کے حسین مکھڑے کو ــــ بس اس سے زیادہ وہ حیاتی کے متعلق اور کچھ نہیں جانتا تھا۔ رات کو سنسان کمرے کے ایک تنہا کونے میں وہ اس کو کھڑے ہوئے دیکھتا۔ حیاتی مسکراتی اور پتیر ہنسنے لگتا۔

بہتیرا منع کرنے کے باوجود پتیر اپنی ہنسی کو ضبط نہ کر سکتا تھا لیکن اس کی ماں اس کو مجبور کرتی کہ وہ سو جائے۔

ایک روز ماں نے پریشان ہو کر کہا "یہ تو کس سے باتیں کیا کرتا ہے"؟

پتیر اُسے جواب دیا "سفید لباس میں ...اماں! ایک حسین مکھڑے والی سے، جس کی آسمانی مسکراہٹ مجھے بے حد پسند ہے"۔

اس سے زیادہ وہ خود بھی نہیں جانتا تھا اور اس نئے دوست کے متعلق اس سے زیادہ وہ کچھ اور کہہ بھی نہیں سکتا تھا۔

(۲)

ایک صبح کو پتیر دفعتاً چیخا "کون ہے؟"

حیاتی صرف ہنس دی اور درختوں کے ایک جھنڈ میں گم ہو گئی۔ مگر کسی نہ کسی طرح اس کی نرم و نازک آواز نے اس کا نام بتا دیا اور وہ دیوانہ وار چیخنے لگا "پیاری حیاتی! پیاری حیاتی!"

"کیوں چیخ رہا ہے"۔ ماں نے ترشروئی سے کہا۔

"پیاری حیاتی"۔ پھر آواز آئی۔

"کیا بکتا ہے؟" ماں بگڑ کر بولی۔

"پیاری حیاتی"۔ پھر پتیر نے جواب دیا

"پاگل تو نہیں ہو گیا؟ خواہ مخواہ کیوں شور مچاتا

ہے؟" ماں آپے سے باہر ہو کر بولی۔

پتیر باہر نکل گیا۔ درختوں کی طرف۔!

اس کے بعد ماں اکثر دیکھتی کہ وہ اپنے نادیدہ دوست سے باغ یا مکان کے کسی گوشے میں گفتگو کر رہا ہے۔ آخر ہر وقت کی ان باتوں نے اسے اس کا عادی کر دیا اور وہ اس کی طرف سے اگرچہ ایک طرح سے بے پروا ہو گئی مگر ایک دفعہ جب اسے کسی بات کا اندیشہ ہوا تو پتیر کے باپ سے کہنے لگی۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ پتیر کو کیا ہو گیا ہے؟ آج صبح وہ مجھ سے کہنے لگا کہ وہی حیاتی اسے رات کو اپنے ساتھ سیر کرانے لے گئی اور باوجود میرے جھٹلانے کے وہ یہی کہے جاتا ہے ——— کہ آسماں میں اس کے ساتھ گیا تھا ——— اسی آسمانی مسکراہٹ والی کے ساتھ۔ اس نے مجھے پھل بھی دیئے تھے ——— اب میں اسے کیسے یقین دلاؤں کہ یہ صرف ایک خواب تھا۔ وہ مانتا ہی نہیں"

باپ نے کچھ سوچ کر جواب دیا "ہاں ہے تو حیرت ناک بات، مگر یہ سب بچپن کے خیالات ہیں جو بہت جلد دھندلے پڑ جائیں گے"

ایک دفعہ رات کو ماں یکبارگی جاگ اٹھی تو دیکھا کہ پتیر اپنی پلنگڑی پر پڑا کہہ رہا ہے "وہاں سردی ہو گی، میرا بستر گرم ہے۔ آؤ میرے ساتھ میرے بچھونے میں آ کر سو جاؤ"

ماں نے غور سے دیکھا کہ پتیر پٹی پر سرک گیا ہے اور باقی جگہ چھوڑ دی ہے تاکہ کوئی اس کے پاس آ کر لیٹ جائے۔

"کیا کر رہے ہو؟" اس کی ماں نے اس کے بالوں کو سہلاتے ہوئے کہا۔

"اپنی حیاتی کو بلا رہا ہوں ——— اس کے لئے یہ جگہ کافی ہو گی ——— اس کو سردی لگ رہی ہے۔ وہ سونا چاہتی ہے ———" اس نے بھولپن سے کہا۔

"مگر یہاں تو کوئی بھی نہیں ہے" ماں چاروں طرف دیکھ کر بولی۔

"وہ ہے تو سہی ——— وہاں ——— حیاتی!"

پتیر کی آواز میں خفگی معلوم ہوتی تھی۔

"بیوقوفی کی باتیں مت کرو۔ سو جاؤ" ماں نے کہا۔

"بیوقوفی نہیں ہے ——— وہ ہے تو۔ وہ حیاتی ..."

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پتیر اور حیاتی خاموشی سے اور چھپ چھپ کر ملنے لگے۔ ان کی ملاقاتیں رنگین ہوتی تھیں اور ایک دوسرے کو دیکھ دیکھ کر مسکراتے تھے، وہ دور دور کھیتوں اور خاموش باغوں میں جایا کرتے اور طرح طرح کی باتیں کیا کرتے تھے۔

جب اس کی عمر پانچ سال کی ہوئی تو اس کے باپ نے ایک چھوٹی سی پہاڑی پر ایک ننھا سا باغ بنوایا اور اپنے اکلوتے بیٹے سے مذاق میں پوچھا۔ "اس کا نام کیا رکھنا چاہیئے؟"

"فردوسِ حیاتی!" پتیر نے معصومیت اور سادگی سے کہا اور اپنے باپ کی صورت تکنے لگا۔

باپ پر اس کا اثر ہوا اور اس نے اس کا نام "فردوسِ حیاتی" رکھ دیا۔

جب وہ پڑھنے سے فارغ ہوتا تو اکثر فردوسِ حیاتی چلا جاتا اور کہیں دور، بہت دور، کسی چیز پر اپنی نگاہیں گاڑ دیتا اور آہیں بھرتا ——— نہ معلوم کیوں؟

اگر کوئی خرگوش کی طرح دبے پاؤں وہاں چلا جاتا تو پتیر کو کہتے سُنتا "حیاتی! جب میں بڑا ہو جاؤں گا تو مجھے سفر کرنا ہوگا۔ دُور ۔۔۔ دیکھنا ۔۔۔ بہت دُور"۔

جب کبھی وہ کچھ بےچینی سی محسوس کرتا تو فردوسِ حیاتی چلا جاتا اور کہتا۔

"پیاری حیاتی، دنیا کی ہر چیز کیوں اس قدر بےرحم واقع ہوئی ہے؟ مجھے کیوں زبردستی پڑھنا پڑتا ہے اور اور اماں تمھیں روزانہ گھر میں کیوں نہیں آنے دیتیں؟"

جب پتیر "فردوسِ حیاتی" سے واپس آتا تو مسرور ہوتا اور اس کے دل کو سکون، اگر اس کی ماں کبھی اُسے مارنے کے لئے دوڑتی تو وہ وہیں پناہ لیتا، وہ جانتا تھا کہ یہاں میں محفوظ ہوں کیونکہ بڑھیا ماں موٹی تو ویسے ہی ہے پھر اس پہاڑی پر کیسے چڑھے گی؟

(۳)

وقت گزرتا گیا اور پتیر کی عمر چھ سال ہو گئی۔ اس اثنا میں خلافِ توقع وہ دوسرے مشاغل میں منہمک ہو گیا۔ سنہری پنجرے میں سبز طوطا اس کا اکثر دل بہلاتا اور اس سے اس کو اس قدر محبت ہو گئی کہ وہ اس کو ایک لمحہ بھی مشکل سے چھوڑتا۔ رفتہ رفتہ حیاتی کی یاد اس کے دل سے کم ہوتی گئی اور صرف "فردوسِ حیاتی" کے خوبصورت درختوں تک محدود ہو کر رہ گئی۔

پندرہ سال کی عمر میں ایک دفعہ وہ اپنے وطن واپس آیا اور اس کے ساتھ اس کا ایک دوست بھی تھا۔ ٹہلتے ٹہلتے وہ اسی پہاڑی پر پہنچے تو اس کے دوست نے پوچھا "اسے فردوسِ حیاتی کیوں کہتے ہیں؟"

پتیر نے جواب دیا "معلوم نہیں! یہ پُرانا نام ہے۔ اب تو لوگ اسے باغِ پتیر کہتے ہیں"۔

۔۔۔ لیکن یکبارگی اس کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔ وہ وہ اپنے دل میں ندامت محسوس کرنے لگا کہ وہ ایک ایسی یاد کا انکار کر رہا ہے جو "فردوسِ حیاتی" کے درختوں پر سے جھانک رہی ہے مگر وہ پھر بھی لڑکا تھا ۔۔۔ سب ہی ناسمجھ اور شریر ہوتے ہیں ۔۔۔ وہ اس کو اُڑا گیا اور اس کا ساتھی کچھ نہ سمجھ سکا۔

کتنے سال بیت گئے اور وہ ایک دوسرے ملک میں چلا گیا۔

سبز پہاڑیوں نے ردائے شام اوڑھ لی تھی ۔۔۔ اور سورج جھیل کے پگھلے ہوئے سونے پر چلا کر رہا تھا۔ ہوا خاموش تھی مگر کبھی کبھی دُور سے چرواہوں کی آوازیں مویشیوں کی گھنٹیوں سے ہم آہنگ ہو کر سنائی دے جاتی تھیں۔

پہاڑی کے ایک طرف ایک گھر میں جو آبادی سے بالکل الگ تھلگ تھا خاموشی طاری تھی۔ برابر کے کمرے میں ایک نوجوان شخص بیٹھا ہوا کھڑکی میں سے ارغوانی مناظر دیکھنے میں محو تھا کہ اس نے تاریک کمرے میں سے کچھ آواز آتی سُنی۔ اس کا دوست بستر پر بیمار پڑا تھا اور اس پر بحرانی کیفیت طاری تھی اس نے کان لگا کر سُننا شروع کیا۔

"تم کون ہو؟ کیا چاہتی ہو؟ کیا تم مجھے تنہا نہیں چھوڑ سکتیں؟ میں تم کو نہیں پہچانتا۔ ہیں! وطن میں ...... دریا کے کنارے؟ ...... ہاں! ..... فردوس حیاتی؟ حیاتی؟ ..... ہاں اب یاد پڑتا ہے ..... ارے تم ہو! .... ابھی تو رہیں؟ ...... تم نے بہت اچھا کیا کہ آگئیں ..... تم کہاں تھیں؟

"...... مجھے تو تمھارا انتظار تھا......"

کچھ دیر تک خاموشی مسلط رہی۔ پھر ایک گہرا سانس اور چند آہیں سُنائی دیں۔

تھوڑی دیر بعد وہ پھر کمزور اور دبی ہوئی آواز میں بولا: "وہ جسم جو وہاں پڑا ہوا ہے نا۔ اگر اس کا سانس رُک جائے تو میں مرجاؤں گا —— ہیں نا حیاتی؟ وہ لمبا، زرد، مرجھایا ہوا، لاش سا جسم میرا ہی ہے حیاتی —— میں بیمار ہوں..... اگر اس کا سانس رُک جائے تو میں مرجاؤں گا۔"

نوجوان شخص نے اپنے پڑوسی کی طرف گردن پھیر کر کہا —— "پتیر، پتیر! کیا بات ہے؟ کون ہے؟"

—— لیکن آواز آئی،

"وہ میری طرح تو نہیں ہے....... وہ جسم! آہ مجھے تکلیف ہوتی ہے..... میرا طوطا مرگیا..... عرصہ ہوا...... کیا تمھیں یاد نہیں؟ حیاتی! آہ حیاتی، میری مدد کرو، مت جاؤ، پیاری حیاتی۔"

کچھ لمحات بعد وہ پھر کہنے لگا "تم نے مجھے کیوں بھلا دیا تھا؟..... میرے ماں باپ کا انتقال ہوگیا ہے...... تم کیوں جارہی ہو؟ مجھے تمھاری ہر وقت ضرورت ہے...... کیا تمھیں معلوم ہے حیاتی ..... کہ اگر وہ جسم جو وہاں پڑا ہوا ہے سانس نہ لیگا تو میں مرجاؤں گا۔ پھر میں کہاں جاؤں گا، یہ میں نہیں جانتا...... تم تو بہت ہی دور رہتی ہو، ہے نا؟ ایک دفعہ تم نے مجھے بتایا تھا —— بہت دُور..... یہاں سے کہیں دور...... ایک ایسے جزیرے میں جہاں دن اور رات میں اختلاط باہمی ہے اور جہاں شام اور شفق..... صبح اور صبح کاذب، ایک دوسرے سے بغل گیر ہوتی ہیں..... وہیں رہتی ہو نا؟ مگر یہ ہے کہاں؟ مجھے نہیں معلوم...... میرے خیال میں بھی نہیں ہے۔"

پھر خاموشی طاری ہوگئی۔

"میں اس زرد اور مُرجھائے ہوئے جسم کے قریب ہونا نہیں چاہتا، تم ہمیشہ کی طرح آج بھی مسکرا رہی ہو حیاتی؟..... کیا میں بھی مسکراؤں، پیاری! اچھا ...... جاؤ مت! حیاتی...... خدارا!......"

گہرا سانس اور آہیں...... خاموشی،

پتیر سو گیا۔

جب وہ اچھا ہوا تو اس کے دوست اس کے متعلق گفتگو کرنے لگے، ایک کہنے لگا —— "تم بچ گئے، بخار بہت تیز تھا۔"

دوسرا بولا "تم کیا کیا بک رہے تھے پتیر؟"

"ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ تم کسی حیاتی سے باتیں کررہے تھے، وہ کون ہے"؟ ایک نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"مجھے کیا معلوم؟ دُنیا میں کوئی بھی ایسا شخص نہیں جو اپنی ہذیانی کیفیت کی باتیں یاد رکھتا ہو۔" پتیر نے لاپروائی سے جواب دیا۔

حیاتی کی باتیں پھر معدوم ہوگئیں۔ البتہ ایک دھندلی سی یاد کا سایہ پتیر کے کمرے میں کبھی کبھار پڑ جاتا تھا —— جہاں وہ اس سے دوبارہ ملی تھی۔

(۴)

ایک دفعہ شام کو ایک میز کے گرد پانچ اشخاص جن کی عمریں بچپن سے پینسٹھ تک ہوں گی بیٹھے مختلف موضوعات پر گفتگو کررہے تھے۔

ایک بولا جب کبھی مجھے پیٹر کی بیماری یاد آتی ہے (جب، عرصۂ دراز گزرا، وہ قریب المرگ تھا) مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ نصف اس دنیا میں تھا اور نصف کہیں اور۔۔۔۔۔۔"

"اس کے کیا معنی؟" دوسرے نے تعجب سے پوچھا۔

"ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کوئی دو مختلف شخصیتیں ہیں ـــــ یا کوئی رُوح اپنے جسم سے باتیں کر رہی تھی جو الگ پڑا ہوا تھا۔ وہ گھڑی کہے جا رہا تھا۔ "اس جسم کا اگر سانس رُک جائے تو میں مر جاؤں گا" ـــــ تمھیں یاد ہے پیٹر؟ ـــــ"

"کچھ کچھ!" پیٹر نے جواب دیا۔

"میرا خیال ہے کہ ایسی حالت میں روح واقعی جسم کو چھوڑ دیتی ہے۔ تمھارا کیا خیال ہے ڈاکٹر؟"

ڈاکٹر مسکراتا ہوا بولا "چونکہ اس قسم کی کتابیں ہمیں نہیں پڑھائی جاتیں اس لئے میں قطعی طور پر کچھ نہیں کہہ سکتا۔"

"تو تمھارے خیال میں روح جسم کو نہیں چھوڑ سکتی تاوقتیکہ آپریشن نہ کیا جائے۔"

"نہیں۔۔۔۔۔۔۔"

پانچوں آدمیوں نے ایک قہقہہ لگایا۔

"ہماری عمریں ختم ہوئی جاتی ہیں، یہ بھی ہم کو عنقریب معلوم ہو جائے گا۔"

"واقعی بہت جلد معلوم ہو جائے گا۔"

"ہاں!" پیٹر بھی ایک لمبا سانس لے کر بولا۔

دوستوں کی محفل ختم ہونے کے بعد پیٹر اپنے پلنگ پر لیٹ گیا۔ اس کا دل بیٹھا جا رہا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی اس کے دماغ اور جسم کو پھونکے جا رہا ہے۔

ڈیڑھ گھنٹے بعد وہ اٹھا۔ وہ پیاسا تھا، اس لئے پانی پی کر پھر لیٹ گیا۔ اس کا جسم گرم ہو گیا تھا اور وہ اندرونی تپش سے جل رہا تھا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں اور قدرت کی رحم دل ملکہ نے اسے اپنی آغوش لے کر سلا دیا۔

اس نے ایک آہ بھری اور دفعتہً بولا "تم کون ہو؟ آہا حیاتی، تم آگئیں۔ تمھیں دیکھے برسوں گزر گئے تھے ـــــ کبھی جوانی میں دیکھا تھا اور یا پھر بچپن میں ـــــ پیاری میں جا رہا ہوں۔ فردوسِ حیاتی؟ ہاں ہاں مجھے یاد ہے۔ میں بھولا نہیں، میں کہاں ہوں؟ کیا سردی لگ رہی ہے۔ آؤ یہاں آؤ۔۔۔۔۔ میرے پاس۔۔۔۔ میں جا رہا ہوں۔۔۔۔۔۔"

خاموشی ـــــ!

"کیا تمھیں معلوم ہے حیاتی؟ کہ وہ شخص ـــــ بڈھا اور ضعیف ـــــ اگر سانس لینا بند کر دے تو میں مر جاؤں گا۔۔۔۔۔۔۔ میں! ہاں میں، وہ کس قدر بوڑھا ہے، کیا وہ قریب قریب ختم ہو گیا؟ کیا تم سمجھتی ہو ہم دونوں ساتھ جائیں گے؟ میں جانا چاہتا ہوں، مگر کہاں؟ مجھے یاد ہے۔۔۔۔۔۔ ۔۔ دُور۔۔۔۔۔ بہت دُور ایسی جگہ جہاں دن اور رات ملتے ہیں۔۔۔ شام اور شفق ملتی ہیں۔۔۔۔۔۔ طلوعِ سحر، غروبِ آفتاب میں سما جاتی ہے۔ میں وہیں جا رہا ہوں۔ آہ حیاتی میں بہت تھک گیا ہوں۔ میں سفر کرنا چاہتا ہوں۔ دُور، بہت دور، کہیں دور۔۔۔۔ اور پھر آرام کرنا چاہتا ہوں، میں اپنے آپ سے کس قدر پرے ہو گیا ہوں پیاری! میں کون ہوں؟ آہ حیاتی! میں بیحد

تھک گیا ہوں، آج بھی مجھے پہلے کی طرح اپنی آغوش میں لے لو! ......"

آہ سرد! اور پھر سب کچھ ختم ہو چکا تھا۔

علی الصباح ملازم نے پیٹر کو بستر کے ایک طرف پٹی پہ پڑا ہوا ——— دیکھا ——— مُردہ! مگر اس کے بشرے سے اطمینان اور مسرت ظاہر ہوتی تھی کیونکہ...... رات بھر حیاتی اس کے ساتھ اس کے پلنگ پر سوئی تھی ———

عالمگیر (جنوری سنہ ۳۵ء) ——— (×) ——— نامعلوم

مدفن

یہ مدفن ——— یہ صحرائی قبرستان!

آہ! یہاں ایسے گل بدن بھی دفن ہیں۔ جن سے گلاب کبھی عزت حاصل کرتا تھا اور کبھی رونے لگتا تھا ——— شبنم کے آنسوؤں سے! جن کو دیکھنے سے دلوں میں آتشِ عشق بھڑک اٹھتی تھی ——— ؛

ان شعلہ غذاران کا تِل ایسا معلوم ہوتا تھا گویا دہکتی ہوئی آگ میں حضرتِ خلیل کھڑے ہیں یا لالہ کے گچھوں کے درمیان، ابنِ ماالسما!

ایسے رخسار جن میں حجاب اور شباب کی جھلک تھی، لیکن ——— ایک دن ان کے حسن کو موت نے اس طرح فنا کر دیا۔ جیسے کوئی کتاب بند کر دی گئی ہو!؛

اور وہ ریت کے ذرات میں تبدیل ہو کر اب پاؤں میں آتے ہیں۔

آہ! یہاں کی حسرت خیز خاموشی!!

ان قبروں میں وہ آنکھیں ہیں، جنھوں نے اپنی پلکوں سے بڑے بڑے متکبّر بادشاہوں کو شکار کیا ——— اور وہ جو نگہبان تھے۔ اپنی رعایا کے۔ اب رعیّت ہو گئے ایک دوشیزہ کے!۔

وہ آنکھیں ——— جنھوں نے بابل و ہاروت کو مسحور کیا۔ اور بڑے بڑے جلال و جبروت والے شہنشاہوں کو سائل کی طرح ذلت کی جگہ کھڑا کر دیا۔ اِس طرح کہ ان کے ہاتھوں میں تاج اور پیشانی پر ندامت کا پسینہ تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ کسی طرح اُن کی نشیلی آنکھوں میں ایک لمحے کے لئے قبولیت حاصل کر لیں! ——— جن کے آگے انھوں نے فقیروں کی طرح احسان مندی کا کشکول بڑھایا ——— ان کو بھی موت نے قبر کے نیچے مٹی میں ملا دیا ——— گویا کہ وہ فتنہ انگیز تھیں مگر ——— صرف کل ہی تک ؛!

معبود! یہاں کیسی ہیبت ناک فضا ہے!!

اِس قبرستان میں ہڈیاں دفن ہیں ——— پسی ہوئی ——— چورہ چورہ ——— بڑے بڑے بادشاہوں اور شہنشاہوں کی؛ جو اپنے محلوں کے لئے تمام روئے زمین کو تنگ سمجھتے تھے...... اور قصد کرتے تھے کہ اُن کے بلند قصرِ شاہی تاروں کو پڑوسی بنالیں! ——— یہ پسلیاں ہیں ——— ان کی۔ جو غصّے کے وقت ٹیڑھی ہو جاتی تھیں۔!

اور یہ لب وہ ہیں۔ جن کی حرکت کبھی جنگ کا حکم اور کبھی صلح کا پیام ہوتی تھی!؛

اور یہ وہ انگلیاں ہیں۔ جو اپنی تلواروں سے گردنیں کاٹتی تھیں!؛

اور یہ سر وہ ہیں جن کے آگے بڑے بڑے جرّی اپنی گردنیں خم کر دیتے تھے!؛

لیکن آہ! موت نے حاکم و محکوم دونوں کو برابر کر دیا ——— اور آج بڑے اور چھوٹے میں کوئی فرق

اور تمیز نہیں !! ؎

یہاں وہ نازک ترین گردنیں تہ خاک ہیں ! جو پھولوں اور موتیوں کے ہار کا بوجھ سہارنے سے قاصر تھیں۔ مگر آہ ! وہ اب منوں گیلی مٹی کی حامل ہیں ؎

ادبِ لطیف (اکتوبر ۳۵ سنہ ۶) ——— محمد المویلحی

شاعر نے کہا

چاندنی رات تھی اور اس کی سپیدی آسمان کے تاروں کو چھپائے ہوئے تھی۔ میں نے ایسی روشن راتیں شاید ہی کبھی دیکھی ہوں!

رات ایسی چمک دار تھی کہ ثاقب بھی اپنے موتیوں کو پرولے اور کوئی اپنا گم شدہ موتی بھی ریت میں سے تلاش کرلے۔ صحرا کا ذرہ ذرہ اپنے حسنِ ثمر افشاں کی نمائش کررہا تھا۔

میں قبرستان میں اپنے خیالات میں غرق، ٹوٹی پھوٹی قبروں اور شکستہ مزاروں کو دیکھتا ہوا آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔۔۔

میں نے انسانی زندگی پر ایک سرسری نظر ڈالی وہ کتنا مغرور ہے! اپنے آپ کو کس قدر عظیم المرتبت اور دوسروں سے بلند سمجھتا ہے! وہ اپنی طاقت کے دعوے میں کس قدر مبالغہ کرتا ہے! اور اس کی خواہشات کی تکمیل کس قدر بے باکانہ ہوتی ہے!۔

موت سے بالکل بے پروا ہوکر!

وہ اپنا سر غرور سے اس قدر بلند کرتا ہے گویا اس کی ناک آسمان میں سوراخ کردے گی لیکن۔۔۔۔

موت دفعتاً اس کی ناک رگڑ دیتی ہے اور اور اس کے غرور و تکبر کو ہمیشہ کے لئے قبر میں دفن کردیتی ہے۔

میں تفکرات میں کھویا ہوا اسی طرح برابر چلتا رہا کہ۔۔۔ دفعتہً مجھے ایسا معلوم ہوا کہ کسی شاعر کی روح میرے کان میں کہہ رہی ہے۔۔۔۔۔۔

"اپنے قدم ہلکے کردے!۔۔۔ جسے تو ریت سمجھتا ہے، حقیقتاً یہ بنی نوع انسان کے جسم سے پیدا شدہ ذرات ہیں۔ اگرچہ صدیاں گزر گئیں پھر بھی ہمیں ان کا احترام لازمی ہے۔ کیونکہ یہ ہمارے آباو اجداد تھے۔ چل! جس قدر آہستہ ہوسکے بلکہ ہوا میں۔۔۔ اور اکڑ اکڑ کر نہیں، کیونکہ کیا تیری غیرت مُردہ ہڈیوں کے چورے پر چلنا گوارا کرے گی؟"

ندامت سے میری پیشانی تر ہوگئی اور میں بالکل آہستہ آہستہ چلنے لگا۔

موت نے ان کو قبر کی تاریکی میں پہنچادیا اور اس گہرائی میں اب سوائے بوسیدہ اور پسی ہوئی ہڈیوں کے کچھ نہیں لیکن ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ۔۔۔

ان میں محبت کے وہ پروانے شامل ہیں جنھوں نے محبوب کے تبسم کی خاطر اپنا قبلہ تک تبدیل کردیا جنھوں نے اس مسکراہٹ کی شیرینی کے واسطے کوثر کی شیرینی کو قربان کردیا۔

مگر اب وہ صحرائی ریت اور غبار بن کررہ گئے اور ان کے موتی جیسے چمکدار دانت سنگ ریزوں اور کنکروں میں مل جل گئے۔

انتقام کی رات

مطلع بالکل صاف تھا اور چودھویں رات کا چاند بادل کے سیمیں ٹکڑوں پر ہلکے ہلکے ہچکولے کھاتا ہوا جا رہا تھا۔

چاند کی چمکدار کرنیں سینۂ آب کو چیر رہی تھیں۔ ہر طرف سکوت طاری تھا البتہ کبھی کبھی چپوؤں کی آواز سحر کائنات کی خاموشی کو توڑ دیتی تھی اور سازِ دنیا کے خوابیدہ تاریک بار گی مرتعش ہو جاتے تھے۔

گیارہ بجے کا عمل ہوگا، ایک کشتی ساحل کی طرف آہستہ آہستہ بڑھ رہی تھی۔ ملاّح بڑی جانفشانی سے چپو چلا رہے تھے تاکہ جلد منزلِ مقصود تک پہنچ جائیں مگر ابھی کوئی پانچ میل کا فاصلہ اور رہ گیا تھا۔

صابی بولا "حازل! یہ تو اس کی دین ہے ورنہ ہمارا منہ کہاں کہ اس قدر قلیل عرصے میں اتنی دولت جمع کر سکتے!"

حازل نے ساحل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "ہاں بھائی —— میرا دل چاہتا ہے کہ پر لگا کر اڑ جاؤں اور اپنی پہیتی بیوی ...."

صابی نے آہستہ سے کہا "ٹھیک کہتے ہو دوست! یہی میری بھی تمنا ہے کہ جس قدر جلد ممکن ہو اپنی معصوم بیوی اور ننھے بچوں کو دیکھوں۔ میری تو بس یہی کل دنیا ہے۔"

کشتی کھینے والے اپنے کام میں مصروف تھے۔

حازل نے ان کو دیکھتے ہوئے کہا "تمھاری رفتار بہت سست ہے۔ نہ معلوم کتنی دیر اور لگے!"

صابی کو کچھ یاد آیا اور اس نے حازل سے کہا "پرسوں گاؤں کے مکھیا کا انتخاب ہوگا مجھے بھی رائے دینی ہے۔"

حازل کو جماہی آئی اور وہ چند لمحے صابی کی بات پر غور کر کے بولا "مجھ پر غنودگی طاری ہو رہی ہے جب ہم ساحل کے قریب پہنچیں تو مجھے جگا دینا۔"

گاؤں کا مکھیا، سارے علاقے کا چودھری اور تمام آبادی کا حکمراں بننا کون پسند نہیں کرتا! اور جس کی جیبیں روپے سے پر ہوں وہ تو ضرور ہی چاہے گا کہ سب کا سردار بن کر رہے۔ یہی دن انتخاب کے تھے۔ جگہ جگہ پنچایتیں ہو رہی تھیں اور ہر گاؤں کا مکھیا چنا جا رہا تھا۔ اب واپسی پر حازل کے پاس خاصی دولت تھی۔ اس کے علاوہ لوگ اس کی عزت بھی کرتے تھے۔ چنانچہ اس کے دل میں رہ رہ کر خواہش ہونے لگی کہ اس دفعہ میں ہی گاؤں کا مالک بنوں!

اسی الجھن میں، چند موٹے موٹے رسّوں کو سر کے نیچے رکھ کر وہ لیٹ گیا اور اسے نیند آگئی۔ اور اس کے خیالات اسے کشتی، سمندر، بیوی سب سے بھلا کر ایک نئی دنیا میں لے گئے۔

کہتے ہیں انسان سوتے میں اپنے خیالات کا عکس دیکھتا ہے، چنانچہ حازل خواب میں بھی انتخاب کے ہنگامے کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے دیکھا کہ گاؤں کے بوڑھے اور نوجوانوں نے صابی کو اپنا چودھری منتخب کر لیا ہے۔ وہ چونک کر اٹھ کر بیٹھ گیا اور تعجب سے بہتی ہوئی کشتی اور مسکراتے ہوئے صابی کو دیکھا، اس کا چہرہ طیش سے تمتما اُٹھا اور آنکھیں غصے سے سُرخ ہو گئیں۔

اُس نے دل میں سوچا "میں نے گاؤں میں غریبوں کے لئے مندر بنوائے، شفاخانوں کو روپیہ دیا، محتاجوں کو خیرات دی اور اپاہجوں کی مدد کی۔ یہ لوگ اس کا بدلہ یہ دیں گے کہ میرے ہوتے ہوئے ایک معمولی سے آدمی، غریب اور مفلس صابی کو اپنا سردار بنا لیں گے۔ یہ ہرگز نہیں ہو سکتا۔ لیکن بزرگ کہتے ہیں نصف رات کے قریب جو خواب نظر آئے اس کی تعبیر سچی ہوتی ہے۔ مگر نہیں، میری موجودگی میں کسی کو بھی گاؤں کا مکھیا بننے کی ہمت نہ ہو گی"۔

وہ انہی خیالات میں غلطاں و پیچاں کشتی کے پچھلے حصے میں بھاری بھاری تختوں پر اُلجھے ہوئے قدم رکھتا ہوا ٹہلنے لگا۔ ساحل اب آدھے فرلانگ رہ گیا تھا۔ صابی بڑی محبت سے مخاطب ہوا، "بھائی کنارہ آ گیا، تم کچھ تھکے ہوئے سے معلوم ہوتے ہو"۔

"ہاں ہاں! میری طبیعت اچھی نہیں ہے۔ کشتی جلد کنارے سے لگا دو"۔ اس نے لاپروائی سے جواب دیا اور آگے بڑھ گیا۔

(۲)

کنارے پر اُتر کر دونوں بچپن کے دوست گاؤں کی طرف روانہ ہوئے۔ گھنے گھنے درخت ان کے راستے پر سایہ کئے ہوئے تھے اور ان کی پگڈنڈی کبھی کبھی کچی سڑک میں کھو جاتی تھی۔ وہ آگے ہی بڑھتے گئے یہاں تک کہ ایک ایسی جگہ پہنچے جہاں سے دو راستے جاتے تھے۔ ہاتھ پکڑتے ہوئے حازل بولا "آج تو اس راستے سے چلیں گے۔ یہاں سے کوئی جاتا ہی نہیں"۔

صابی حیرت سے بولا "بھلا یہاں سے کہاں جاؤ گے۔ اس طرف کوئی آمد و رفت نہیں ہے ...... مگر تمہارے اصرار پر میں بھی راضی ہوں چلو ذرا سیر ہی رہے گی"۔ دونوں اس طرف چل دیئے ——

چاند اب پوری طرح چمک رہا تھا۔

تھوڑی دور ایک گھنے بڑ کے نیچے پہنچ کر جس کی لمبی لمبی لٹیں اس کی درازئ عمر کا پتہ دے رہی تھیں، حازل نے کرخت آواز میں صابی سے کہا "کیا تم سمجھتے ہو کہ لوگ تمھیں گاؤں کا مکھیا بنا لیں گے؟"

اس نے بغیر کچھ سوچے سمجھے جواب دیا "بھلا تمہاری موجودگی میں ——؟"

حازل نے گویا سُنا ہی نہیں۔ وہ ایک خوفناک ہنسی ہنسا۔ پہلو بچا کر پیچھے ہٹا اور پلٹ کر اس کے سینے میں اپنا خنجر گھونپ دیا۔

"آہ ......" کہہ کر صابی گر پڑا۔ زخم کاری تھا اس لئے وہ بمشکل بول سکا "روپیہ تم مجھ سے مانگ ہی لیتے، میری جان کیوں لی، بھائی..... اوہ!...."

"نہیں روپے کی خاطر نہیں...... تم اب گاؤں کے مکھیا نہ بن سکو گے" حازل نے اپنے تھرتھراتے ہوئے ہونٹوں کو دانتوں سے دباتے ہوئے کہا۔

مرنے سے پہلے صابی نے اپنا سر زمین سے اٹھایا اور بولا "اے چاند! میرے پیارے قاصد! میری بیوی

اور معصوم بچوں کو اس ہولناک اور دردانگیز قتل کی اطلاع دے دینا ــــــ"

حازل نے ایک حیرت انگیز قہقہہ لگایا "اوہو! چاند تمھارا قاصد بنے گا؟ کیوں نہیں! بے شک یہ تمھارے قاتل کا ضرور پتہ بتادے گا۔ آہاہا ــــــ"

"اے چاند!" وہ رُک رُک کر بولا "اگر تیری روشنی پاک اور میرا قتل بے گناہ ہے تو اس کا بدلہ ضرور لینا۔"

وہ خاموش ہوگیا، گویا اپنی کہانی چاند کو سُنا کر اُس نے دنیا سے مُنہ موڑ لیا ہے۔ حازل نے اُسے اسی کی چادر میں لپیٹا اور ایک بڑی جھاڑی کے اندر اس کی لاش چھپادی۔ پھر قریب سے لکڑیاں اور بڑے بڑے پتے جمع کرکے اس پر ڈال دیئے تاکہ کسی کو خبر نہ ہو اور گھر کی طرف روانہ ہوگیا۔

وہ تمام راستے ہنستا رہا۔ گھر پہنچ کر اس نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ اس کی بیوی باہر آئی اور اسے دیکھتے ہی خوشی کے مارے پھولی نہ سمائی۔ وہ اندر گیا، اور دولت کا ایک انبار، جو خود اس کی اور صابی کی چھینی ہوئی کمائی تھی، اپنی بیوی کے سامنے ڈال دیا۔ وہ بہت خوش تھی۔ اس نے اسی وقت اس کے لئے بستر بچھایا اور آرام کرنے کے لئے اصرار کرنے لگی۔ لیکن وہ ہنسے جارہا تھا جس سے اس کی بیوی کو بڑی حیرت ہوئی۔ اس نے اس سے بار بار پوچھا مگر حازل نے کچھ نہ بتایا۔ اس پر اسے غصّہ آگیا اور وہ پڑکر سوگئی۔ رات کا باقی حصّہ حازل نے ہنسنے اور قہقہے لگانے میں گزارا۔ قہقہوں کی متواتر اور سخت آواز سے پڑوس کے لوگ جاگ اٹھے۔ انھیں اس کی اس حماقت پر بے حد غصّہ آیا لیکن گاؤں میں اسکی بڑی ساکھ تھی۔ بچارے کر ہی کیا سکتے تھے، خاموش ہوگئے۔

صبح ہوتے ہوتے اسے نیند آگئی۔ کوئی دس گھنٹے گزرے ہوں گے کہ وہ جاگ اٹھا اور پھر وہی ہنسی! بے معنی قہقہے۔ آخر اس کی بیوی کے جسم میں بری خون دوڑنے لگا اور اس نے اپنی خوفناک آنکھیں اس کی طرف نکالتے ہوئے اس کا سبب پوچھا۔ اس کی بیوی جب کبھی کسی بات پر ضد کرتی تو حازل مجبور ہوجاتا۔ جانتا تھا کہ برباکی رہنے والی ہے! اس کی ہنسی کم ہوگئی اور وہ آہستہ سے بولا "بات یہ ہے کہ ــــــ" اس نے اس کو اپنے پاس بٹھالیا اور کان میں سارا واقعہ سُنا کر کہنے لگا "کیوں! کس قدر بے وقوفی اور حماقت ہے؟ کہیں چاند بھی قاصد ہوا ہے؟ اور پھر وہ مجھ سے انتقام لے گا ــــــ؟ آہاہا، آہاہا ــــــ" وہ پھر ہنسنے لگا اور اس کی بیوی بھی اس تمسخر میں حصّہ لینے لگی۔ "بعض آدمی تو بالکل گدھے ہوتے ہیں" اس نے اس کے جواب میں کہا اور اس کے ساتھ خود بھی اپنا حلق تھکانے میں مصروف ہوگئی۔

(۳)

تیسرا روز تھا ــــــ

حازل گاؤں کا مکھیا بنادیا گیا اور لوگ خوش خوش اس کی تعریف کرنے آنے لگے۔ اس نے بہت سا روپیہ خیرات کے لئے مندر کے پنڈتوں کو بھجوایا اور بہت سا اناج غربا میں تقسیم کیا۔

حازل، گاؤں کا مکھیا، مکان میں داخل ہوا۔ اس کی بیوی کھانا پکانے میں مصروف تھی۔ اس نے اُسے

آواز دی۔ لیکن وہ نہ سُن سکی۔ اس پر آگ بگولا ہو کر باورچی خانے پہنچا اور طیش میں آکر ہنڈیا پھینک دی۔ اُف! برمی عورت کا غصہ کس قدر خوفناک اور بے پناہ ہوتا ہے؟ اور خصوصاً اس وقت جب کہ اس کی توہین کی گئی ہو! وہ غصّے سے بے قابو ہو کر اس کی طرف لپکی مگر حازل بھاگ کر مکان سے باہر آ گیا۔ اس نے نہ معلوم اسے کتنی گالیاں سُنائیں اور بُرا بھلا کہا۔ اس کے اس بُری طرح چلاّنے پر اِدھر اُدھر سے لوگ جمع ہو گئے تو وہ طیش میں آکر سب کچھ بھول گئی۔ اور بولی "اے لوگو! جسے تم اپنے گاؤں کا کھیا بنا رہے ہو وہ قاتل ہے، قاتل! تمھیں معلوم ہے دریا سے ایک میل اِدھر جہاں دو پگڈنڈیاں جاتی ہیں وہاں گھنی جھاڑی میں کس کی نعش ہے؟ اسی بے گناہ صابی کی اور اس کا قاتل یہی بدمعاش، فریبی، حازل ہے جو پنڈتوں کو دان اور غریبوں کو اناج دیتا ہے ——"

لوگوں میں ہلچل مچ گئی اور بہت سے لوگ اس طرف دوڑ پڑے۔ لاش نکالی گئی اور ثبوت مل گیا۔

حازل گاؤں کا کھیا ہو تو ہوا کرے مگر صابی کا قاتل بھی تو ہے۔ بھلا سرکار کا ہے کو چھوڑتی؟ انصاف کی نگاہ میں سب برابر ہیں!

⁂

چودھویں رات تھی ——

قمر چہار دہم کی حسین کرنیں پانی پر رقصاں تھیں اور اسی گھنے بڑ کے ایک موٹے سے تنے میں رسّی کا پھندا حازل کے گلے میں پڑا ہوا تھا۔

چاند اپنا فرض ادا کر کے آج تیس دن کے بعد پھر اسی طرح خوش اور مطمئن، ایک کشتی کی طرح سفید بادلوں کے درمیان آسمان کے نیلے سمندر میں تیر رہا تھا۔

ادبی دنیا (جولائی ۱۹۳۴ء) —————— نامعلوم

ستارے کی خودکشی

آسمان پر سے ایک ستارے نے سمندر کے سیاہ پانی میں چھلانگ لگائی ــــــ لاکھوں ستاروں نے متحیر اور خوف زدہ ہوکر اس خودکشی کو دیکھا کہ یہ روشن ستارہ جو ایک لمحہ پہلے ان کا ساتھی تھا دیکھتے ہی دیکھتے تاریکی میں معدوم ہوگیا ہے۔

ستارہ سمندر کی گہرائی میں جا پہنچا، اس پتھریلی تہ آب تک جہاں بہت سے ستارے ٹوٹ کر جا چکے تھے اور جن کی روشنی ہمیشہ کے لئے ختم ہوگئی تھی۔

اس انجم گم شدہ نے ایسا کیوں کیا؟ اس کا جواب صرف میں جانتا ہوں ــــ صرف میں، کہ جب تک یہ چمکتا رہا اسے کیا جلا رہا تھا؟ یہ کہ مضحکہ دائم کی اذیت! ایک دہکتا ہوا کوئلہ ہنستا ہے کہ اپنی سیاہی مستور کرلے۔ اور جتنا زیادہ ہنستا ہے اتنا ہی جلتا ہے۔ اسی طرح ستارہ بھی ہنستا رہا اور جلتا رہا۔ اور جب سوزش کی تکلیف کو برداشت نہ کرسکا تو آگ بجھانے کے لئے سیاہ پانی میں مملکت منور سے چھلانگ لگائی۔

ہزارہا چمک دار تاروں نے اس گرے ہوئے تارے کو گھور کر دیکھا اور تضحیک کرنے لگے۔

"ہمارا کوئی نقصان نہیں ہوا"۔ انھوں نے کہا۔ "آسمان پھر بھی ایسا ہی منور رہے گا"

شاہجہاں (مئی سنہ ۳۶ء) ـــــــــ ٹیگور

واپسی

سُرخ بجری کی خوشنما سڑک کے دونوں جانب یوکلپٹس کے بالا قد اور پُرشکوہ درخت ایک شانِ بے نیازی کے ساتھ کھڑے جھومتے تھے۔ وہی یوکلپٹس جن کے سرسبز اور رفعت پسند تنوں پر سفیدی اور چکنائی کی دلکش چمک دیکھ کر مجھے ہمیشہ یہ گمان ہوتا ہے کہ کسی شاداب وادی میں صبح مجلّی طلوع ہو رہی ہے۔ ان ہریالے اور سکوت پرور پاسبانوں کے قدموں میں لہراتی ہوئی یہ لال سڑک کافی دُور تک چلی گئی تھی اور اس کے اختتام پر ایک قدیم وضع کا خوبصورت مکان بنا ہوا تھا۔

اب اس مکان کی داستان سُنئے۔ اس کی تعمیر کو کم و بیش تین سو سال ہو گئے تھے اور اس کے مالک پُشتہا پُشت سے نہ صرف اس میں پیدا ہوتے چلے آئے تھے بلکہ اُن کا آخری وقت بھی اسی چار دیواری میں آیا تھا۔ اس گھر کے رہنے والے ہمیشہ سے عافیت پسند اور باہر والوں کی طرح سادہ دل اور معصوم تھے۔ خوش وقتی اور زندہ دلی اُن کا اُصولِ حیات تھا۔ حتی المقدور کہیں آنے جانے سے گریز کرتے تھے۔ دوسرے لوگوں سے ان کا میل جول اور راہ و رسم بھی بہت کم تھی لیکن کوئی شخص ان کے ہاں آجاتا تو سب کے سب اس کا نہایت شائستگی اور خندہ پیشانی سے استقبال کرتے۔ لیکن ان تمام باتوں میں سب سے اہم اور قابلِ ذکر امر یہی ہے کہ ان لوگوں کو اپنے آبائی مکان پر فخر و ناز تھا۔ انھیں اس سے دلی محبت تھی اور وہ اس کی دیکھ بھال اسی گرمجوشی سے کرتے تھے جیسے کوئی اپنے خاندان کے سب سے پیارے بزرگ کی خدمت کرے۔ چنانچہ امتدادِ زمانہ نے اس کی دیواروں کو کبھی کھنڈر نہیں ہونے دیا۔ اس کے نقوش کو کہیں سے مٹنے نہیں دیا، اور اگرچہ ضروریات کے مطابق اس کے نقشے میں تھوڑی بہت کمی بیشی ہوتی رہی لیکن اس کے اصلی رنگ روپ، اس کے پُرانے آثار و ساخت میں کوئی غیر معمولی فرق نہیں آیا۔ اس کے چاروں طرف ترکاریوں کے کھیت اور پھلوں کے باغات تھے اور ان کی یافت پر اس کے مکینوں کا گزارہ، بہ اندازِ شاہانہ تھا۔ لیکن اس مختصر سی جاگیر کے مالک مسٹر جورج نہیں تھے جن کی عمر چالیس پینتالیس کے لگ بھگ تھی۔ بلکہ اس کے مالکانہ حقوق ہنوز ان کی والدہ مسز میڈوز کے پاس تھے جو ساٹھ ستر کے پیٹے میں تھیں۔ مسز میڈوز مجموعہ محاسن تھیں۔ خوش خلق، حلیم الطبع، بُردبار اور نیک نفس، گھر میں بیٹے اور بہو کے علاوہ ان کی بہت سی پوتے پوتیاں تھیں۔ اور اگرچہ اب وہ عمر کی آخری منازل میں قدم رکھ رہی تھیں مگر ساری جاگیر میں انہی کا سکہ چلتا تھا کیا مجال جو کوئی خاندان کا فرد یا جاگیر کا اہلکار ان کے حکم کی سرتابی یا مرضی کے خلاف کچھ کر سکے۔ ان کے بعد دوسرا اہم درجہ ان کی بہو مسز جورج

کا تھا جو ہنس مکھ اور شگفتہ مزاج تھیں۔ انھیں اپنی ساس کی خدمت کا ہر وقت خیال رہتا تھا۔ باغات کے انتظام اور گھرداری میں وہ ان کا ہاتھ بٹاتی تھیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ انھوں نے اولاد کی تربیت ہمیشہ اپنی ساس کی منشا کے مطابق کی۔ المختصر یہ گھر صحیح معنوں میں ایک گوشۂ عافیت اور حجلۂ مسرت تھا۔

ایک دن مسز جورج مجھے راستے میں ملیں۔ بہت شگفتہ اور مسرور نظر آتی تھیں۔ میں نے وجہ پوچھی تو کہنے لگیں "ہمارے چچا آنے والے ہیں۔"

میں نے حیرت سے کہا "تمھارے چچا؟"

انھوں نے جواب دیا "نہیں میرے شوہر کے چچا، مسٹر ہنری؟" "مسٹر ہنری! ان کا انتقال نہیں ہوا؟" "نہیں۔ حالانکہ سب یہی سمجھتے تھے۔"

ہنری کا واقعہ میں نے اپنے لڑکپن میں بارہا سنا تھا کہ وہ اور ان کے چھوٹے بھائی میڈوز، دونوں مسز میڈوز سے جب وہ ایمیلی گرین تھیں محبت کرتے تھے۔ اور جب پچاس برس گزرے، ایمیلی نے میڈوز سے شادی کرلی تو ہنری اپنے آبائی وطن کو خیرباد کہہ کر کہیں چلے گئے۔ کوئی بیس سال تک تو ان کی خیر خبر آتی رہی اور وہ گھر والوں کو مختلف مقامات سے تحفے تحائف بھیجتے رہے۔ لیکن بعدازاں اُن کا کہیں پتہ نہ چل سکا۔ یہاں تک کہ جب میڈوز کا انتقال ہوا اور ان کی بیوہ نے اس کی اطلاع ہنری کو کی تو اس وقت بھی کوئی جواب نہیں آیا۔ آخر سب اسی نتیجے پر پہنچے کہ ان کا انتقال ہوگیا ہے۔ مسز جورج نے پھر کہا "میرے شوہر نے بھی انھیں کبھی نہیں دیکھا۔ وہ ان کی پیدائش سے پہلے ہی یہاں سے چلے گئے تھے۔ اب پچاس سال بعد وہ واپس آرہے ہیں۔ ابھی ابھی ان کا خط آیا ہے۔"

میں نے اس واپسی میں دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔ "بڑا عجیب سا معلوم ہوتا ہے۔ نصف صدی کے بعد وہ اپنے وطن واپس آرہے ہیں؟"

مسز جورج بولیں "ہاں۔ اور سب سے عجیب بلکہ دلچسپ بات یہ ہے کہ ان کو سوائے اماں جان کے اس گھر میں کسی نے نہیں دیکھا۔ جب سے ان کے آنے کی خبر ملی ہے، وہ خاموش ہیں یا کبھی آپ ہی آپ مسکرا دیتی ہیں۔ ہاں ایک دفعہ وہ کہہ رہی تھیں کہ جب تمھارے چچا نے ترکِ وطن کیا اس وقت وہ نوعمر اور نہایت شکیل و وجیہہ تھے۔ لیکن ان میں وہ مستقل مزاجی نہیں تھی جو ان کے چھوٹے بھائی کی طبیعت کا خاصہ تھا۔ شاید اسی لئے اماں جان نے میرے خسر سے شادی کی۔ بہرحال جب سے ان کی آمد کی خبر آئی ہے اُن کے بشرے سے طمانیت اور خوشی جھلکتی ہے۔"

میں نے کہا "بے شک۔ اپنے کسی عزیز سے اتنی مدت کے بعد ملنے سے کسے خوشی نہ ہوگی؟ اور پھر اس صورت میں کہ اس عزیز کی موت کا یقین ہو چکا ہوا۔"

مسز جورج چلتے ہوئے بولیں "وہ کل صبح آجائیں گے۔ جورج انھیں لینے بندرگاہ گئے ہوئے ہیں۔ آپ کل ہمارے ہاں آیئے نا! اماں جان کہتی ہیں تمھارے چچا نے ملک ملک کی سیر کی ہے۔ وہ بڑی دلچسپ باتیں سنائیں گے۔"

میں نے آنے کا وعدہ کرلیا۔ وہ مسکراتی ہوئی آگے بڑھ گئیں۔

(۴)

دوسرے سہ پہر کو میں وہاں پہنچا تو دیکھا کہ ایک جھمگٹا لگا ہوا ہے۔ بیچوں بیچ ایک معمر شخص بیٹھا ہوا تھا جس کے چہرے کی جھریاں اور گردن کی لٹکی ہوئی کھال ایسی معلوم ہوتی تھی جیسے کسی شخص کو ڈھیلے کپڑے پہنا دیے گئے ہوں۔ یہ مسٹر ہنری تھے۔ ان کے مقابل ان کی بھاوج مسز میڈوز بیٹھی تھیں اور ان کے قریب ان کے بیٹے اور بہو۔ باقی چاروں طرف پوتے پوتیوں کا مجمع تھا جو مزے لے لے کر اپنے جہاں گرد دادا کی حکایات شیریں سن رہے تھے۔ مسز جورج نے میرا ان سے تعارف کرایا۔ وہ بڑے خوش ہوئے اور انھوں نے مجھے اپنے پاس بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں حیران تھا کہ یہ شخص اس قدر سن رسیدہ اور نحیف ہے مگر اس کی گفتگو کے انداز اور لہجے کے کرارے پن سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے تن لاغر میں زندگی اور ولولوں کا سرچشمہ پھوٹ آیا ہے۔ جب وہ نہایت پُرجوش آواز میں کافی دیر تک باتیں کرتے رہے تو مسز میڈوز نے انھیں روکا۔ "لو اب تم ہم لوگوں کی باتیں سنو۔ یوں خود بولے جاؤ گے تو تھک جاؤ گے۔ دیکھو تمھارا سانس پھولنے لگا ہے اور تمھیں ——"

مگر ہنری نے اُن کی بات کاٹ دی "ارے تم یہ کہتی ہو؟ ذرا جورج سے پوچھو، بندرگاہ پر میری کیا کیفیت تھی۔ میں اُن کے سہارے سے بہ مشکل گاڑی میں سوار ہوا تھا مگر اپنے گھر کے پھاٹک پر پہنچ کر میں نے گاڑی رُکوادی۔ یوکلپٹس کے ان قدیم ساتھیوں کو دیکھ کر میری پژمردہ حالت میں تازگی آگئی۔ اور میں نے کہا پچاس سال ہوئے میں اس راستے سے پاؤں پیدل گیا تھا۔ آج بھی اپنے گھر کی اس پیاری رہ گزار پر اپنے پاؤں سے جاؤں گا۔ جورج مجھے روکتے ہی رہے مگر میں گاڑی سے اُتر آیا۔ میں نے ان کا سہارا بھی نہیں لیا اور اپنے گھر کے احاطے میں بہ آسانی چلا آیا۔ آہ! یہ گھر! اسے دیکھ کر بے اختیار میرا دل چاہا کہ اس کی دیواروں سے لپٹ جاؤں۔ اسے اپنی آغوش میں لے لوں۔ اس کی ایک ایک اینٹ کو بوسہ دوں۔ یہیں میرے بچپن اور شباب نے پرورش پائی تھی۔ یہی میرے آبا و اجداد کی پیدائش اور موت کا امین ہے اور میں اس کے ایک ایک چپے —— نہیں، ایک ایک ذرّے کے مقابلے میں دُنیا کی تمام بادشاہتوں کو ہیچ سمجھتا ہوں۔ میں یقیناً خوش قسمت ہوں کہ اپنے گھر واپس آگیا اور یہ اسی بات کی برکت ہے کہ میری ٹانگوں میں جان آگئی ورنہ مجھے تو دس سال سے وجع المفاصل کا مرض ہے اور میں سمجھتا تھا کہ چلنے پھرنے سے میں اب ہمیشہ کے لئے محروم ہوگیا ہوں۔"

مسز میڈوز نے مسٹر ہنری کو آبدیدہ اور متاثر ہوتے ہوئے دیکھ کر بات کا رُخ بدلا "سچ بتاؤ ہنری! تمھارے کتنے بچے ہیں؟ تمھاری بیوی کہاں ہیں؟ اور تم ان سب کو یہاں کیوں نہیں لائے؟"

مسٹر ہنری نے مسز میڈوز کو دزدیدہ نظر سے دیکھا اور یکایک اُن کے چہرے پر اُن کی مخصوص ہنسی آگئی۔ "ایمیلی! میں نے تم سے کہہ دیا تھا کہ اگر تم مجھ سے شادی نہیں کروگی تو میں تمام عمر کنوارا رہوں گا۔ کیا تم نے میرا عہد اس قدر بودا سمجھا تھا؟"

مسز میڈوز خاموش ہوگئیں۔ میرے سامنے

ایک دس بارہ برس کا بچہ آگیا تھا اس کی اوٹ میں
میں مسٹر ہنری اور مسز میڈوز کو بغور دیکھنے لگا۔
اس گھر میں سب لوگ مسز میڈوز کو اماں جان
یا دادی اماں کہتے تھے۔ ایملی ان کے کنوارپنے کا
نام تھا اور قریب قریب پچاس سال سے یہ نام
کسی نے نہیں لیا تھا۔ اس لئے مسز میڈوز اُسے
سُن کر ایک ناقابلِ بیان فرحت محسوس کرنے
لگیں اور انھوں نے یہ جانا کہ کوئی ان کی روح کے
نہاں خانے میں چراغ کشتہ روشن کر رہا ہے۔ خود
گھر والوں کو یہ نام سُن کر بڑا تعجب ہوا اور ایک دفعہ
ہی سب گھوم کر مسز میڈوز کو دیکھنے لگے۔ بلکہ ننھا
اسٹیفن تو بے اختیار کہہ اٹھا "دادی اماں! آپ کا
نام ایملی ہے؟"

دادی اماں جو کسی فراموش شدہ خواب کو یاد
کرنے لگی تھیں، یکبارگی چونک پڑیں اور بولیں۔
"ہاں بیٹا! مگر تم میرا نام کبھی نہ لینا۔" پھر انھوں نے
سارے مجمع پر ایک نگاہ ڈالی اُن کی نظریں کہہ رہی
تھیں "بس اب انہی کو یہ نام لینے کی اجازت ہے،
کوئی اور جسارت نہ کرے۔"

میں نے ان دونوں کو نظر بھر کر دیکھا اور
اس خیال سے میرے احساسات پر استعجاب سا
چھا گیا کہ یہ دونوں جن کی عمر کا کارواں اب کوئی
دم میں منزلِ مقصود پر قیام کرنے والا ہے بچپن
میں ایک دوسرے کو چاہتے تھے لیکن نصف
صدی تک یہ ایک دوسرے کے دیدار سے
محروم رہے۔ اس پر طرّہ یہ کہ بوڑھے شخص نے
جس کے سارے محسوسات اب سلب ہو چکے
ہیں۔ یہ طویل عرصہ اس عورت کے خیال میں گزار دیا مگر
یہ کسی دوسرے کی خدمت اور وفاشعاری میں لگی رہی۔
کون جانے، جدا ہوتے وقت ان دونوں کے احساسات
و خیالات کیا ہوں گے! کیا خبر، اب بھی ان دونوں کو
بچپن کی وہ گزری ہوئی گھڑیاں یاد ہوں یا نہ ہوں۔ اور
میں سوچنے لگا کہ اس شخص کو اپنی اس ناسمجھی کا بھی
احساس ہے یا نہیں کہ اس نے اس بڑھیا کی خاطر،
اپنا آبائی وطن اپنا جدی گھر، اپنے باپ دادا کی جائداد
اپنی جائز میراث، سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر جلاوطنی کی
زندگی اختیار کی۔

مسز میڈوز نے ہنری کو دیکھا جن کی نظریں ابھی
تک ان پر جمی ہوئی تھیں۔ آخر انھوں نے سکوت
توڑا۔ "اگر میں تم سے شادی کر لیتی تو تم بعد میں پچھتاتے۔"
مسٹر ہنری ہنس دیئے لیکن مسز میڈوز بدستور
سنجیدہ لہجے میں کہنے لگیں "ہنسنے کی بات نہیں ہے۔ میں
نے تم دونوں بھائیوں کا اچھی طرح مطالعہ کیا تھا اور
میں اس نتیجے پر پہنچی تھی کہ تم باحوصلہ اور ذہین و طباع
آدمی ہو۔ تم نے ایک دفعہ مجھ سے کہا بھی تھا کہ تم دُور
دراز کی سیاحت اور دولت پیدا کرنی چاہتے ہو۔ اور میں
بھی یہی چاہتی تھی کہ تم اپنا مستقبل خوب روشن اور
سب کے لئے قابلِ رشک بناؤ۔ اگر میں تمھارا کہا مان
لیتی تو میری خاطر تم یہیں پڑے رہتے کیونکہ یہ ممکن نہیں
تھا کہ تم مجھے اپنے ساتھ لئے لئے مُلک در مُلک پھرتے
رہتے۔ چنانچہ میں نے یہی مناسب سمجھا کہ اپنی چاہت
کو تمھاری آرزوؤں کی تکمیل کے لئے قربان کر دوں۔
علاوہ ازیں تمھارے مرحوم بھائی زود حس اور کمزور
دل کے آدمی تھے ان کی شیفتگی کا اندازہ کرنے کے

بعد میرا دل نہیں چاہا کہ تم سے شادی کرکے ان کی نازک طبیعت پر بارِ گراں ڈالوں۔ تم ہی بتاؤ اگر وہ اس صدمے سے اپنی جان کھو بیٹھتے تو کیا تم اس شادی سے نہ پچھتاتے؟"

ایسا معلوم ہوا کہ اتنی گفتگو کے بعد اُن دونوں کے چہرے پر اطمینان و سکون آگیا ہے۔ وہ اپنی اپنی جگہ مطمئن ہیں۔ پھر اِدھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں۔ مسٹر ہنری میں اس خاندان کی روایتی زندہ دلی پیدا ہوگئی اور وہ اپنے سفر و سیاحت کے حالات اور جگہ جگہ کے لطیفے اور چٹکلے سنانے لگے۔ جب اندھیرا چھا گیا تو میں نے اجازت چاہی۔ مسٹر ہنری نے مصافحہ کرتے ہوئے کہا: "آپ کل کسی وقت ضرور آئیے۔ میں اپنے سفر کے چند ایسے محیر کن واقعات سناؤں گا کہ آپ بے حد محظوظ ہوں گے۔"

(۴)

اگلے روز صبح میں ٹہلتا ہوا اسی خوبصورت مکان کی طرف جا نکلا۔ یوکلپٹس کے حسین و جمیل درختوں سے ڈھکی ہوئی رہ گزار پر قدم رکھتے ہی میری نگاہیں بائیں جانب گلشن میں پڑیں جہاں مسز سیڈوز سپید لباس پہنے اپنے محبوب و پسندیدہ پھولوں کو جمع کرتی پھر رہی تھیں۔ میں سیدھا انہی کے پاس چلا گیا اور جاتے ہی میں نے پوچھا "چچا ہنری ابھی بیدار نہیں ہوئے؟"

انھوں نے مجھے خاموش نظروں سے دیکھا، اور بولیں: "وہ تو ہم سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہوگئے۔"

"ہیں؟" میرے منہ سے بے اختیار نکلا "کب؟"

"صبح لوسی ان کے لئے چائے لے کر گئی تو دیکھا ———" مسز سیڈوز آگے نہ کہہ سکیں۔ ان کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ قدرے ٹھہر کر انھوں نے پھر کہا۔

"مجھے یہ خوبصورت اور خوشبودار پھول بےحد عزیز ہیں۔ یہ میں انہی کے لئے چُن رہی ہوں ——— پچاس سال سے مجھے بڑا ملال تھا بلکہ یہ میری زندگی کا سب سے بڑا رنج تھا کہ ..... میری وجہ سے اس خاندان کے ایک فرد نے اپنے گھر سے باہر دم توڑا۔ گویا ان لوگوں کے سرمایۂ افتخار کو میری بدولت ٹھیس لگی۔ اس سلسلۂ مقدس کو میں نے منقطع کیا۔ لیکن نہیں، خدا کا ہزار ہزار شکر ہے کہ اس نے یہ داغ میری پیشانی سے دھو دیا۔ ہنری واپس آگئے اور انھوں نے اپنے آبائی گھر ہی میں اپنی زندگی موت کے سپرد کی۔"

گھر والوں نے بڑی مشکل سے سمجھا بجھا کر مسٹر ہنری کو آرام کرنے پر آمادہ کیا تھا ورنہ وہ تو سونے کے لئے کسی طرح راضی ہی نہیں ہوتے تھے۔ رات گئے تک وہ اپنی زندگی کے حالات بڑے بڑے حادثے اور نئے نئے تجربے بیان کرتے رہے۔ سب سے زیادہ انھیں اس بات کی خوشی تھی کہ وہ آخری وقت اپنے گھر واپس آگئے تھے بلکہ اپنے گھر کے احاطے میں خود اپنے پاؤں سے چل کر آئے اور اس کی انھیں اس قدر خوشی تھی کہ انھوں نے کہا تھا "یہاں آکر مجھے بڑی تقویت ہوئی ہے۔ اب تو میں بیس سال اور جیوں گا۔"

لیکن تقدیر اُن پر مہربان تھی۔ موت نے ان کی شاہراہِ حیات کو مناسب جگہ لاکر ختم کر دیا۔

صادق الخیری کی چند اور کتابیں

دھنک (افسانے)

اُردو کے کسی افسانہ نگار نے سچی زندگی رومان بے باک طنز اور مشرقی انداز بیان کو اس خوبصورتی سے یکجا نہیں کیا، جتنا صادق الخیری نے! ..... دھنک کا آخری افسانہ "نشیمن" ایک ایسا رومان ہے جسے ایک دفعہ پڑھ کر سیری نہیں ہوتی۔ بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے اور جی نہیں بھرتا!! پروفیسر وقار عظیم (براڈکاسٹ از دہلی) قیمت [illegible]

دوشیزۂ صحرا (ناول)

صحرائے عرب کی خوں آشام زہرہ کا یہ فسانۂ محبت ختم کرنے کے بعد آپ مُصر ہوں گے کہ ایک بار پھر ہمیں کوئی ایسی وادیٔ عشق میں لے جائے (ظفر قریشی دہلوی بی۔اے)۔

یہ امر اور بھی مسرت کا باعث ہے کہ مصنف کو اُردو میں ایک لائق ترجمان ملا۔ میراجی (ادبی دنیا)

قیمت [illegible]

شمع فروزاں (ناولٹ)

یہ ایک متوسط درجے کے چینی گھرانے کا قصہ ہے جسکا چشم و چراغ اعلیٰ تعلیم کے لئے یورپ جاتا ہے اور جب سات سال کے بعد واپس آتا ہے تو محسوس کرتا ہے کہ جنت سے جہنم میں آگیا۔ اسکے بعد کیا ہوا؟ یہ "شمع فروزاں" میں دیکھئے کہ پرل بک نے کس خوبی سے خاندان کے ہر فرد پر اسکے متلون اثرات کا جائزہ لیا ہے۔ اس کہانی میں مغرب کی جدت طرازی اور چینیوں کی رچی ہوئی قدامت پسندی کی بڑی اندوہناک تصویر کھینچی گئی ہے۔ ترجمہ بے حد رواں اور بے ساختہ۔ قیمت [illegible]

شمع انجمن (افسانے)

ان افسانوں کو پڑھ کر ہم ایسا محسوس کرتے ہیں کہ سب کچھ کسی اپنے ہی آدمی نے اپنوں ہی کے لئے لکھا ہے۔ (نگار)

"شمع انجمن" افسانوی ادب میں ایک قیمتی اضافہ ہے۔ (ہمایوں)۔ قیمت [illegible]

بلقیس (افسانے)

صادق الخیری کا تخیل نہایت شاداب اور طرز نگارش بڑا لطیف اور شاعرانہ ہے۔ (آنریبل سلطان احمد) صادق الخیری نے زندگی کو بہت ہی قریب سے دیکھا ہے اور اسکی خامیوں کو اجاگر کیا ہے (جہاں بانو بیگم ایم۔اے) "بلقیس" اسی مصنف کے بیس افسانوں کا تازہ ترین مجموعہ ہے قیمت [illegible]

خاتون کتاب گھر۔ اُردو بازار، دہلی